ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدّمات

جلدِ اوّل

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدمات

جلدِ اوّل

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

تصنیف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدّمات

مُصنّف: پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : فرحان عبادت ڈپٹی ڈائریکٹر
ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
سرورق : سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم - لاہور
کتابت : سیّد محمّد ابراھیم خوش نویس - لاہور
مطبع : ندیم یونس پرنٹرز - لاہور
اہتمام: سیّد محمّد ابراھیم - لاہور
جلد سازی : مدنی بک بائینڈنگ ہاؤس - لاہور
تاریخ اشاعت : ۱۹۹۷ء
تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان - اسلام آباد
ادبیا ہے -/۲۰۰

صوفی صافی بُزرگ

جناب مقبولؒ میاں صاحب خیرآبادی
کی
خدمت میں

اِن میں سے ایک بزرگ خیرآباد والے مقبول میاںؒ بھی تھے۔ جن پر ہر وقت ایک عالمِ جذب طاری رہتا تھا۔ صرف جُمعہ کے دِن وہ کسی قدر ہوش میں آتے تھے۔ نہاتے دھوتے اور وضو کرتے، اور کپڑے بدل کر جُمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جایا کرتے تھے۔

اِس علاقے میں دُور دُور تک لوگوں کو اِس بات کا عِلم تھا کہ عالمِ جذب میں ہونے کی وجہ سے جو کچھ اُن کے مُنہ سے نِکل جاتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔“

—— یادِ عہدِ رفتہ (صفحہ ۱۵۵)

عبادت بریلوی
۱۶ / اکتوبر ۱۹۹۶ء

فہرست

(۴)

(۵)

(۶)

(۷)

(۸)

(۹)

(۱۰)

(۱۱)

(۱۲)

(۱۳)

پیشِ لفظ

یہ کتاب، جس کی پہلی جلد پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس وقت شائع کی جا رہی ہے۔ دوسری جلد جس کی ضخامت بھی تقریباً پانچ سو صفحات ہوگی، انشاء اللہ آئندہ سال کے شروع میں شائع کر دی جائے گی۔

میں نے ام۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا، اور ہزاروں مقالات لکھے۔ ان مقالات کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی شائع ہوئیں جن کی تعداد سنو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابوں میں اُردو زبان وادب کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں ادیبوں کے ذاتی حالات، اُن کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی تفصیل بھی ہے۔

یہ کام میں نے کس طرح کیا؟ اس کی تفصیل دلچسپ بھی اور مفید

بھی۔ یہ کام میں نے خود نہیں کیا۔ اس میں ایک بزرگ کی دعاؤں کا ہاتھ تھا ورنہ ان کتابوں کا لکھا جانا، اور چھپنا ممکن نہ تھا۔ کم از کم میرے لئے یہ کام مشکل تھا۔ میں اتنا کام کرنے کے قابل نہ تھا۔

یہ ایک بزرگ مقبول میاںؒ لکھنؤ کے قریب خیر آباد میں رہتے تھے۔ اُن پر ایک عالمِ جذب طاری تھا۔ ان کی زبان سے جو بات بھی نکل جاتی تھی، اُس کا پورا ہو جانا یقینی تھا۔

میری والدہ مرحومہ اُن کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوتی تھیں۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ میں کسی طرح کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ہو جاؤں۔ اُنہوں نے مقبول میاںؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس خواہش کا اظہار کیا۔ فوراً ان کی زبان مُبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

"کالج کی نوکری بہت اچھی، کالج کی نوکری بہت اچھی، کالج کی نوکری بہت اچھی"۔ اُنہوں نے لکھنؤ واپس آکر جب مجھے یہ روداد سُنائی تو میں نے خُدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ میں خود طبعاً اس مزاج کا انسان تھا کہ کمشنری یا ڈپٹی کمشنر کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میری یہ خواہش تھی کہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں اُستاد ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے کوشش کی۔ اور میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے، اینگلو عربک کالج دہلی میں بغیر درخواست دیئے ہوئے، میں صدر شعبہ اُردو مقرر کیا گیا، اور اس حیثیت سے اس کالج میں کئی سال میں نے وہاں گذارے۔

یہ ملازمت بہت اچھی تھی۔ یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ لیکن چند سال بعد دہلی تباہ ہو گئی۔ ایسے ہندو مُسلم فسادات وہاں ہوئے کہ کالج

کو چھوڑ کر دوسرے اساتذہ کے ساتھ مجھے پُرانے قلعے میں پناہ لینی
پڑی۔ اور پھر جب فسادات ذرا کم ہوئے تو اورینٹل کالج لاہور
میں اُردو کے سینئر لیکچرار کی جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ اس کا آفر مجھے پرنسپل
ڈاکٹر برکت علی قریشی کی طرف سے مِلا۔

میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قُریشی
صاحب کے اس آفر کو قبول کر لیا، اور بہت تھوڑے عرصے میں
یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اُردو میں ریڈر اور پھر پروفیسر
اور صدر شعبہ بھی ہو گیا۔ اس طرح میں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے
اورینٹل کالج میں اُردو زبان و ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے
اکتیس بتیس سال گذارے۔

اورینٹل کالج اُس زمانے میں تحقیقی کاموں کے لئے مشہور تھا۔
پڑھانے کا کام کم تھا۔ پروفیسر وولز ایک زمانے تک اس کالج کے
پرنسپل رہے، اور آج بھی اُن کا ایک مجسمہ مال روڈ پر یونیورسٹی کی عمارت
کے سامنے موجود ہے۔ حالانکہ آزادی کے بعد شہر لاہور کے تمام مجسمے
سڑکوں پر سے ہٹا دیئے گئے لیکن صرف پروفیسر وولز کا مجسمہ مال روڈ
پر یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے آج بھی موجود ہے۔

پروفیسر وولز کے علاوہ اس کالج میں علامہ اقبالؒ عربی ادبیات
کے پروفیسر محمدؐ شفیع، فارسی زبان و ادب کے پروفیسر اقبال، سنسکرت
زبان و ادب کے پروفیسر سوریا کانت،

اور دوسرے اساتذہ مثلاً پروفیسر شیرانی، ڈاکٹر عبداللہ، پروفیسر
نور الحسن خاں، عبدالصمد صارم، مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ بھی موجود

تھے جنھوں نے علم وادب میں اپنی تحریروں سے خاصے علمی کارنامے انجام دیئے، اور جن کی وجہ سے دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں اُن کا نام عزّت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اورینٹل کالج میں شعبۂ اُردو بھی قائم ہوا، اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر سیّد وقار عظیم، اور میں بھی یہاں آگیا۔ اس زمانے میں ان لوگوں نے جو علمی کارنامے انجام دیئے، اُن سے اُردو دنیا پوری طرح آشنا ہے۔

میں نے اورینٹل کالج کے دوران قیام میں بہت سے مختلف نوعیت کے کام کیئے۔ سب سے پہلے تو میں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسز "اُردو تنقید کا ارتقا" انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کو اشاعت کے لئے دیا جو مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے کے ساتھ پانچ دفعہ انجمن سے شائع ہوا۔ جس کی ضخامت پانچ سو صفحات ہے۔ میں نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا مکتبۂ اُردو لاہور کے زیر اہتمام چوہدری برکت علی صاحب نے شائع کیا۔ اس کے بعد تنقیدی مضامین کا ایک مجموعۂ تنقیدی تجربے، کے نام سے شائع کیا جس کی ضخامت تقریباً تین سو نوّے صفحات تھی۔ میں نے اسی زمانے میں خطبات عبدالحق کو مرتب کرنے کا کام بھی کیا جو انجمن ترقی اُردو کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 'روایت کی اہمیت' بھی میں نے مُرتب کی جس کی اشاعت انجمن ترقیٔ اُردو ہند کراچی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مُومن اور مطالعۂ مومن، جس کی ضخامت پانچ

اٹھارہ صفحات ہے اس کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد جدید شاعری، ۱۹۶۱ء میں چھپی جس کی ضخامت بڑے سائز کے تقریباً ۶۴۲ چھ سو بیالیس صفحات ہیں۔

ابھی یہ کتابیں چھپ کر شائع ہوئی تھیں کہ مجھے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن میں اُستاد کی حیثیت سے بُلایا گیا۔ یہ جگہ پروفیسر عزیز احمد صاحب کے کینیڈا چلے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ میں نے اس جگہ کو قبول کر لیا اور میں ۲۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کو لندن کے لئے ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۲ء کو رات کے وقت وہاں پہنچا۔ لندن ایئرپورٹ پر پروفیسر رالف رسل اور نعیم ملک موجود تھے اور تقریباً پانچ سال میں نے بہ حیثیت ایک اُستاد کے وہاں گذارے۔ لندن کے دورانِ قیام میں نے بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کو پڑھایا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے کچھ کاموں کی نگرانی کی۔ اس کے ساتھ وہاں میں نے برٹش میوزیم، انڈیا آفس، اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن کی لائبریریوں میں کام کیا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج بھی گیا۔ ان جگہوں پر مجھے اُردو کی کئی نایاب قلمی کتابیں بھی ملیں۔ جن پر میں نے کام کیا اور وہ شائع بھی ہو گئیں۔

لندن کے دوران قیام میں جن قلمی کتابوں پر میں نے کام کیا اُن میں مرزا کاظم علی جوان کی ''شکنتلا''، سید حیدر بخش حیدری کی مختصر کہانیاں، دیوانِ حیدری، تذکرۂ حیدری، بینی نارائن جہاں، تحلیل علی خاں اشک کی گلزارِ چین اور رسالہ کائنات خاصی طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ اس سے قبل وہ کبھی شائع نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان تمام کتابوں

کو نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

اس کے علاوہ میں نے بنتی نارائن جہاں کی "چار گلشن" کو بھی دریافت کیا، اور اس کو بھی اورینٹل کالج کی طرف سے شائع کر دیا۔ اور مراثی مُجرات بھی میری نظر سے گذرے۔ چنانچہ میں نے ان کو بھی مرتب کیا، اور ان کی اشاعت بھی زیر عمل آئی۔ چنانچہ یہ بھی شائع ہوتے۔ یہ بھی ایک نئی چیز تھی۔ اس سے قبل کسی نے ان مراثی کو تلاش کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

لندن یونیورسٹی میں ایک اُستاد کی حیثیت سے کام کرنا میرے لئے ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اس تجربے کو "اُرضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک" میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب بھی لندن میں لکھی گئی، اور وہاں جو تجربات مجھے ہوئے اُن کو میں لاہور واپس آکر ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا اور اس کی اشاعت لاہور ہی کے ایک مکتبہ نے شائع کی۔

لاہور واپس آکر میں نے ادبی دُنیا کے لئے کئی کام کئے۔ جشن نامۂ اقبالؒ میں نے علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقعہ پر لکھی جس کو اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا گیا۔ جشن اقبالؒ کی روداد بھی اسی زمانے میں لکھی گئی اور یہ بھی اورینٹل کالج میگزین میں شائع کی گئی۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس زمانے میں اکثر میرے پاس تشریف لاتے تھے۔ ملاقات کے دوران ایک دن انہوں نے اپنے نام بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے خطوط کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ ایک

دن میرے پاس یہ خطوط لاتے، اور مجھے اورینٹل کالج میں اشاعت کے لئے دیئے۔ یہ خطوط مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئے چنانچہ میں نے اِن کو اورینٹل کالج میگزین کے ایک شمارے میں شائع کیا، اور یہ کتابی صورت میں شائع ہو گئے۔

اس کتاب میں سید حیدر بخش حیدری کی کتاب گلزارِ دانش کا بھی مفصل ذکر ہے۔ یہ کتاب مجھے کوپن ہیگن کے شاہی کتب خانے میں ملی اور جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ دونوں جلدیں اُردو میں ہیں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ میں نے سید حیدر بخش حیدری کی ایک نادر و نایاب کتاب تلاش کر لی تھی۔ میرے لئے تو دُنیائے ادب کا بہت بڑا خزانہ مِل گیا تھا۔

کم و بیش اسی زمانے میں علامہ اقبالؒ کا جشن صد سالہ لاہور میں منایا گیا۔ اس کی مجلسِ انتظامیہ نے میرے لئے "اقبالؒ کی اُردو نثر" کا عنوان پر کام کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اس کو خوش دِلی سے قبول کیا، اور چند مہینوں میں ایک نہایت خوبصورت کتاب، اس موضوع پر لکھی۔ جس کو جشنِ اقبالؒ کے موقع پر اقبال اکیڈمی لاہور نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

ان کتابوں کی پہلی جلد اس وقت شائع کی جا رہی ہے۔ اس میں اُن تمام کتابوں کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے جن پر میں

نے کام کیا ہے۔ بقیہ کتابوں کی تفصیل آپ کو دوسری جلد میں ملے گی جو انشاء اللہ چند ماہ بعد شائع کی جائے گی۔

عبادت بریلوی

۸۷/۸۸۔ این سمن آباد، لاہور
۵ر اپریل ۱۹۹۷ء

۱

اُردو تنقید کا اِرتقا

ایک عام خیال یہ تھا، اور بعض حلقوں میں آج بھی موجود ہے کہ اُردو تنقید کا کوئی مسلسل ارتقا نہیں۔ بعض لوگ تو سرے سے اس کے وجود ہی کے مُنکر ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اُردو میں تنقید کا ایک مستقل اور مسلسل اِرتقا ملتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں مغرب کے تنقیدی ارتقا کی سی وسعت اور فکر کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی عمر ابھی ڈھائی تین سو سال سے زیادہ نہیں اور اُردو نثر کی عمر تو اس سے بھی کم ہے۔ ڈھائی تین سو سال میں جو ترقی ایک صنف ادب یا شعبۂ ادب کے لئے ممکن ہو سکتی ہے، وہ اُردو تنقید نے بھی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں ایک

زمانے تک اس کی کوئی مُستقل حیثیت نظر نہیں آتی ۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اُردو کے تنقیدی نظریات میں فکر کی گہرائی بھی کم ملتی ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں فلسفیوں نے ان بحثوں کو نہیں چھیڑا، بلکہ زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں نے یہ بحثیں کی ہیں۔ پھر بھی ان میں سے مختلف اوقات میں، اکثر نے فکر کی گہرائی اور اُپج کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں، جن کی وجہ سے اُردو تنقید کو خاصہ بلند مرتبہ حاصل ہوگیا ہے۔

ان اوراق میں اُردو کے اسی تنقیدی ارتقا کو تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اُردو تنقید کے ارتقاء کو حالات و واقعات اور فضا و ماحول کی پیداوار ثابت کیا جائے۔ کیونکہ نہ صرف تنقید، بلکہ ادب کا ہر شعبہ حالات و واقعات ہی کے سانچے میں ڈھلتا ہے، اور حالات و واقعات کو اپنے سانچے میں ڈھالتا بھی ہے۔ اُردو تنقید کو بھی حالات و واقعات ہی نے پیدا کیا۔ بدلتے ہوئے حالات ہی کے سہارے وہ آگے بڑھتی گئی اور خود اس نے حالات و واقعات کو بدلا بھی۔ اور آگے بھی بڑھایا۔ بہر حال اس کا ارتقاء حالات و واقعات کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح ہم آہنگ رہے گا۔

اُردو تنقید کے ارتقاء کو پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف تنقیدی نظریات اور مختلف تنقیدی معیار جو مختلف اوقات میں قائم ہوتے رہے، اُن کا تذکرہ کیا جائے۔ پھر اس کے بعد اُن نظریات کی روشنی میں جو تنقید ہوئی،

اس کا جائزہ لیا جائے۔ اور جن لوگوں نے اُصول تنقید کی بحث نہیں کی، جن کے یہاں نظریاتی تنقید کا پتہ نہیں چلتا، ان کی مختلف تنقیدی تحریروں سے ان نظریات تنقید کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ گویا یہ نظری اور عملی دُونوں طرح کی تنقیدوں کے ارتقاء کا جائزہ ہے جس میں تاریخی ترتیب خاص طور پر پیش نظر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس مقالے کو اُردو تنقید کی مکمل تنقیدی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں کسی نقاد، کسی نظریۂ تنقید اور کسی انداز تنقید کو نظرانداز نہ کیا جائے۔

تنقیدی زاویۂ نظر سے اس میں جگہ جگہ کام لیا گیا ہے اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں یہ تالیف اُردو تنقید نگاروں یا نظریات تنقید کا محض ایک تذکرہ ہو کر نہ رہ جائے۔ لیکن یہ تنقید مختلف رُجحانات پر زیادہ ہے۔ رُجحانات کے علم برداروں پر کم ہے۔ کیونکہ اگر ایک ہی رُجحان کے مختلف علم برداروں پر جگہ جگہ مفصّل تنقید کی جاتی تو اس میں خیالات کے دُہرا جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی ان رُجحانات کے علم برداروں میں سے اگر کسی کی تنقید میں ایسی بات ملتی ہے، جس پر بحث کا دروازہ کھُل سکتا ہے تو اس سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے۔ ایسے تنقیدی مباحث اِن اوراق میں جگہ جگہ نظر آئیں گے۔

ہر تنقید نگار کے پیشِ نظر ایک نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ صحیح تنقید بغیر اس کے ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ان اوراق میں، جہاں تنقیدی پہلو نمایاں ہوا ہے وہاں راقم الحروف کے تنقیدی نقطۂ نظر کی جھلک ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے لئے وہ معذور

تھا۔ لیکن اس تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت میں انتہا پسندی کہیں
بھی نظر نہیں آئے گی۔ اس نقطۂ نظر سے بہتوں کو اختلاف ہو سکتا
ہے لیکن ادب اور تنقید میں نقطۂ نظر کے بُنیادی اختلافات اس قدر
عام ہیں کہ ان سے کوئی شخص دامن نہیں بچا سکتا۔

یہ موضوع بہت وسیع تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر اس بات کی
کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مواد کم سے کم ابواب میں سمویا
جائے، تاکہ پڑھنے والوں پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے کے
اکثر ابواب خاصے طویل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان ابواب کی ذیلی سُرخیوں
ہی پر مختلف ابواب لکھے جا سکتے تھے۔ لیکن اِس طرح اس کا حجم اور بھی
بڑھ جاتا۔ ذیلی سُرخیوں کے تحت خیالات کو پیش کرنے میں جس اختصار
سے کام لیا جا سکتا ہے، وہ ابواب میں ممکن نہیں۔

اس موضوع کو نو ۹ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب تمہیدی ہے،
جس میں فن تنقید پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث میں فن تنقید
سے متعلق ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُردو میں اس
موضوع پر مواد کی کمی ہے۔ اسی خیال نے اس باب کی غیر معمولی طوالت
کو بھی گوارا کر لینے کے لئے مجبور کر دیا۔ دوسرے باب میں اُردو کی
قدیم روایات تنقید کی تفصیل ہے۔ یہ روایات ہمیشہ سے موجود تھیں۔
ان کو مخصوص حالات نے پیدا کیا تھا۔ زیادہ جان دار نہ ہونے کے
باوجود ان روایات کے اثرات آج تک اُردو تنقید میں نظر آتے ہیں۔
تیسرے باب میں غدر کے بعد نئے خیالات اور نئے حالات کے
زیر اثر جو تنقید شروع ہوئی اس کا ذکر ہے۔ یہ صحیح معنوں میں اُردو

تنقید کی ابتدا تھی۔ اور چونکہ اس دَور کے تنقید نگاروں نے خاص طور پر تنقید کی طرف انہماک ظاہر کیا اور اصول تنقید پر خصوصیت پر تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان نقادوں کی تنقیدوں کا بیان ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ عہد تغیّر کے نقّادوں سے متاثر ہوئے۔ لیکن ان میں سے ان محققین کو علیحدہ کر لیا گیا ہے، جن میں سے اکثر پر عہد تغیر کی تنقید کا اثر پڑا ہے اور ان کا ذکر "تحقیق و تنقید" کے عنوان سے پانچویں باب میں کر دیا گیا ہے۔ چھٹے اور ساتویں باب میں اُردو تنقید پر پڑے ہوئے مغرب کے عام اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک باب میں ان تمام اثرات کو پوری طرح پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے ان کو دو بابوں میں تقسیم کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ اِن دونوں ابواب میں ان افراد کی تنقیدوں کا ذکر ہے جو مغرب کے زیر اثر تنقیدیں لکھتے رہے اور ساتھ ہی اِن رُجحانات کا بیان بھی ہے جو مغرب کے زیر اثر اُردو میں آئے۔ آٹھویں باب میں تنقید کے جدید رُجحانات اور اُن کی کشمکش پر بحث کی گئی ہے۔ اور نواں باب ادبی تاریخوں اور رسالوں کی تنقید سے متعلق ہے۔ آخر میں ماحصل کے عنوان سے بھی چند صفحات لکھے گئے ہیں، تاکہ اختصار کے ساتھ اُردو تنقید کی خصوصیات اور اس کے ارتقاء کی مسلسل تاریخ کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ اور اس حقیقت کا پتہ بھی چل جائے کہ اس کی رفتار ہمیشہ حالات و واقعات سے ہم آہنگ رہی ہے۔

راقم الحروف نے حتیٰ الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ

اُردو تنقید سے متعلق کوئی اہم بات چھوٹ نہ جائے۔ البتہ بعض ایسے لکھنے والوں کی تنقیدوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، جن کی بنیادیں نفرت اور بغض وعناد پر قائم ہیں۔ دل آزارانہ جو مضحکہ اُڑانے اور پھبتیاں کسنے کو تنقید سمجھتے ہیں۔ مثلاً اس میں معرکۂ شرر وچکبست اور اودھ پنچ کی دل آزارانہ تنقیدوں کا ذکر نہیں ملے گا، کیونکہ اِس سلسلے کی تمام تنقیدوں کا شمار تنقیص کے تحت ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ تنقیص کی کوئی تنقیدی اہمیت ہو نہیں سکتی۔ تنقیص کا یہ سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے، کیونکہ کبھی کبھی اخبارات ورسائل میں ایسی تنقیدی کاوشیں آج بھی نظر آجاتی ہیں۔ جن سے ان دل آزارانہ تنقیدوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ان سے بھی یہاں بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے نقادوں پر بھی کم لکھا گیا ہے، جن کے یہاں شعور کی کمی ہے، اور جنہوں نے ذاتی غور وفکر سے کم کام لیا ہے۔

مجھے اس موضوع پر مواد کی فراہمی کے سلسلے میں خاصی دقتیں اُٹھانی پڑیں۔ خصوصاً پرانے رسائل کی تلاش، دیکھ بھال اور چھان بین نے بہت وقت لیا۔ لیکن رسائل کے پُرانے فائلوں کی چھان بین ضروری تھی کیونکہ اُردو تنقید سے متعلق زیادہ مواد پُرانے رسالوں ہی کے سینے میں محفوظ ہے۔ لیکن بزرگوں، دوستوں اور شاگردوں کی مدد نے یہ اور اسی طرح کی بہت سی مشکلوں کو آسان کر دیا۔ میں اس سلسلے میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ، پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، پروفیسر حامد حسن قادری، پنڈت

برج موہن دتاتریہ کیفی، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید سجاد ظہیر، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر عزیز احمد کا ممنون ہوں۔ ان بزرگوں اور دوستوں نے نہ صرف فراہمی مواد میں میری مدد کی، بلکہ اکثر و بیشتر، میں اس موضوع پر ان سے مشورے طلب کرتا رہا۔ اور وہ اپنے مفید مشوروں سے مجھے سرفراز فرماتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی مدد اگر شامل حال نہ ہوتی تو یہ کام اس صورت میں کبھی بھی مکمل نہ ہوتا۔ مشرقی تنقید اور خصوصاً عربی تنقید کے متعلق مجھے پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبہ عربی سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق صدر شعبہ عربی اینگلو عربک کالج دہلی سے بڑی مدد ملی۔ میں ان حضرات کا بھی شکرگزار ہوں۔

یہ کام میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے ۱۹۴۲ء میں شروع کیا تھا۔ چار سال کام کرنے کے بعد میں نے اسے یونیورسٹی میں پیش کیا۔ سال بھر یونیورسٹی نے لے لیا۔ پھر ملک میں تقسیم کے بعد ایسے حالات رونما ہوئے کہ ایک کو دوسرے کی خبر ہی نہ رہی، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر فرد خود اپنے آپ سے بے خبر ہوگیا۔ اس لئے اس کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر ہوگئی۔ ورنہ اب تک یہ کبھی کی چھپ کر شائع ہوگئی ہوتی۔

عبادت بریلوی

دہلی کالج۔
۱۵ر جنوری ۱۹۴۹ء۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہوگیا۔ اس کے بعد انجمن نے اس کے کئی ایڈیشن شائع کئے، یہ ایڈیشن اتنی جلدی جلدی شائع ہوئے کہ میں اس کتاب پر نظرِ ثانی نہ کر سکا۔ ادھر چند سال سے اس کا کوئی نیا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ کیونکہ میں اس پر نظرِ ثانی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مصروفیت نے اجازت نہیں دی۔

اب خدا خدا کر کے کئی سال کے بعد اربابِ انجمن کے اصرار پر میں نے اس پر نظرِ ثانی کی، اور اب یہ نیا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ کتاب میں نے اس وقت لکھی تھی جب میری عمر تیئس چوبیس سال تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں پختگی نہیں تھی۔ نظرِ ثانی کرتے ہوئے میں نے اس کا خیال رکھا ہے کہ اس کا اصل انداز برقرار رہے۔ البتہ بعض اضافے اس میں کر دیئے گئے ہیں تاکہ گذشتہ تیس سال میں اُردو تنقید میں جو اضافے ہوئے ہیں وہ سامنے آجائیں۔

اُمید ہے اب یہ کتاب زیادہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
مارچ ۱۹۷۹ء

تنقیدی زاویے

میرے تنقیدی مضامین کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔

میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ ان میں جو باتیں بھی کہی گئی ہیں وہ سب کی سب اچھوتی اور نئی ہیں۔ ہاں اتنا مجھے ضرور کہنا ہے کہ یہ ایک مخصوص زاویۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ ادب سے میری دلچسپی ان کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ ــــ اور اس سلسلے میں تنقید کے وہ اصول میرے پیش نظر رہے ہیں جنہیں میں سائنٹیفک سمجھتا ہوں اور جن کے بغیر میرے خیال میں ادب اور اس کی اصل روح کو سمجھنا مشکل ہے۔ چنانچہ ایک مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر کے اثرات ان میں سے ہر ایک میں ہر جگہ نظر آئیں گے ــــ قدم قدم پر ادب کو سمجھنے کا ایک مخصوص رجحان ضرور ملے گا۔

تنقیدی نقطۂ نظر کا ذکر آگیا ہے تو اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں کسی نقّاد کی تنقید میں اس وقت تک جان پیدا نہیں

ہوسکتی جب تک وہ زندگی اورادب دونوں کے متعلق کوئی خاص واضح نقطۂ نظر نہ رکھتا ہو۔ اس کی تحریروں میں کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوسکتی، جب تک وہ زندگی اورادب کوکسی خاص زاویۂ نظر سے دیکھنا اپنا شعار نہ بنالے۔

یہ بات شعوری طور پر میرے پیش نظر رہی ہے!

زندگی میرے نزدیک ارتقا اور ترقی کا دوسرا نام ہے۔ میرے خیال میں ہر فرد کو دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر دُنیا برابر ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن رہے ــــ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ذات کو اس ارتقا اور ترقّی میں ممد و معاون ثابت ہونا چاہیئے۔ ایسے معیاروں کا اس کے سامنے ہونا ضروری ہے جو اس کو زندگی کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترین اقدار کا حامل بنائیں۔ ہر فرد اپنے اقوال وافعال، عادات واطوار اور فکر وخیال کو اس بلندی پر لے جانے کی کوشش کرے جہاں سے تہذیب اور کلچر کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں میں ان معیاروں کا قائم ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے صرف کسی ایک میں ان اقدار کا رواج پاجانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انفرادیت، اجتماعیت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اور اجتماعیت، انفرادیت کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، اس لئے بیک وقت ان دونوں کی ترقی کا خیال ضروری ہے ــــ اسی کا نام حیاتِ انسانی کا ارتقا ہے۔

یہ ترقی یا ارتقا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اقتصادی اور معاشی اقدار میں ہمواری نہ پیدا ہوجائے۔ کیونکہ انسان کے بُنیادی مسائل اقتصادی اور معاشی ہیں ــــ اور انہیں پر ساری تہذیب اور کلچر کی عمارت کھڑی ہوئی

ہے۔ اس لئے اگر اجتماعی طور پر ان اقتصادی اور معاشی مسائل کو حل کر لیا جائے، اور ان کے نظام اقدار میں ایک ہمواری کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو زندگی کی معراج سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بغیر ذہنی اور روحانی ترقی بھی ناممکن ہے اور بغیر ان کی ترقی کے تہذیب اور کلچر کی ترقی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ادب میرے خیال میں اسی زندگی، تہذیب اور کلچر کا عکاس، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے۔ میں اسے انسانی جذبات واحساسات اور بلند سے بلند تر خیالات کا فنی اظہار سمجھتا ہوں۔ اس میں سماجی اور افادی پہلو بھی ہونا چاہیئے اور فنی و جمالیاتی بھی! اس کی یہی خصوصیت اسے زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہے کیونکہ زندگی بھی انہیں دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔

میرے خیال میں ادب ایک سماجی فعل ہے۔ اور چونکہ سماجی زندگی ہر لحہ اور ہر آن۔ تغیّر و تبدل سے ہم آغوش و ہم کنار رہتی ہے۔ اس لئے ادب بھی تغیرات و انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی زندگی کی تصویروں کا نظر آنا ضروری ہے۔ کیونکہ ادب بہر حال سماجی زندگی ہی کے درمیان پیدا ہوتا، پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ادب اپنے ماحول، حالات و واقعات اور سماجی زندگی کے مختلف مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اب یہ ادیب کی شخصیت، اس کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ماحول اور حالات و واقعات سے کس قسم کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یہ اثرات صحت منداور صحت بخش بھی ہو سکتے ہیں اور غیر صحت بخش بھی ایسی صورت میں ظاہر ہے وہی ادیب اہمیت کا مالک ہوگا جس کا شعور حالات و واقعات سے صحت منداور صحت بخش اثرات قبول کرنے کے لئے تیار ہو۔ چنانچہ میرے نزدیک ادیب کے شعور اور اس کی

شخصیت کو بڑی ہی اہمیت حاصل ہے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ادب کو محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ادب کے اندر وسعت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ خود زندگی جس سے وہ موضوعات لیتا اور مواد فراہم کرتا ہے بہت وسیع ہے۔ کسی خاص موضوع تک اس کو محدود کر دینا مناسب نہیں۔ زندگی کے تمام حالات و واقعات، بے شمار مسائل، لاتعداد جذبات واحساسات ادب کا موضوع بن سکتے ہیں اور آج تک بنتے رہے ہیں ـــــ البتّہ یہ ضروری ہے کہ بعض خاص حالات میں بعض مخصوص موضوعات کی طرف ادب کو خاص طور پر توجّہ کرنی پڑتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ موضوعات ان حالات میں خود زندگی کے اندر بڑی اہمیّت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں اگر کوئی ادیب ان موضوعات سے چشم پوشی کر کے ایسے موضوعات کو اپناتے جو وقت کی آواز نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کو سراہا نہیں جا سکتا، اور نہ ایسے ادیب کی یہ خصوصیت اس کے باشعور ہونے پر دلالت کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی زمانے میں سماجی زندگی میں انحطاط کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ہنگامہ، انتشار اور افراتفری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ تو ان حالات میں ادیب عیش وعشرت یا سرور وانبساط کے ترانے نہیں چھیڑ سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا وہ ایک سماجی مجرم ہے۔ اس کو تو ان حالات میں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہنگامہ، انتشار اور افراتفری کی کیفیت سماجی زندگی سے جلد ختم ہو جائے۔ ورنہ وہ خود اس کی ذات پر اثر انداز ہوگی۔ کیونکہ بہر حال وہ بھی سماج کا ایک فرد ہے۔ اسی وجہ سے میں ادب کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سماجی حالات کو اپنے دامن میں جگہ دے۔ اور آج کل کے پیچیدہ سماجی مسائل اور ان

کے باعث پیدا شدہ اثرات کو اپنا موضوع بنائے، تاکہ اس کے ہاتھوں کوئی بڑا کام ہو سکے۔ آج اگر کسی ادیب نے اپنے آپ کو صرف زندگی کے فراری رجحانات تک محدود کر لیا اور بے شمار لایعنی باتوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دینی شروع کر دی تو اس نے ایک ادیب کی حیثیت سے تو درکنار سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے بھی اپنے فرض کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے ادب کے متعلق جو خیالات و نظریات پیش کئے ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد بہت ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بھی خیال گزرے کہ میں ادب کے جدید افادی رجحانات ہی کو سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک قدیم کلاسیکی ادب اور جدید ادب دونوں عزیز ہیں۔ اپنی ادبی روایات کو بھی میرے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔ میرے خیال میں بغیر روایات کا خیال رکھے ہوئے جاندار ادب پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ روایات ایک مخصوص ماحول اور خاص قسم کے سماجی نظام کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ان میں اس ماحول اور نظام کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ قدیم کلاسیکی ادب اور ادبی روایات کو میں اپنے اپنے وقت اور ماحول کی سماجی زندگی کا ترجمان سمجھتا ہوں — لیکن قدیم ادب میں اجتماعی شعور نظر نہیں آتا۔ پھر بھی اس نے انفرادی نقطۂ نظر سے داخلی انداز میں سماجی زندگی اور اس کے تمام نشیب و فراز کی ترجمانی کی ہے۔ اور انسان کے بنیادی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں تو وہ پیش پیش رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ایک آفاقیت کی خصوصیت ہے۔ اسی کے سہارے وہ زندہ ہے۔

اس بات کا قائل ہونے کے باوجود کہ ادب کو سماجی حالات کا ترجمان ہونا چاہیئے اور اس کے پاس زندگی کو بدلنے اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے

کے لئے کوئی پیغام ہونا بھی ضروری ہے، میں ادب کی فنّی حیثیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ میرے نزدیک ادب کو سب سے پہلے ادب ہونا چاہیئے۔ ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سماجی اور اجتماعی حالات کی ترجمانی کے باوجود اپنی فنّی حیثیت کو نظر انداز نہ کرے۔ ادب کا بہر حال ایک جمالیاتی پہلو ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پہلو افادی پہلو کے ساتھ ساتھ پیدا نہ ہو تو ادب میں کوئی جان باقی نہیں رہتی اور نہ اس میں تاثر کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا پیدا ہونا ہر ادب کے اندر ضروری ہے۔

تنقید کو میں ادب کے لئے ضروری بلکہ ناگزیر سمجھتا ہوں۔ وہ ادب کو صحیح معنوں میں ادب بناتی اور ٹھیک راستوں پر لگاتی ہے۔ اس کا کام صرف ادب کی نکتہ چینی یا مدح سرائی نہیں ہے۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ سب سے پہلے تو وہ شمع راہ اور رہبرِ منزل کا کام کرتی ہے۔ اور پھر عوام میں بھی صحیح ادبی ذوق پیدا کرنا اور اعلیٰ ادبی اقدار کا رائج کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پیشِ نظر یہ بات بھی ہوتی ہے کہ وہ ادب کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کرے۔ اور جس کے نتیجے میں لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں، اس کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید میں دلچسپی لینا میرے نزدیک بہت ضروری ہے۔ اردو میں ابھی تنقید سے بہت کم لوگ دلچسپی لے رہے ہیں۔ صحیح اور اچھی تنقید لکھنے والے بھی کم ہیں، اور پڑھنے والوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ تنقید کو ادب سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ خود ادب ہے۔ ادب کے لئے جو خصوصیات لازمی اور ضروری قرار دی گئی ہیں وہ سب اس میں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی ادب کی طرح نقّاد کے تاثرات کے فنّی اظہار کا نام ہے۔

البتّہ یہ ضرور ہے کہ نقاد اس میں اپنے شعور سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت اس کو تخلیقی ادب سے ممتاز نہیں کرتی۔ کیونکہ اعلیٰ اور بلند ادب بھی وہی ہے جس میں اس کے تخلیق کرنے والے نے اپنے شعور سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہو۔ فنّی خصوصیات، جن کا ہونا تخلیقی ادب میں ضروری ہے، تنقید میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور وہی تنقید بلند ہے جس میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہو۔ بات یہ ہے کہ یہی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے اس سے دلچسپی لیتے اور زیادہ سے زیادہ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

آج کل تنقید کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ وہ آج بھی اسی تحریر کا نام ہے جو کسی ادبی یا فنّی تخلیق کے متعلق لکھی جاتی ہے، یا جس میں فن اور ادب کے اصولوں کے متعلق مختلف مباحث چھیڑے جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں اس کو ستاروں سے بھی آگے جانا پڑتا ہے۔ انسانی زندگی کے تجربات پر گہری نظر ڈالنی ہوتی ہے۔ حالات کی تہہ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ذہن و دماغ کے دریچے کھولنے پڑتے ہیں۔ دُنیا جہان کے تمام علوم اور نئے نئے انکشافات سے استفادہ کرنا ہوتا ہے۔ اور چونکہ موجودہ زمانے میں انسانیت خصوصیت کے ساتھ نئی نئی باتوں سے دوچار ہو رہی ہے، اس لئے تنقید میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ ان حالات نے آج کے نقّاد کے کام کو بھی خاصا مشکل بنا دیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ زندگی کا صحیح شعور رکھتا ہو۔ موجودہ حالات کی رفتار سے اس کو پوری واقفیت ہو۔ اور فکر و خیال کے نئے نئے شگوفے جو آئے دن پھوٹتے رہتے ہیں، وہ سب کے سب اس کے سامنے ہوں۔ مجھے تنقید کے اس نظریئے سے دلچسپی رہی ہے۔

نقطۂ نظر کے اختلافات کی وجہ سے آج بھی مختلف نقادوں نے تنقید کے مختلف اور متعدد گھروندے بنا رکھے ہیں۔ کوئی تاثراتی تنقید پر ایمان رکھتا ہے۔ کسی کے نزدیک تنقید جمالیات کی ایک شاخ ہے۔ اور اسی وجہ سے تنقید کو بھی جمالیاتی ہونا چاہیئے۔ کوئی کہتا ہے نفسیاتی تنقید اصل تنقید ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ اصل چیز فن ہے اور تنقید کا مصرف فنّی تنقید ہونا ضروری ہے۔ غرض یہ کہ تنقید کے متعلق اس طرح کے کئی مختلف نظریات ہیں جن سے نقطۂ نظر کے اختلافات کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے اس طرح ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ان سب کا مجموعہ ہے۔ تنقید میں تاثر کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ نقاد کو بہرحال خارجی حالات متاثر کرتے ہیں اور وہ ان تاثرات کو پیش کرتا ہے لیکن ان کے پیش کرنے میں اس کے شعور اور ادراک کو بھی دخل ہوتا ہے۔ ادب اور فن میں بھی ایک جمالیاتی پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے تنقید بھی ایک حد تک جمالیاتی پہلو کو تلاش کرتی ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو اس دائرے سے باہر نکل کر کچھ اور بھی باتیں تلاش کرنی ہوتی ہیں۔ جن کی نوعیت سماجی، اجتماعی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔ اس لئے تنقید کو سماجی، اجتماعی اور نفسیاتی بھی ہونا چاہیئے۔ فن بذاتِ خود اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تنقید بھی اس کی طرف توجہ کرتی ہے۔ لیکن صرف یہی اس کی منزل نہیں ——— کیونکہ ان ستاروں سے آگے اسے اور بھی جہان نظر آتے ہیں ———

میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کوشش کرتا ہوں کہ اپنی تنقید میں ان تمام باتوں کا خیال رکھوں۔ چنانچہ میری تنقید میں سب سے پہلے آپ کو ادب کے موضوع اور اس ماحول کی طرف توجہ ملے گی جس

کے درمیان وہ تخلیق کیا گیا۔ پھر اس کا بیان بھی نظر آئے گا کہ کس حد تک اس کا تخلیق کرنے والا اپنے ماحول سے متاثر ہے۔ یہ تاثر صحت مند ہے یا غیر صحت مند! صحت بخش ہے یا غیر صحت بخش! اس میں ادیب یا فن کار کی شخصیت کس حد تک بے نقاب نظر آتی ہے؟ وہ زندگی کو غلط تو نہیں سمجھا؟ اس نے اپنے موضوع پر گہری نظر ڈالی یا نہیں؟ اس کے شعور نے حالات کے سارے اسرار و رموز دیکھے ہیں یا نہیں؟ اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھی پتہ چلے گا کہ میں ادب کی فنّی حیثیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ میں جو کچھ اپنی تنقید میں پیش کرتا ہوں وہ بے شک میرے تاثرات ہیں، لیکن ان میں میرے شعور اور ادراک کو بھی دخل ہوتا ہے۔ ایک خاص نقطۂ نظر کی روشنی میں تنقید کرنا میرے نزدیک ضروری ہے۔ اس لئے میں نے ہر جگہ اپنی تنقیدی تحریروں میں ان تمام باتوں کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں ان سے ہٹ کر کسی قسم کی تنقید کو گوارا نہیں کر سکتا۔

یہ تمام مضامین بھی انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض نظریاتی تنقید کے حامل ہیں جن میں اصولوں کی بحث کی گئی ہے، اور بعض ایسے ہیں جن میں مختلف موضوعات کا جائزہ ان اصولوں کی روشنی میں لیا گیا ہے جن پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ یہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان سب کی عمارت مذکورہ بالا خیالات پر قائم ہے۔ اور اسی کا سہارا لے کر میں نے ان کو اس مجموعے کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

عبادت

دہلی کالج۔ ۳۱ رجولائی ۱۹۴۹ء

تنقید اور تجربے کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لئے ہر تنقید میں تجربہ اور ہر تجربے میں تنقید کا نظر آنا ایسا کچھ عجیب اور نامانوس نہیں معلوم ہوتا۔ ہر دَور کی تنقید ایک تجربہ ہوتی ہے، اور ہر دَور کے تجربے میں تنقید کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ دونوں ہر حال میں ایک دوسرے کا دامن تھام کر چلتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ادبی تاریخ کے ہر دَور میں اِن دونوں کا ہمیشہ ایک ناگزیر ربط رہا ہے۔

یہ کتاب "تنقیدی تجربے" تنقید اور تجربے کے اسی ناگزیر ربط کی اصلیت اور حقیقت کو تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ چنانچہ اس

سلسلے کی تفصیل، مختلف اور متنوّع موضوعات سے متعلق اُن مباحث میں موجود ہے، جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ ان موضوعات کو ادب کی کسی ایک صنف یا اُس صنف کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں کیا گیا ہے۔ یہ موضوعات تو اصنافِ ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ اسی لئے ان میں تنوّع کے باوجود ایک ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے، ایک مربوط کیفیت نظر آتی ہے اور کثرت میں ایک وحدت کا پتہ چلتا ہے۔

اِس کتاب کے پانچ حصّے ہیں جن میں دس مختلف موضوعات کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ پہلے حصّے میں تنقید اور تجربے کی نظریاتی اور تاریخی تفصیل کو پیش کیا گیا ہے، اور ادبی روایت میں اُس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا حصّہ، اُردو تنقید، اُس کے مختلف رُجحانات، اِن رُجحانات کے عَلَم برداروں، اور ان علم برداروں کے تنقیدی انداز و اسلوب سے متعلق ہے۔ تیسرے حصّے میں میرؔ اور اقبالؔ کے تنقیدی نظریات پر تجزیاتی بحث ہے، جس میں سے اُردو تنقید کی روایت اور تجربے کی ایک واضح تصویر اُبھرتی ہے۔ چوتھے حصّے میں غزل کی صنف اور اس صنف کے سب سے بڑے عَلَم بردار غالبؔ کے سماجی شعور اور اجتماعی میلان کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ پانچویں حصّے میں اُردو افسانوں میں حقیقت نگاری اور اُردو کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری کے موضوع پر مُفصّل بحث کی گئی ہے۔ اِس طرح اس میں کُل دسؔ مطالعے ہیں جن کا بُنیادی محور تنقید اور تجربہ ہے۔

جدید دَور میں اُردو تنقید نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے زندگی اور ادب کے مختلف تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور اس صورتِ حال نے خود اُس کو ایک تجربہ بنا دیا ہے۔ اس تجربے سے آج کل گہری دلچسپی لی جا رہی ہے۔ تنقید سے دلچسپی کے اِسی ماحول نے اِن خیالات کو ایک لڑی میں پرو کر، اس کتاب کی صورت میں پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔

یہ خیالات اپنی نوعیت کے اعتبار سے، چاہے کچھ اور ہوں یا نہ ہوں، تنقیدی ضرور ہیں۔ جن کی تشکیل و تعمیر میں تمام تر نئے دَور کے نئے تقاضوں کا ہاتھ ہے۔ اسی لئے اِن کو تنقیدی تجربے کا جو نام دیا گیا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ کیونکہ اِن میں بہرصورت تجربے کی تنقید بھی ہے اور تنقید کا تجربہ بھی!

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۶ر جولائی ۱۹۵۷ء

بابائے اُردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کے خطبات اور تقاریر کا یہ مکمّل مجموعہ ہے۔

ان خطبات اور تقاریر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک عظیم شخصیّت بے نقاب نظر آتی ہے۔ —————

ایک ایسی عظیم شخصیّت جس نے ماضی کو سمجھا ہے، حال کو دیکھا ہے اور مستقبل پر غور کیا ہے۔ جس میں تہذیبی اور ثقافتی مسائل کا ایسا گہرا شعور ہے جو موجودہ دور میں کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔ جس میں ادب و شعر کا ایسا رچا ہوا مذاق ہے جس کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ جس نے زبان اور کلچر کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح غور کیا ہے جس کا پتہ کہیں اور نہیں چلتا۔ جس میں علم و ادب کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کی ایسی

لگن ہے۔ جو کسی دُوسرے کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ جس نے اَدبی تحقیق و تنقید کا وہ اعلیٰ معیار پیش کیا ہے جو کوئی اور پیش نہ کر سکا۔ اور اس شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رفعت اور بلندی ہے، ایک مضبوطی اور استواری، ایک وسعت اور کشادہ دلی ہے۔ ایک عقلیت اور روشن دماغی ہے۔ ایک گہرائی اور گیرائی ہے۔ ایک حلم اور بردباری ہے۔ ایک لئے دیتے رہنے والا انداز ہے۔ اس شخصیت کی یہ بُنیادی خصوصیات ان خطبات اور تقاریر میں بھی بے نقاب ہیں اور اس اعتبار سے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔

یہ خطبات زیادہ تر زبان اور لسان کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان میں اُردو، زبان کی تاریخ، اس کی ابتدا کے متعلق نظریات، اس کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کی کیفیت، برّعظیم کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی برتری اور عظمت ـــــ یہ اور اُردو، زبان سے متعلق اسی طرح کے اور اَن گنت مسائل پر ان میں مفصّل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے ـــــ ان موضوعات پر بحث کرتے ہوئے بابائے اُردو کا زاویۂ نظر تحقیقی اور تنقیدی رہا ہے۔ اُردو، زبان سے انہیں والہانہ وابستگی اور بے پایاں محبت ہے۔ وہ اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بلند و برتر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُردو، زبان کے بارے میں ان خطبات اور تقاریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کی بنیادیں عقل و شعور پر استوار نہ ہوں۔ برخلاف اس کے اس سلسلے میں جو خیال بھی انہوں نے پیش کیا ہے، جس نظریئے کی وضاحت بھی کی ہے، ان سب میں ایک منطقی انداز پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان میں پیش

کی ہوئی ہر بات، ہر خیال اور ہر نظریے میں ایک وزن ہوتا ہے۔ پھر چونکہ ان میں خلوص کی فراوانی ہوتی ہے، اس لئے ان کے پیش کئے ہوئے تمام خیالات و نظریات دِل میں اُتر جاتے ہیں۔ ان کا اثر عالم گیر ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں زبان و لسان کے موضوعات سے دلچسپی لینے کی ایک فضا عام ہو جاتی ہے۔

ان خطبات اور تقاریر کی یہ سب سے نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کے ذریعے اپنی زبان سے دلچسپی لینے کی فضا قائم ہوئی ہے۔ ہماری قوم میں اپنی زبان سے دلچسپی لینے اس کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کا کوئی شعور نہیں تھا۔ اور اب بھی اس بات کا جیسا شعور ہونا چاہیئے نہیں ہے۔ لیکن جو بھی تھوڑا بہت شعور ہماری قوم کے افراد میں اپنی زبان کے "منت پذیر شانہ، گیسوؤں" کے سنوارنے کا آج نظر آتا ہے، وہ سب بابائے اُردو، کی ذات اور ان کے خطبات و تقاریر کا نتیجہ ہے۔ سرسیّد ہمارے پہلے رہنما تھے جنھوں نے زبان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، مُلکی اور ملّی اہمیت کو محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے بعض رفقا نے اس کی طرف توجّہ کی۔ لیکن ان کے سامنے کام کرنے کے لئے دوسرے میدان بھی تھے۔ اس لئے وہ اس کام کی طرف پوری توجّہ نہ کر سکے البتّہ آگے چل کر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی اہمیّت کو محسوس کیا، اور اس کام کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ اس کے ہر پہلو پر غور کیا۔ ہر مسئلے کو سلجھایا۔ اس کو ترقی دینے کے منصوبے بنائے۔ اس کی صحیح اہمیّت کو متعیّن کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ چناں چہ اس کی اہمیّت اور ضرورت کا صحیح احساس قوم کے افراد میں بڑی حد تک عام ہوا اور اس طرح زبان کے مسائل سے دلچسپی

لینے کی ایک فضا قائم ہوئی۔ اس فضا نے قومی زندگی اور اس کے مدوجزر پر گہرا اثر ڈالا۔

زبان کے بارے میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ وہ کسی قوم کی تہذیبی و ثقافتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اثر رہن سہن اور آداب معاشرت پر بڑا گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے مسائل اس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خطبات اور تقاریر میں زبان کے مسائل، زندگی سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ انہیں زندگی کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے زبان کے مسائل کی نوعیت ان کے یہاں تہذیبی و ثقافتی اور قومی و ملی ہو جاتی ہے۔ یہ زاویۂ نظر ان کے میدان کو بہت وسیع کر دیتا ہے۔ اس میں عظمت اور بلندی رفعت اور برتری کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ کام قومی کام کا ایک جُز بن جاتا ہے اور اس کی اہمیت سیاسی نوعیت کے کاموں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے خطبات و تقاریر سے اس کام کو انجام دے کر قوم کو ایک بلندی سے ہم کنار کیا ہے۔ اس میں ٹھوس کام کرنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئی ہیں کیوں کہ زندگی کی ثقافتی و تہذیبی اہمیت کے اسرار و رموز کو اس نے سمجھ لیا ہے اور وہ زندگی کے ہر پہلو کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھنے لگی ہے۔ یہ صورت مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے کام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اُردو زبان کو اپنے سفر ارتقا میں بڑی کٹھن اور دُشوار گزار منزلوں سے گُزرنا پڑا ہے۔ یہ زبان بدلتے ہوئے حالات کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ ایک

زمانے تک اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے اس کی طرف کسی
نے بھی خاطر خواجہ توجّہ نہیں کی۔ اُن دنوں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔
اور فارسی کے مقابلے میں اس نئی زبان کو بھلا کوئی کس طرح خاطر میں لاتا۔
لیکن زبان ایک ایسا جادُو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ اُردو، زبان کی
طرف خاطر خواہ توجّہ نہیں کی گئی لیکن چوں کہ وہ عوام کی زبان تھی، اور تاریخی
تقاضوں نے اس کو جنم دیا تھا، اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ وہ دلوں
میں گھر کرنے لگی۔ اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب عوام و خواص دونوں اس
کے دل دادہ ہوگئے لیکن سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی انحطاط و
زوال نے اسے تیزی سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ محض شعر و شاعری کی
زبان ٹھیری اور شعر و شاعری بھی ایسی جس کا مقصد دل بہلانا اور وقت
گزارنا تھا۔ انگریزوں کی توجہ سے اُسے کسی قدر فائدہ ضرور ہوا، لیکن انگریزوں
کو اس زبان سے زیادہ اپنی حکومت کی استواری عزیز تھی۔ بلکہ انہوں نے
اسی بُنیادی خیال کے زیرِ اثر اُردو کی ترقی و ارتقا میں حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ
یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کرکے اُردو،
کی بڑی خدمت انجام دی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ
اُردو، ہندی کے جھگڑے کو بھی انگریزوں ہی نے کھڑا کیا اور وہ برابر
اس کو ہوا دیتے رہے۔ سر سیّد اور اُن کے رفقا نے اس جھگڑے کو ختم
کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔
یہ جھگڑا ایک بڑی سازش کا نتیجہ تھا۔ موجودہ دور میں اس نے بڑی پیچیدہ
صورت اختیار کرلی تھی۔ کیوں کہ زبان کے مسئلے کو سیاست کا مسئلہ بنا دیا
گیا تھا۔ اس سے اُردو کو بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور یہ ایک حقیقت

ہے کہ اگر مولوی عبدالحق صاحب کی ذات اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس نہ کرتی اور ان سیاسی بازی گروں کا پول نہ کھولتی جو ہندی اور ہندوستانی کی تحریک چلا کر اُردو، کو کُند چھری سے ذبح کر دینا چاہتے تھے تو خدا جانے آج اس زبان کا کیا حشر ہوتا۔

مولوی صاحب نے اس موضوع کی طرف خاص طور پر توجّہ کی۔ اُنہوں نے اس ساری سازش کا پول کھول دیا جو اُردو، کے خلاف کی جا رہی تھی۔ انہوں سے صرف اس خیال سے ہندی کے مقابلے میں اُردو، کی حمایت نہیں کی کہ وہ ان کی زبان تھی بلکہ اس وجہ سے اس کا ساتھ دیا کہ وہ ہندوستان کے اس کلچر کا سرمایہ تھا جو ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے پیدا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اپنی تحریر و تقریر سے اس بنیادی خیال کو پھیلانے اور رجعت پسندوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان پر اثر نہیں ہوا۔ البتہ اس صورتِ حال نے ایک خاصے بڑے طبقے میں زبان کی حفاظت کا شعور پیدا کیا اور آج جو ہم ہندی کے مقابلے میں اُردو، سے اتنی دل چسپی دیکھتے ہیں۔ یہ سب مولوی صاحب قبلہ ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خطبات اور تقاریر میں جگہ جگہ اس موضوع پر مباحث کا سلسلہ ملتا ہے۔ لیکن اس بحث میں خلوص اور صداقت کے عناصر سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ عصبیت نام کو نظر نہیں آتی۔ جذباتیت کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ لیے دیے رہنے والا انداز کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ منطقی استدلال کی خصوصیت کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں ہوتی۔ خطبات اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردو، زبان کی تاریخ میں اس کو سنوارنے کا جو شعور کام کرتا ہوا کہیں کہیں نظر آتا ہے وہ شعور موجودہ دَور میں ان خطبات و تقاریر

نے پیدا کیا ہے۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس زبان سے دل چسپی کی ایک فضا بڑی حد تک عام ہوئی ہے۔ اس کے بولنے والے چاہے عملی طور پر اس کے لئے کچھ نہ کریں لیکن کم از کم یہ چاہتے ضرور ہیں کہ یہ زبان زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

خطبات میں اُردو، زبان کو ترقی کے راستوں پر گامزن کرنے کا ایک مکمّل اور واضح لائحہ عمل بھی موجود ہے۔ اس کا ذکر جگہ جگہ ان خطبات میں آتا ہے۔ مولوی صاحب بار بار اس طرف توجّہ دلاتے ہیں کہ زبان بغیر ایک شعوری کوشش کے خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی۔ علمی اور عملی دونوں طرح کے کام زبان کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ اَدبی سرمائے میں اضافہ بھی اس کی رفتارِ ارتقا کو تیز سے تیز تر کرتا ہے۔ تحقیق و تفتیش بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ مولوی صاحب نے ان تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اب یہ باتیں اُردو، دانوں کے لئے نئی نہیں ہیں۔ ان کے سامنے اپنی زبان کو ترقی دینے کے لائحہ عمل کا ایک مکمّل نقشہ موجود ہے۔ مولوی صاحب کے خطبات اور تقاریر نے اس سلسلے میں بھی بڑا کام کیا ہے۔

یہ خطبات اگرچہ عام جلسوں میں دیئے گئے ہیں اور یہ تقریریں عوام کے سامنے کی گئی ہیں لیکن ان میں ایک عالمانہ انداز ہر جگہ موجود ہے۔ تحقیق اور چھان بین کا رُجحان ان میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ مختلف علوم کے اثرات ان میں جگہ جگہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ وسیع مطالعے نے ان میں پیش کئے ہوئے خیالات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل کے گہرے شعور نے ان کو گہرائی اور گیرائی سے آشنا کر دیا

ہے۔ حالات کی صحیح نباضی نے ان میں تجزیاتی انداز کی تمام خصوصیات پیدا
کر دی ہیں ۔ ان کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی
صاحب نے لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی حقائق
کو وہ بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین ہوتی ہے
کہ ہندستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ ان میں تہذیبی و ثقافتی مسائل کا تجزیہ بڑی گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس
بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ ادب اور تنقید کے مسائل کو وہ بڑے عالمانہ
زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اَدبی اور تنقیدی مسائل
کے بیان میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ گویا مجموعی اعتبار
سے ان میں عالمانہ شان ہر جگہ نمایاں ہے لیکن اس عالمانہ شان کے
باوجود وہ خصوصیّت بھی ہے جو ان کو عوام سے قریب کرتی ہے جس کے
باعث عام افراد کے لئے بھی وہ دلچسپی اور افادے کا باعث بن سکتے
ہیں۔ یہ خصوصیت نظریاتی صفائی سے پیدا ہونے والی آسان پسندی کے
ہاتھوں ظہور میں آتی ہے۔ اسی خصوصیت نے ان خطبات اور تقاریر میں
بڑی عالمانہ باتوں کو عام فہم بنا دیا ہے۔

اسلوب اور اندازِ نگارش کے اعتبار سے بھی یہ خطبات بڑی اہمیت
رکھتے ہیں۔ اُردو، نثر کے اسالیب میں بھی ان کا ایک مخصوص مرتبہ ہے سادگی
ان کا نمایاں ترین وصف ہے لیکن ان کی اس سادگی میں بھی ایک پُرکاری
ہے۔ الفاظ کا دروبست اور محاوروں کا استعمال اس صورتِ حال کے
پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان میں عبارت آرائی نہیں
ہے لیکن ایک تسلسل اور روانی ہے جو ان کے افکار و خیالات کے تسلسل

اور روانی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ان میں ایک بے ساختگی اور برجستگی ہے جو نظریات کی بے باکی کی پیدا کردہ ہے۔ ان میں مشکل پسندی نام کو نہیں۔ برخلاف اس کے سلاست ہے جو معنوی آسان پسندی کے ہاتھوں وجود میں آئی ہے۔ اس میں زور ہے! جس کو خیال کی قطعیت نے پیدا کیا ہے۔ اس میں جوش ہے جو جذبے کی فراوانی اور احساس کی شدت کا بنیادی نتیجہ ہے۔ اس میں ولولہ انگیزی ہے جو نظریاتی خلوص اور صداقت کے نتیجے میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے ـــــ اور ان تمام باتوں نے مل کر اس اسلوب اور اندازِ نگارش کے ہیولے کو تیار کیا ہے جو اپنے اچھوتے پن کے باعث ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں دل موہ لینے والی کیفیت ہے۔ جس کا اثر وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ جس میں تاثر کا جادو ہے ـــــ مولوی صاحب کے ہر خطبے اور ہر تقریر میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں اور ان خصوصیات نے انہیں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

یہ خطبات معنوی و صوری دونوں اعتبار سے اَن گنت خصوصیات کے حامل ہیں، اور ان میں اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی کش مکش کے آئینہ دار ہیں۔ ہماری تہذیب و معاشرت کا قافلہ جن راہوں سے گزرا اُس نے جو منزلیں بھی طے کی ہیں ان کا بیان کسی نہ کسی طرح ان خطبات میں ضرور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قومی زندگی کے ارتقا اور تہذیبی و ثقافتی مدوجزر کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے ـــــ خصوصاً اس دَور میں جب کہ ہم "جگر لخت لخت" کو ایک بار پھر جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی خیال ان خطبات کی از سرِ نو ترتیب کا باعث بنا ہے۔ اس سے قبل انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نے انہیں

دو حصّوں میں شائع کیا تھا۔ لیکن وہ نامکمّل تھے۔ اب انہیں مکمّل صورت میں تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتّب کیا گیا ہے اور آخر میں تقریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

عبادت

شعبۂ اُردو
پنجاب یونیورسٹی لاہور
۳۰ / جون ۱۹۵۲ء

روایت کی اہمیت

یہ مجموعہ اُن تحقیقی و تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے جو کسی نہ کسی طرح اُردو ادب کی روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔

روایت کو ادبیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی اہمیت کا صیحح احساس تخلیق و تنقید دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جن لکھنے والوں میں روایت کی اہمیت کا صیحح احساس نہیں ہوتا، ان کی تحریریں بے جان اور بے رنگ و بو ہوتی ہیں۔ روایت کی اہمیت کا صیحح احساس فکر و خیال کو نئی منزلوں سے ہم کنار کرتا اور احساس و شعور کو نئے آسمانوں پر پرواز سکھاتا ہے۔ اسلوب و انداز بیان میں جولانی کی بجلیاں بھرتا اور اس کے جسم میں نیا خونِ زندگی دوڑاتا ہے۔ تجربات کے چشمے بھی اسی زمین سے پھوٹتے اور مختلف

اصناف ادب کو سیراب کرتے ہیں۔ تنقید میں بھی ایک رچا ہوا انداز یہی روایت کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کرتا ہے۔ اسی کے سہارے اس میں توازن اور اعتدال کی خصوصیت رونما ہوتی ہے۔ اَدبی ذوق کی تشکیل اور اس کو نکھارنے اور سنوارنے میں بھی روایت کی اہمیت کے صحیح احساس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ پڑھنے والے میں بھی اَدب کو سمجھنے اور اس سے دلچسپی لینے کی صلاحیت اسی کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے روایت کی اہمیت کا صحیح احساس دلانا اور اس کے لئے ایک فضا قائم کرنا اَدب، زندگی، تہذیب، کلچر اور خود انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ یہی احساس ان مضامین کو یکجا کرنے کا باعث بنا ہے ـــــ ان مضامین کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں لیکن ان میں روایت کی اہمیت کے صحیح احساس نے ایک رشتے کا کام کیا ہے، اور اسی بُنیادی خیال کو سامنے رکھ کر انہیں کتابی صورت میں پیش کرنے کی جُرأت کی گئی ہے۔ ان موضوعات میں یہ بنیادی بات سب سے بڑی وجہ اشتراک ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود ان مضامین میں ایک یک رنگی بھی نظر آتی ہے۔ وہ سب کے سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کو اسی خیال کے پیشِ نظر "روایت کی اہمیت" کا نام دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس سے اُس بنیادی خیال کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے جو اس مجموعے کی تشکیل کا باعث بنا ہے۔

یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اور اس سے قبل مُلک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب ان میں نظرِ ثانی کے

بعد، جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، ترمیم و اضافہ کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اندازِ بیان کی ارتقائی کیفیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ہر مضمون پر تاریخ بھی اسی خیال کے پیشِ نظر ڈال دی گئی ہے۔

کاش یہ مجموعہ اُردو اَدب کی روایات سے دِل بستگی رکھنے والوں کے لئے دِلچسپی کا باعث ہو!

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۲ رجولائی ۱۹۵۲ء

⑥

غزل اور مطالعۂ غزل

غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسی لئے رشید صاحب نے اس کو اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ ان کے خیال میں ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

اُردو میں اس غزل کی کوئی دو ڈھائی سو سال کی روایت موجود ہے۔ ان دو ڈھائی سو سالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گُزرا ہے، ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے۔ اس کی سچّی

اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔ اس عرصے میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے، جو کچھ بھی سوچا ہے، جو تصوّرات بھی قائم کئے ہیں، جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہے، ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے شاید ہی کسی اور صنفِ ادب نے کی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں تفصیل و جزئیات کا بیان نہیں ہے، لیکن اجمال و اختصار کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں اس نے جتنا کچھ، اور جیسا کچھ کہہ دیا ہے، کوئی اور صنف اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔

غزل کو اسی لئے ہماری زندگی کے ہر دَور میں قبولِ عام کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس نے خواص کی محفلوں میں جگہ بنائی ہے۔ عوام کے دلوں میں گھر کیا ہے۔ حال و قال کی دُنیا کے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ اسی لئے وہ زندگی کے ہر شُعبے کا ایک ایسا جُز معلوم ہوتی ہے جس کو اس سے جُدا کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا ——

اس صورتِ حال نے غزل کو فن ہی نہیں رہنے دیا ہے، اس میں ایک فسوں کی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے —— اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ بہ یک وقت ایک فن بھی ہے اور فسوں بھی!

خود غزل کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے!

لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ غزل کی صنف کی طرف جیسی اور جتنی توجہ ہونی چاہیئے تھی، نہیں ہو سکی ہے۔ ہر زمانے میں اس سے دل چسپی کا ماحول تو رہا ہے لیکن اس کے صحیح مقام اور مرتبے کو متعیّن کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے —— ایسی کوشش جس سے صنفِ غزل کے افادی اور جمالیاتی دونوں پہلوؤں کے خدوخال کا صحیح

اندازہ ہو۔ اُردو غزل کی دو ڈھائی سو سال کی روایت ہر زمانے میں آسمان سے تارے توڑ کے لاتی رہی ہے۔ اس حقیقت کو محسوس بھی کیا گیا ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو غزل کی روایت کو مخصوص حالات نے ایک زمانے تک صحیح تنقید سے محروم رکھا ہے۔

غزل اور اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بیسویں صدی کے آغاز سے قبل کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتی۔ غزل کے اصول ایک زمانے تک افراد کے ذہنوں میں ضرور موجود رہے لیکن کسی نے باقاعدگی سے ان کو پیش نہیں کیا ہے۔ جستہ جستہ ضمنی طور پر ان میں سے بعض اصولوں کی طرف اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ اِن اشاروں کا سُراغ ولی، میر، سودا، درد، انشا، مصحفی، جرأت، غالب، مومن، ذوق، ظفر، شیفتہ، آتش، ناسخ، داغ، امیر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ حالی نے سب سے پہلے ان اصولوں کو یک جا کر کے ان پر تنقیدی زاویۂ نظر سے بحث کی۔ وہ غزل کے پہلے نقاد ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ غزل کے اصول پر ان کا تنقیدی تجزیہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی بحث محدود ضرور ہے، کیوں کہ وہ بہر حال ان کے مقدمہ شعر و شاعری کا ایک حصّہ ہے لیکن جس انداز میں یہ تنقیدی بحث انہوں نے کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حالی نے اس سلسلے میں روایت اور تجربے کے گہرے شعور، کو اپنے لئے شمع راہ بنایا ہے۔ اور اسی لئے ان کے تنقیدی مباحث میں غزل پر بڑی پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ حالی نے سب سے پہلے غزل کی تنقید کا آغاز کیا، اور آج جو غزل

کے اصولوں کو سمجھنے اور برتنے کی طرف عام میلان نظر آتا ہے، اس میں
حالی کی تنقیدی کاوشوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ
تمام تر حالی ہی کی تنقید کا مرہونِ منّت ہے۔ حالی کے علاوہ خواجہ امداد
امام اثر نے بھی اپنی کتاب "کاشف الحقائق" میں غزل کے اصول پر بحث
کی ہے، اور ہر چند کہ اس بحث کی بنیادیں حالی کے سے گہرے تنقیدی
شعور پر استوار نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار
ممکن نہیں۔ جدید دَور میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی کتاب "اُردو
غزل" اور پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، پروفیسر فراق
گورکھپوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، جناب نیاز
فتح پوری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے بعض
مضامین اصول غزل کی تنقید میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر
کلیم الدین احمد نے بھی غزل کے اصول پر بحث کی ہے اور اگرچہ ان کا زاویہ
نظر تمام تر تخریبی اور انتہا پسندانہ ہے لیکن ان کی بحث نے غزل کے مختلف
پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے لئے بعض نئی راہیں ضرور نکالی ہیں اور اس
طرح غزل کی تنقید کو نئی جولان گاہوں سے روشناس ہونے کا موقع مِلا ہے۔

"غزل اور مطالعۂ غزل" میں ان تمام تنقیدی مباحث کو سامنے رکھ کر
اصولِ غزل کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش
کی گئی ہے۔ اس کے بعض حصّے اصول اور نظریات کی بحثوں پر مشتمل ہیں
اور بعضوں میں اردو غزل کے ارتقاء اور اس میں پیدا ہونے والے مختلف
رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ بحث اور تجزیے میں ہمہ گیری کے خیال
نے اس کتاب کے بعض حصّوں کو طویل ضرور بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے بغیر

چارہ بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ بعض موضوعات اپنی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر طوالت کا تقاضا کرتے ہیں" ۔ اُردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اس کتاب کا سب سے طولانی باب ہے ۔ اُردو غزل کی ڈھائی سو سال کی روایت اور اس کی ارتقائی کیفیت کا تنقیدی تجزیہ طوالت کے بغیر ممکن نہیں ۔ اسی لئے اس کی غیر معمولی طوالت کو گوارا کر لیا گیا ہے ۔ اس کو ترتیب دیتے ہوئے بار بار یہ خیال گزرا کہ اسے دو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتے لیکن پھر اس طرح بات بنتی ہوئی نظر نہیں آئی ۔ کیوں کہ اس طرح تو پھر اس کے آٹھ دس حصّے بھی ہو سکتے تھے ۔ چنانچہ یہی مناسب سمجھا گیا کہ اس کو مسلسل رکھا جاتے ۔۔۔ کیونکہ اس صورت میں کم از کم اس کی وحدت کو تو ٹھیس نہیں لگتی ۔ اس کے تسلسل میں تو فرق محسوس نہیں ہوتا ۔ خیالات کی وضاحت کے لئے جگہ جگہ مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب بھی دے دیا گیا ہے ۔ اس کتاب کے مختلف حصّوں میں خیالات کے دُہرائے جانے کا احساس ہو سکتا ہے ، لیکن چونکہ ان میں سے ہر حصّے کی اپنی بھی ایک وحدت ہے ، اس لئے ایسا ہونا ناگزیر تھا ـــــ یہ حصّے بہر حال مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے موضوع کی نوعیت مختلف ہے ۔

اس کتاب کے بعض حصّوں کی تیاری میں مجھے پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب (شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی) سے بڑی مدد ملی ۔ کئی سو میل دور بیٹھ کر بھی وہ برابر مجھے اپنے مشوروں سے مستفیض فرماتے رہے اور اس کیلئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں ۔ برادر مکرم پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب نے اس کتاب کے بعض

حصّوں پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا فرمائی اور مجھے بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔
میں ان کا بھی تہہ دِل سے شُکر گزار ہوں۔

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲ر اپریل ۱۹۵۵ء

جدید شاعری

اُردو میں جدید شاعری کی تحریک آج سے تقریباً سو سال قبل شروع ہوئی تھی۔ اس ایک صدی کے عرصے میں اُس نے بہت سی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں نئے حالات سے اُسے آشنا ہونے کا موقع ملا ہے۔ نئے معاملات و مسائل کو اُس نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے، اور اس طرح مواد اور ہیئت کے نئے رُجحانات اُس میں پیدا ہوئے ہیں۔

یہ کتاب جدید شاعری کے انھیں رُجحانات کو تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ آسانی کے خیال سے اس کو دس حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ ایک باب پر مشتمل ہے، اور اس میں جدید شاعری کے ارتقائی مدّوجزر کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ دوسرے حصّے میں

دو باب ہیں۔ ایک میں اُردو شاعری اور جدّت پسندی کی روایت پر بحث ہے اور دوسرے میں اُردو شاعری کے جدید رُجحانات کا تجزیہ ہے۔ تیسرا حصّہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک میں حالی، دوسرے میں اقبالؒ اور تیسرے میں جوش کے شعری کارناموں کا تنقیدی جائزہ ہے۔ چوتھے حصّے میں دو باب ہیں۔ ایک جدید شاعری اور عُریانی سے متعلق ہے اور دوسرے میں جدید شاعری اور ابہام کے موضوع پر چند خیالات ہیں۔ پانچویں حصّے میں غزل کے نئے میلانات اور چھٹے حصّے میں جدید شاعری اور نظم آزاد پر اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ساتویں حصّے میں کئی باب ہیں جن میں جدید شاعری کے بعض اہم علم برداروں کی تخلیقی کاوشوں کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ آٹھویں حصّے میں دو باب ہیں جن میں جدید شاعری کی موجودہ صورتِ حال اور اُس کے بعض مسائل کو تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نواں حصّہ جدید شاعری کے انحطاط اور اُس کے بعض انحطاطی میلانات کی وضاحت کرتا ہے۔ اور دسویں حصّے میں جدید اردو شعراء کے حالات ہیں۔

جدید شاعری کے اس جائزے کو مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جن خیالات کا اظہار اس سلسلے میں کیا گیا ہے اور جو نتائج نکالے گئے ہیں، اُن سے پوری طرح اتفاق کیا جائے۔ اس جائزے میں ایک مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر سے کام لیا گیا ہے، اور اسی کی روشنی میں جدید شاعری کی تحریک، اور اس میں پیدا ہونے والے رُجحانات اور اُن کے بعض علم برداروں کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے —— تمام جدید شاعروں کا مفصل مطالعہ اس کتاب کا موضوع نہیں۔ یہ تو بُنیادی طور پر جدید شاعری کی تحریک اور اُس

کے مختلف رُجحانات و میلانات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس میں اِن رُجحانات کے چند اہم علم برداروں ہی کو مُفصل مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے، اور اس کا مقصد بھی رُجحانات ہی کی وضاحت ہے۔

اس تنقیدی جائزے کی تیاری میں مجھے وقتاً فوقتاً جدید اُردو ادب کی بعض اہم شخصیتوں سے تبادلۂ خیال کے مواقع ملے ہیں۔ میں نے جدید شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بابائے اُردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حضرت جوشؔ ملیح آبادی، حضرت فراقؔ گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیرؔ مرحوم، جناب فیض احمد فیضؔ، جناب ن۔م۔ راشدؔ، میراجیؔ مرحوم، جناب سید محمد جعفری، جناب ساحرؔ لدھیانوی، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب علی جواد زیدی، اسرارالحق مجازؔ مرحوم، جناب ناصر کاظمی، پروفیسر آل احمد سرورؔ، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر سید وقار عظیم اور پروفیسر محمد حسن عسکری سے گفتگو کی ہے اور ان کے تنقیدی خیالات سے استفادہ کیا ہے ــــ اس لئے اس کتاب میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس کا سہرا ان بزرگوں اور دوستوں کے سر ہے۔ البتہ خامیاں سب میری ہیں۔

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۱۹۶۰ء

⑧ مومن اور مطالعۂ مومن

اُنیسویں صدی کی دِلّی میں جن باکمال شاعروں نے آنکھ کھولی اُن میں حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کی شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی انفرادیت کو یوں تو اُن کے ہم عصر شاعروں، معاصر تذکرہ نگاروں اور موجودہ دور کے لکھنے والوں سب ہی نے تسلیم کیا ہے لیکن ابھی تک اُن کے حالات کو جاننے، اُن کی شخصیت کو پہچاننے، اُن کے ماحول کو کھنگالنے اور اُن کی شاعری کے مختلف میدانوں کو چھاننے کا کام جیسا اور جس طرح ہونا چاہیئے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ جستہ جستہ مختلف تذکروں اور ادبی تاریخوں میں تو اُن کا ذکر ملتا ہے لیکن اُن پر ابھی تک کوئی مستقل اور مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ حالانکہ اُن کی پہلو دار شخصیت اور تہہ دار شاعری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مفصل کتاب اُن پر لکھی جائے۔

یہ خیال ہی اس کتاب کی ترتیب و تالیف کا باعث بنا ہے۔ یہ کتاب

سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مومن کے حالاتِ زندگی کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں اُن کی شخصیّت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ ہے۔ تیسرے باب میں اُن کے زمانے کے تاریخی و سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، ذہنی و فکری، ادبی و شعری ماحول کا جائزہ ہے۔ چوتھے باب میں اُن کی تصانیف کی تفصیل ہے۔ پانچویں باب میں اُن کی غزل اور چھٹے باب میں اُن کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ ساتویں باب میں مختلف لکھنے والوں کے خیالات کو سامنے رکھ کر اُن کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

ایک زمانے سے میری یہ خواہش تھی کہ مومن پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب لکھوں لیکن بعض دوسرے کاموں میں مصروف رہنے کے باعث یہ خواہش دل کی دِل ہی میں رہی اور میں اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد اب خُدا خُدا کر کے اس خیال نے عمل کی شکل اختیار کی ہے اور اس کا سہرا برادرِ گرامی حکیم حبیب احمدؐ خاں صاحب اشعر دہلوی کے سر ہے۔ اُن کے پیہم تقاضوں نے اِس کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہمیت مجھ پر واضح کی اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس موضوع پر شوق اور انہماک کے ساتھ کام کروں۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب میں مومن کی شخصیّت اور شاعری سے متعلق تقریباً تمام مواد کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے، اور اب تک اس موضوع پر جتنی بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے حتی الامکان استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مواد کی فراہمی میں مجھے بعض احباب سے بہت مدد ملی ہے۔ اِن میں جناب حکیم حبیب اشعر دہلوی، جناب مولانا سید ابوالخیر مودودی، جناب مولوی عبدالحیٔ انصاری، جناب قاضی عبدالودود، جناب

سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مومن کے حالاتِ زندگی کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں اُن کی شخصیّت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ ہے۔ تیسرے باب میں اُن کے زمانے کے تاریخی و سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، ذہنی و فکری، ادبی و شعری ماحول کا جائزہ ہے۔ چوتھے باب میں اُن کی تصانیف کی تفصیل ہے۔ پانچویں باب میں اُن کی غزل اور چھٹے باب میں اُن کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ ساتویں باب میں مختلف لکھنے والوں کے خیالات کو سامنے رکھ کر اُن کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

ایک زمانے سے میری یہ خواہش تھی کہ مومن پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب لکھوں لیکن بعض دوسرے کاموں میں مصروف رہنے کے باعث یہ خواہش دل کی دِل ہی میں رہی اور میں اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد اب خُدا خُدا کر کے اس خیال نے عمل کی شکل اختیار کی ہے اور اس کا سہرا برادرِ گرامی حکیم حبیب احمؔد خاں صاحب اشعر دہلوی کے سر ہے۔ اُن کے پیہم تقاضوں نے اِس کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہمیت مجھ پر واضح کی اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس موضوع پر شوق اور انہماک کے ساتھ کام کروں۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب میں مومن کی شخصیّت اور شاعری سے متعلق تقریباً تمام مواد کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، اور اب تک اس موضوع پر جتنی بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے حتی الامکان استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مواد کی فراہمی میں مجھے بعض احباب سے بہت مدد ملی ہے۔ اِن میں جناب حکیم حبیب اشعر دہلوی، جناب مولانا سیّد ابوالخیر مودودی، جناب مولوی عبدالحیٔ انصاری، جناب قاضی عبدالودود، جناب

سید تمکین کاظمی، جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی، جناب پروفیسر سید
احتشام حسین صاحب اور جناب پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے اسم ہائے
گرامی خاص طور قابل ذکر ہیں۔ اِن بزرگوں اور دوستوں نے نہ صرف فراہمیٔ مواد
میں میری مدد کی بلکہ اکثر اپنے گراں قدر مشوروں سے بھی مجھے نوازا، اور میں ان
تمام حضرات کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ برادرِ محترم جناب ملک
محمد اسلم صاحب (چیف اڈیٹر برٹش انفارمیشن سروس لاہور) نے اپنی گوناگوں
مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب کے پروف پڑھے اور اشاریہ تیار کرنے
کی زحمت بھی گوارا فرمائی۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوش گوار فرض ہے۔
میں اپنے عزیز شاگرد پروفیسر عثمان صدیقی صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں
نے مومن کی فارسی تحریروں کی تصحیح کے کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

مومن کی شخصیت اور شاعری کا یہ مطالعہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر
سے کیا گیا ہے لیکن یہ ایک بہت حقیر سی کوشش ہے جو صرف اس خیال سے
کی گئی ہے کہ آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا اور مستقبل میں واقعی اعلیٰ
درجے کے کام اس موضوع پر ہو سکیں گے!

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۰ / اکتوبر ۱۹۶۱ء

۹
ہفتِ گلشن

منظہر علی خاں ولا کی یہ تالیف دراصل ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب "ہفت گلشن" کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ولا نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں کیا۔ چنانچہ اس کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں :-

"ابتدائے رسالہ یوں ہے کہ بیشتر کتنی حکایتیں

بطور نصائح کے سخنان بزرگانہ سے ناصر علی خاں بلگرامی
واسطی نے زبان فارسی میں تالیف کیں اور نامہ اُس کا
ہفت گلشن رکھا۔ سو اب عصر میں عالی گوہر بادشاہ ظل اللہ
کے اور عہد میں اس عادل زماں کے کہ جس کے عدل
سے ایک گھاٹ باگ بکری پانی پیتے ہیں، اور ایک بن
میں درند و چرند بستے ہیں، ایک آشیانے میں شاہین و
ھُدھُد رہتے ہیں وہ حاتم دوراں امیرالامرا، زبدۂ نوئینان
عظیم الشان، مشیر خاص حضور شاہ کیواں بارگاہ انگلستان
اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ممالک محروسہ
سرکار کمپنی انگریز، متعلقہ کشورِ ہند، فدوی شاہ عالم
بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ مظہر علی خاں شاعر کہ ولا
جس کا تخلص ہے، واسطے سمجھنے اور سیکھنے نو آموز
صاحبوں کے، بہ موجب حکم جناب گلکرسٹ صاحب
دام اقبالہٗ، زبان اُردو میں بیان کرتا ہے۔"[1]

یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔ سید محمدؒ نے لکھا ہے:

"یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی ہے اور اس وقت
تک صرف ایک قلمی نسخے کا پتہ چلا ہے اور وہ برٹش
میوزیم میں ہے۔ ممکن ہے کہ یہی مؤلف کا مسودہ ہو۔"[2]

---

[1] ہفت گلشن۔ دیباچہ مؤلف (قلمی نسخہ برٹش میوزیم) صفحہ ۱
[2] سید محمدؒ: ارباب نثر اُردو صفحہ ۱۶۵

مجھے اس کتاب کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ملا۔ یہ مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ حسین علی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ بھی درج نہیں ہے۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ ۱۸۰۱ء کے آس پاس کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر G. C. HAUGHTON کے دستخط ہیں اور اُس کے نیچے فروری ۱۸۱۸ء تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ غالباً یہ نسخہ اسی شخص کی ملکیت تھا اور عرصے تک اس کے پاس رہا۔ برٹش میوزیم نے اس کو سر ٹامس ریڈ سے ۲۸ جنوری ۱۸۵۲ء کو خریدا۔ چنانچہ اس کے آخری صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

PURCHASED OF SIR THOMAS READE LATE. 28 JANUARY, 1852.

چونکہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور کسی کو اس کا علم نہیں تھا اس لئے اب اس کو ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت

شعبۂ اُردو و ثقافت پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مظہر علی خاں ولا فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا مرتبہ میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا علی لطف، مرزا کاظم علی جوان، میر شیر علی افسوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ایک بلند پایہ نثر نگار تھے۔ لیکن نہ تو ان کا دیوان چھپا نہ وہ کتابیں شائع ہوئیں جو انہوں نے نثر میں لکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو دنیا میں ابھی تک اُن کا مرتبہ متعین نہیں ہو سکا ہے اور لوگ اُن کے صحیح مقام کو پہچان نہیں سکے ہیں :

مصحفی، شیفتہ اور بینی نرائن جہاں نے اُن کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ یہ سب کے سب اُن کی عزت کرتے ہیں اور اُن کی اہمیت سے پوری طرح آشنا ہیں۔

مُصحفی لکھتے ہیں :-

"مظہر علی خاں ولا تخلص عرف مرزا لطف علی خلف سلیمان علی خان وداد، جوان حلیم وسلیم۔ بہ مُقتضائے

موزونیٔ طبع گاہ گاہے خیال شعر ہندی می کند و بہ نام
پدر بزرگوار خود ہرجا فروختہ می شود۔ استفادۂ شعرش
چندے بہ مرزا جان طپش و چندے بہ مولف بود۔ حالا
بہ میر نظام الدین ممنون کلام خود را می نماید"۔[۱]

شیفتہ نے لکھا ہے :۔

ولا تخلص مظہر علی خاں فرزند سلیمان علی خان وداد
کہ از شعرائے مشہور پارسی است۔ نسبت تلمذ وے بہ میر
نظام الدین ممنون کردہ اند"۔[۲]

اور بینی نرائن جہاں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :۔

"ولا تخلص، نام مرزا لطف علی خاں عرف مظہر علی خاں،
خلف سلیمان علی خاں عرف مرزا محمد زماں وداد، ابن محمد حسین
بہ خطاب علی قلی خاں۔ دلی کے رہنے والے ہمیشہ عمدہ
روزگار رہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور
اس خاکسار پہ نہایت مہربانی فرماتے ہیں"۔[۳]

افسوس ہے مظہر علی خاں ولاؔ کی زندگی کے حالات کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ جن لکھنے والوں نے ان کے حالات لکھے ہیں اُن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے

---

[۱] مصحفی : تذکرۂ ہندی : صفحہ ۲۶۶

[۲] شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۲۳۷

[۳] بینی نرائن جہاں : دیوان جہاں : صفحہ ۲۵۸

اپنی زندگی کا زیادہ حصہ کلکتہ میں گزارا اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اُنہیں شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ مصحفی اور ممنون کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری کا یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے والد سلیمان قلی خاں وداد بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ولا کی تعلیم و تربیت اچھے ماحول میں ہوئی اور انہوں نے عربی، فارسی سنسکرت اور ھندی میں مہارت حاصل کی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو وہ بھی لکھنؤ سے کلکتہ گئے اور وہاں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اُن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں۔ بینی نارائن جہاں کے تذکرے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء تک زندہ تھے اور کلکتہ میں مقیم تھے۔

ولا نے اپنے آپ کو خود بھی شاعر ہی کہا ہے۔ ہفت گلشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"مظہر علی خاں شاعر کہ ولا جس کا تخلّص ہے واسطے سمجھنے اور سیکھنے نوآموز صاحبوں کے، بہ موجب حکم جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہٗ، زبان اُردو میں بیان کرتا ہے"[۱]

انہوں نے اپنا دیوان بھی مُرتّب کیا تھا۔ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے :-

"ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ مع سوانح عمری

---

[۱] ولا : ہفت گلشن : صفحہ ۱

مصنف کے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا۔" [1]

اور سید محمد نے اُن کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے :۔

"ولا صاحب دیوان ہیں اور اُن کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں اُن کے دیوان کا پتہ نہیں چلا"۔ [2]

ولا کے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے ے

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سنے
ہے ان دنوں دماغ تیرا آسمان پر

نہ حاجت کے لئے دستِ دُعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے سچ تو یہ ہے ہاتھ اٹھاتا ہوں

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا تھی یہ میرے دیدۂ گریاں کے بیچ

یوں ہی گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں
آپ بھی رو دیں گے اک دن منہ پہ دھر کر آستیں

قتل سے میرے نہ منکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیری سرا سر آستیں

عشق کے آثار سب تجھ میں ھویدا ہیں ولا
رنگ زرد و آہِ سرد و اشک سے تر آستیں

---

[1] سکسینہ : تاریخ ادب اُردو مترجمہ عسکری : صفحہ ۱۳

[2] سید محمد : ارباب نثر اُردو : صفحہ ۱۶۱

ہرگز نہ گریں اس سے اشک اثر آلودہ
ھووے نہ کبھی خوں سے جو چشم تر آلودہ
از بس کہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے کرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ
واں رشک چمن اُس نے گھر اپنا کیا ہے، یاں
اشک جگری سے ہے دیوار و در آلودہ
اِک پل میں گزر جاوے یہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بری ظالم آہِ اثر آلودہ
بخش اپنے ولا کو بھی از راہ کرم یارب
ہرچند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ
دل کہوں کہ نہ ہو اُس بتِ طرار کے صدقے
ہوتے ہیں سب ہی وضع طرح دار کے صدقے
گہہ چشم و گہہ ابرو گہے چین جبین کے
گہہ خال کے ہوں گاہ میں رخسار کے صدقے
اک بوسہ تو لینے دے مجھے اپنے لبوں سے
انکار نہ کر میں ترے انکار کے صدقے
اس اشک کے قطرے کو اثر دے مرے یا رب
تا ہووے ولا چشم گہربار کے صدقے
ہمدم فقط نہ مجھ ہی کو اُس گل نے غش کیا
یک قطرہ خون نہیں جگر و دل میں یاں مرے

مجھ کو تو اشک خوں کے تسلسل نے غش کیا
آیا جو انجمن میں تو بس گل نے غش کیا
عالم نہ سکتے کا ہے فقط اپنا ہی ولا
عالم کو اس کی شان تجمّل نے غش کیا
زلفوں میں جا اُسی کی دل زار بندھ گیا
چھٹتے ہی آہ پھر نہ گرفتار بندھ گیا
اُس برق وش کی یاد میں رویا ہوں یاں تلک
مینہ کی جھڑی کی طرح سے اک تار بندھ گیا
ہوش و حواس اُڑ گئے فی الفور اے ولا
دل میں خیال یار جو اک بار بندھ گیا
یاد میں اُس کی کون سا دل جو مثل جرس نالاں نہیں
چشم نظارہ کس کی یہاں اب آئینہ ساں حیراں نہیں
ایک نگہ اس ماہ جبیں کو دیکھا ہے جس نے اس کا تو
دیدہ گریاں سینہ ہے بریاں، ہوش نہیں اوسان نہیں
بزم میں اپنی بیٹھ کے ہم کو جو جو کچھ تم کہتے ہو
ہم پر گو ہموار ہوا سب، آپ کے یہ شایان نہیں
کون سنے ہے کس کنے جا کر حال دل اپنا عرض کرے
تیرے سوا تو کوئی ولا کا جان نہیں پہچان نہیں

یہ اشعار اعلیٰ درجے کے اشعار ہیں اور ان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ولا غزل کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اس فن پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی اور انہوں نے شاعری کی دُنیا میں اپنا

ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔

مظہر علی خاں ولا نے اپنی کتاب جہانگیر شاہی میں اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں اُس کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"حقیر مظہر علی خاں جو سلیمان علی خاں کا چھوٹا بیٹا اور پوتا آقا محمد حسین اصفہانی کا، جس کا، خطاب علی قلی خاں تھا اور پروتا آقا صادق ترک کا یہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ دونوں بزرگوار ساتھ ساتھ ولایت اصفہان سے شاہ جہاں آباد میں آئے۔ شدہ شدہ آقا محمد حسین نے نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش غفراں پناہ کی وساطت سے سنہ احد میں فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ کا شرف ملازمت اختیار کیا۔ اور اپنی لیاقت و قابلیت سے یہ رسائی بہم پہنچائی کہ شہنشاہ گیتی ستاں نے ازراہ نوازش و مہربانی حضور کی بائیس خدمتوں سے ــــ جیسے خاصہ، بارہ اور کچہری اور گلال باد اور پیادہ کرناٹک اور اکثر حلقوں سے اہتمام کے سوا، اور خدمتوں کی داروغگی سے سرفراز کر علی قلی خاں خطاب عنایت فرمایا۔ خان مغفور کی رحلت کے بعد بڑا بیٹا سلیمان قلی خاں عرف مرزا محمد زماں وداد کہ کمالات حمیدہ سے متصف تھا نواب نجم الدولہ محمد اسحٰق خاں بہادر جو بہ نواب شہید مشہور ہے، اُس کے وسیلے سے اور بہ نظر قدامت ازراہِ نوازش اور مہربانی کے ظل سبحانی

نے تجویز کر منگل باشی کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ نواب موصوف اُس کے جوہر نے ملاحظے سے برابر کا سلوک کرتا، اور اس بزرگوار کی وضع کی تقلید و تتبع شاہ و گدا کرتا۔ چنانچہ یہ بات مشہور و معروف ہے۔ اور شاہ عالم بادشاہ و خلداللہ برھانہ، ملکہ، کی ابتدائے سلطنت میں نواب عزت الدولہ صولت جنگ موسیٰ خاں بہادر غفراں پناہ کی رفاقت اختیار کی تھی جو فن اشعار فارسی و ہندی اور محاورہ دانی اردو و فارسی میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ چنانچہ فخر الشعراء مرزا رفیع سودا اور میاں خاکسار خادم قدم شریف نے سرمایہ ریختہ گوئی کا اسی جناب کی شاگردی سے حاصل کیا۔ یہ عاصی مدت تلک نواب سیف الدولہ بخشی الملک نجف علی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت میں رہا، اور کتنے دنوں شہزادہ جہاندار شاہ بہادر عرف مرزا جواں بخت کی سرکار میں تھا۔ اکثر اوقات جو شہزادہ جنت آرام گاہ کے حضور اشعار گزرانتا تفضلات و مہربانی سے تحسین و آفریں فرماتے۔ جس وقت کہ شہزادہ عالی جاہ نے بنارس کو کوچ کیا اتفاقاً بندے کا رہنا لکھنؤ میں ہوا۔ بعد اس کے معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج دھراج نراندر مہاراج ٹکیٹ رائے بہادر صلابت جنگ نے اس بندے کی نوکری سررشتہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر ھزبر جنگ کی سرکار میں درست کر، اپنا رفیق کیا۔ چنانچہ چھ سات برس تلک اُس کے سررشتے میں رہا۔ جب

مہاراج کی مختاری کا سررشتہ برہم ہوا راقم کتنے دنوں معطل
رہا تھا کہ اتفاق حسنہ سے اٹھارہ سو (۱۸۰۰ء) عیسوی میں
نواب مستطاب معلی القاب تاج بخش سلاطین ہندوستان
مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ نے جو لکھنؤ سے
شاعروں کو بلوایا، بندے نے بخشی الممالک فخرالدین احمد
خاں عرف مرزا جعفر ابن محسن زماں خاں مرحوم کی وساطت
و مربی گری سے ملازمت اسکاٹ صاحب والامناقب
و عالی مناصب کی حاصل کی، اور اُنیس مارچ کی دسویں
تاریخ نوکر ہو، سنہ مذکورہ میں وارد کلکتہ ہوا اور ملازمت
امیرالامراء بہادر (چیف سیکرٹری) کی حاصل کی۔ اُنہیں کے
حکم کے بہ موجب صاحب عالی شان، عالم معانی و بیان
جان گل کرسٹ صاحب کی خدمت میں جو زبان ہندی کے
مدرس تھے، متعین ہوا، اور صاحب ممدوح کے فرمانے
سے مادھونل اور بیتال پچیسی سے جو برج بھاشا میں ہیں،
ان کا ترجمہ للولال کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ بشیتر برج
کی بولی بیتال پچیسی میں رہنے دی کہ مرضی صاحب مدرس
کی یوں ہی تھی۔ بعد اس کے ہفت گلشن کا ترجمہ کیا۔ جب
اس سے فراغت حاصل ہوئی، محسن زماں، حاتم دوراں،
فیض رسان شرفا مسٹر ھارنگٹن دام حشمتہ، کی نذر کے لئے
پند نامہ سعدی شیرازی کا ترجمہ زبان اردو میں شعر کا شعر
کیا۔ چنانچہ ہزار جلد اس کی چھاپی گئی۔ پانچ سو گلستان ھندی

کے ساتھ اور پانچ سو علیحدہ ـــــ بعد اس کے صاحب مدرس والا مناقب نے ازراہِ نوازش و الطاف مجوز ہو کر فرمایا کہ لطائف وظرائف کا ترجمہ بہ لطائف وظرائف کیا جائے۔ بہتر ہے کہ تو ہی اس کا ترجمہ کر کہ زبان اُردو میں تجھے خوب دخل ہے۔ اور یہ مرتبہ مہارت راقم نے بموجب ارشاد کے قبول کیا، اور اُسے انصرام کو پہنچایا۔ اس عرصے میں صاحب ممدوح (گل کرسٹ) کو ولایت جانے کا اتفاق ہوا اور کپتان جیمس مویت صاحب والا مناقب قائم مقام ان کے ہوئے۔ حقیر نے موافق حکم کے ترجمہ تاریخ شیر شاہی کا کیا۔ بعد اس کے صاحب عالی شان منبع لطف واحسان ڈاکٹر ولیم ھنٹر ثروتہ، کی ابتدائے ارشاد میں اقبال نامۂ جہانگیری کا ترجمہ شروع کیا۔ اور بارہ سو چوبیس ہجری مطابق سنہ اٹھارہ سو نو عیسوی میں نواب معلی القاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے عہد دولت میں اُس طرح تمام اتمام کو پہنچا کہ بالکل لفظاً باللفظ ترجمہ کیا۔ مگر بعضی جگہ رعایت محاورہ کے لئے اس کا مدعا لیا اور جہانگیر شاہی اس کا نام رکھا۔ اور اس کو کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کہ بالفعل مدرس مدرسۂ ھندی کے ہیں ان کی وساطت سے حضور والا میں گزرانا"۔ [۱]

---

[۱] ولا: تاریخ جہانگیر شاہی بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی صفحہ ۳۰۶۔

مظہر علی خاں ولاؔ کی تصانیف نثر میں (۱) ہفت گلشن (۲) مادھونل اور کام کندلا (۳) بیتال پچیسی (۴) تاریخ شیر شاہی اور (۵) جہانگیر نامہ مشہور ہیں۔ ہفت گلشن، ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ہے۔ مادھونل اور کام کندلا، موتی رام کبیشر کی برج بھاشا میں لکھی ہوئی کہانی کا اردو ترجمہ ہے۔ ولا نے اس کو ۱۸۰۲ء میں مکمل کیا۔ اس میں مادھونل اور کام کندلا کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی شائع نہیں ہوئی۔ اس کا بھی ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ہے۔ بیتال پچیسی بھی ترجمہ ہے۔ یہ سنسکرت زبان کی قدیم کتاب ہے جس کو محمد شاہ کے زمانے میں سورت کبیشر نے برج بھاشا میں لکھا تھا۔ ولاؔ نے اس کا اردو ترجمہ ۱۸۰۳ء میں کیا۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں جن کو ایک بھوت بیان کرتا ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے کلکتہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بار بار چھپی اور موجودہ دور میں ناگری رسم الخط میں اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ تاریخ شیر شاہی عباس خان بن شیخ علی شیروانی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب شیر شاہ سوری کے بارے میں ہے۔ اور اکبر اعظم کے حکم سے فارسی میں لکھی گئی تھی۔ ولا نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں کیا۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ جہانگیر نامہ فارسی کتاب تزک جہانگیری کے ایک حصے کا اُردو ترجمہ ہے۔

یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ نایاب ہے۔ راقم کو اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ملا ہے لیکن یہ ناقص ہے اور اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

ہفت گلشن اگرچہ مختصر سی کتاب ہے لیکن موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا موضوع اخلاق اور پند و نصائح ہے۔ اس کتاب میں پند و نصائح کے مختلف پہلوؤں کو مختصر کہانیوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کا نام گلشن رکھا گیا ہے۔ پہلے گلشن میں پچیس نصیحت آمیز لیکن دلچسپ حکایتیں ہیں۔ دوسرے گلشن میں صرف ایک طویل حکایت ہے جس کا موضوع زمانے کی تبدیلی ہے۔ تیسرے گلشن میں اختصار کے ساتھ گفتگو اور بات چیت کے آداب بتلائے گئے ہیں۔ چوتھا گلشن آداب مباحثہ اور پانچواں گلشن آداب نوکری کے بارے میں ہے۔ چھٹے گلشن میں حضرت علیؓ کے بعض اقوال پیش کئے گئے ہیں اور ساتواں گلشن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات طیبات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے موضوعات ایسے ہیں کہ ان سے انسان آج بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آج بھی یہ نئے معلوم ہوتے ہیں اور آج بھی ان میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ان موضوعات کو لکھنے والے نے کچھ ایسی صاف، سلیس، رواں، شگفتہ اور شاداب عبارت میں پیش کیا ہے جو قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے!

عبادت

شکنتلا

مہاکوی کالی داس کی تصنیف شکنتلا ناٹک اگرچہ پانچویں صدی عیسوی میں تخلیق ہوئی لیکن چودہ پندرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی اُس کی مقبولیت کا وہی عالم رہا جو خود کالی داس کے زمانے میں تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ مختلف ملکوں میں ہزاروں بار اس کو اسٹیج کیا گیا۔ دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے ہوئے۔ ان ترجموں کو نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا، اور بے شمار افراد ان ترجموں کے ذریعے اس لافانی ادبی تخلیق سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔ ایک ادبی

تخلیق کی حیثیت سے کالی داس کی شکنتلا کو جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے اور اُس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ دُنیا کی کم ادبی تخلیقات کو نصیب ہوئی ہوگی۔

اس شہرۂ آفاق ادبی تخلیق کو اُردو سے روشناس کرنے کا سہرا مرزا کاظم علی جوان کے سر ہے۔ اُنھوں نے اس کی کہانی کو ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں اُردو کا جامہ پہنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر ولیم جونس شکنتلا کا ترجمہ انگریزی کر چکے تھے، اور اُن کے ترجمے نے اُس وقت کی ادبی دُنیا میں ایک دھوم مچا دی تھی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ اس ترجمے سے بہت متاثر تھے۔ اُنہیں اُردو سے دِلی لگاؤ تھا۔ اس لئے اُن کی یہ خواہش تھی کہ ہر اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کو اس زبان میں مُنتقل کیا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے شکنتلا کی کہانی کو اُردو میں لکھنے کا کام اپنے کالج کے مشہور منشی مرزا کاظم علی جوان کے سپُرد کیا۔

مرزا کاظم علی جوان سنسکرت اور انگریزی دونوں زبانوں سے ناآشنا تھے، اس لئے ڈاکٹر گل کرسٹ نے کالج کے ایک اور منشی للّوجی لال کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس کام میں مرزا کاظم علی جوان کی مدد کریں۔ للّوجی لال سنسکرت اور بھاشا دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ اُنھوں نے اس کام میں کاظم علی جوان کا ہاتھ بٹایا اور اس طرح یہ کہانی اُردو میں منتقل ہوئی۔

للّوجی لال اس کہانی کو پڑھ کر سناتے تھے اور مرزا کاظم علی جوان اس کو اُردو میں لکھتے جاتے تھے۔ اُنھوں نے اصل سنسکرت ڈرامے کو اپنے سامنے نہیں رکھا بلکہ برج بھاشا میں لکھی ہوئی وہ کہانی اُن کے پیش نظر رہی جس کو فرخ سیر کے زمانے میں مولیٰ خاں کی فرمائش پر نواز کبشیر

نے برج بھاشا میں لکھا تھا۔ اس کی تفصیل خود مرزا کاظم علی جوان نے اپنے دیباچے میں بیان کی ہے۔

لکھتے ہیں :-

کرنیل اسکاٹ جو لکھنو کے بڑے صاحب ہیں اُنھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہٗ کے ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکارِ عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتہ کو روانہ کیا۔ اُنہیں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا۔ اور موافق حکم حضور خدمت میں مُدرس مدرسۂ ہندی کے، جو صاحب والا مناقب گِل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں، شرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن اُنھوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر ـــــ اور للّوجی لال کب کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھا کریں اگرچہ سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سُنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا۔ اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا ـــــ اِن دنوں میں کہ ۱۸۰۱ء ہیں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو از سرِ نو چھپوا دیں۔ نظر ثانی لازم ہے اور اُس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو۔ کہ اگر کہیں مطلب میں کمی بیشی ہوئی ہو، نہ رہے۔

چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔

یہ قصّہ فرخ سیر بادشاہ کی سلطنت میں، سنسکرت سے برج بھاکھا میں ترجمہ ہوا تھا — اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اور زبدۂ نوئینان، عظیم الشان، مشیر خاص بہ شاہِ کیواں بارگاہِ انگلستان، اشرف الاشراف مارکوئس وِل زلی، گورنر جنرل بہادر دام دولتہٗ کی حکومت میں ۱۸۰۱ء میں مطابق ۱۲۱۵ھ ہجری کے جناب جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم، کاظم علی جوان نے اِسے زبانِ ریختہ میں بیان کیا۔"

ڈاکٹر گِل کرسٹ نے اس کہانی کو کالج کے انگریز طالب علموں کے لئے لکھوایا تھا اس لئے ایک زمانے تک اس کو باقاعدگی کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہونا نصیب نہ ہوا۔ سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں اس کے کچھ حصے دیوناگری رسم الخط میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے "ہندی مینول" میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد یہ کہانی ۱۸۰۴ء میں رومن حروف میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۸۲۶ء میں ڈاکٹر گِل کرسٹ نے اس کو اپنے مخصوص مجوزہ رسم الخط میں لندن سے شائع کیا، اور اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا۔ ۱۸۳۰ء میں یہ کہانی HINDEE AND HINDOSTANEE SELECTIONS کے اُس مجموعے میں شامل کی گئی جو بنگال آرمی کے ترجمان کے لئے مُرتّب کیا گیا تھا، اور جس کی دو جلدیں کلکتے میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں۔ اس مجموعے میں یہ کہانی پہلی بار اُردو رسم الخط میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۶۵ء میں اس کا ایک اڈیشن نول کشور نے لکھنؤ سے بھی شائع کیا۔ لیکن اس کی اشاعت ہمیشہ محدود رہی اور موجودہ دور میں اس کا صرف نام باقی رہ گیا۔ یہ کبھی بھی عام نہ ہو سکی اور لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ ضائع ہو گئی۔

مجھے اس کہانی کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ملا۔
اس پر کاتب کا نام اور کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ یہ اُسی زمانے کا لکھا ہوا ہے جب یہ کہانی لکھی گئی تھی۔ میں نے اس
نسخے کو اپنے سامنے رکھا اور مختلف رسم الخط میں چھپے ہوئے نسخے بھی تلاش
کئے۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں مجھے بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس کے
وہ تمام نسخے مل گئے جن کی تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے۔ ان تمام نسخوں کا مقابلہ
کر کے میں نے اس کہانی کا متن تیار کیا۔ ان نسخوں میں جو اختلافات تھے اُن کی
صراحت حواشی کے تحت کر دی۔ اصل عبارت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ
آسانی کے خیال سے کہانی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا کتاب کی غلطیاں
درست کر دیں پیراگراف بنا دیئے، مکالموں کی وضاحت کر دی تاکہ پڑھنے
والوں کو کہانی، اُس کی ڈرامائی شان اور زبان و بیان سب کا لُطف آئے۔

شعبۂ اُردو و ثقافتِ پاکستان
اسکولِ آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۷ رجون ۱۹۶۳ء

عبادت

مرزا کاظم علی جوان دلّی کے رہنے والے تھے۔ وہ دلّی میں پیدا ہوئے اور اُن کی نشو و نما اسی سرزمین میں ہوئی۔ اُن کی ابتدائی زندگی کے حالات نہیں ملتے اور ان باتوں کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ دِلّی میں اُن کے خاندان کی کیا حیثیت تھی؟ وہ کب تک دِلّی میں رہے؟ اُنہوں نے کتنی تعلیم حاصل کی اور کن لوگوں سے استفادہ کیا؟ اُن کی دلچسپیاں کیا تھیں اور کون سے مشاغل میں اپنا وقت گذارتے تھے؟ بعض ذرائع سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شاعری سے دلچسپی تھی اور وہ اچھے خاصے شاعر تھے لیکن جہاں تک اُن کے حالات کا تعلق ہے، اُردو شعراء کے بیشتر تذکرے اس باب میں خاموش ہیں۔ صرف نواب علی ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیم میں، بینی نرائن جہاں نے دیوانِ جہاں میں، اور کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند میں ان کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے اور کچھ اشعار بھی درج

کتے ہیں ـــ لیکن ان میں بھی اُن کے حالات اور خصوصاً ابتدائی زندگی کے حالات کی تفصیل نہیں ہے۔

نواب علی ابراہیم خاں خلیل نے گلزارِ ابراہیم میں صرف اتنا لکھا ہے :-

جُوان تخلّص، دہلوی۔ ناشں کاظم علی۔ الحال کہ ۱۱۹۶ ہجری است در لکھنؤ می گذراند۔ در سنہ مذکور اشعار ایشاں از لکھنؤ بہ بنارس طلبیدہ تحریر پذیرفت از دست" [1]

تمنا ہے اُس کا درس دیکھنا مجھے اور میری ہوس دیکھنا

دیکھ کر صحن چمن میں تجھے خنداں گل صبح

رَشک سے کرتے ہیں چاک اپنا گریباں گُلِ صبح

ہے بناگوشِ بلوریں میں یہ آویزہ لعل

باغِ رنگ ہوئے آج نمایاں گُلِ صبح

سمندِ ناز کی ٹک تم عنان رکھ لیجو جلو میں اپنے مجھے مہربان رکھ لیجو

خدا کے واسطے بھولے سے لب پہ تیرے کبھی

جو آوے نام مراتب زبان رکھ لیجو

خفا جو ہوتے ہو افسانہ غم کا سُن میرے

تو اچھا مجھ سے کوئی قصہ خوان رکھ لیجو

تیرے منہ سے ہر کوئی دیتا ہے پیارے او مجھے منہ لگاتا ہی نہیں افسوس لیکن تو مجھے" [1]

---

[1] گلزارِ ابراہیم قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن

اور بینی نرائن جہاں نے 'دیوانِ جہاں' میں صرف یہ لکھا ہے :-

انھوں نے لکھنؤ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شاعری کرتے تھے اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی شہرت اچھی خاصی تھی یہاں تک کہ تذکرہ لکھتے وقت علی ابراہیم خاں خلیل کے ایسے لوگ ان کے اشعار اُس میں شامل کرنے کی غرض سے طلب کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلّی کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی طرح سیاسی حالات کے انتشار نے انہیں دلّی چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ لکھنؤ آکر آباد ہو گئے۔ یہ اٹھارویں صدی کا آخری زمانہ ہوگا۔ اس وقت میر، سودا، انشا، مصحفی، جرأت سب لکھنؤ میں موجود تھے۔ اس لئے مشاعروں کا چرچا ہوگا، کاظم علی جوان بھی مشاعروں میں شرکت کرتے ہوں گے، اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی شہرت ہوگی۔ اس کی تصدیق خود اُن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ شکنتلا کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں انھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہٗ کے ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتہ کو روانہ کیا۔ انھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا۔"[۱]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے وہ اتنے مشہور تھے کہ کرنل اسکاٹ نے جب لکھنؤ کے کچھ شاعروں کو مُلازمت کی غرض سے کلکتہ بھیجا تو ان میں کاظم علی جوان بھی شامل تھے۔

---

[۱] کاظم علی جوان : دیباچہ شکنتلا (نولکشور)

اس سے زیادہ اُن کی لکھنؤ کی زندگی کے بارے میں کوئی تفصیل
نہیں ملتی۔

غرض کرنل اسکاٹ کی سفارش پر انہیں فورٹ ولیم کالج میں ملازم رکھ لیا
گیا۔ وہ ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ پہنچے اور اپنی بقیہ زندگی اسی شہر میں گزاری۔
یہیں انہوں نے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی نگرانی میں اپنے علمی و ادبی کام کا سلسلہ
شروع کیا جس کی وجہ سے ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔

اس زمانے میں کلکتہ نے ایک علمی و ادبی مرکز کی حیثیت بھی اختیار کرلی تھی۔
فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے یہاں بھی علم و ادب کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔
اُس وقت کے بہت سے لکھنے والے یہاں جمع تھے۔ میر امن، میر شیر علی افسوس،
میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، مظہر علی خاں ولا، مرزا جان طپش،
مرزا علی لطف، مولوی امانت اللہ، مولوی اکرام علی، حفیظ الدین احمد، بینی نرائن
جہاں، للوجی لال اور نہال چند لاہوری وغیرہ کے جمع ہوجانے سے یہاں خاصا
علمی و ادبی ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے ان سب کو جمع کیا تھا، وہ
خود بھی علمی و ادبی کاموں میں مصروف تھے اور ان لوگوں سے بھی علمی و ادبی کام
لے رہے تھے۔ ان سب کی وجہ سے کم و بیش دلّی اور لکھنؤ کی سی ادبی فضا یہاں
بھی قائم ہوگئی تھی۔ مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ خود فورٹ ولیم کالج کی طرف سے
ہر سال جولائی کے مہینے میں ایک مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے میں
دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کاظم علی جوان بھی شریک ہوتے اور اپنا
کلام سناتے تھے۔ بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاظم علی جوان کو
شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بنیادی طور پر ایک شاعر ہی سمجھتے
تھے۔ یہی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اُن کے دو بیٹے مرزا قاسم علی ممتاز اور مرزا ہاشم علی

عیاں بھی شاعر تھے اور ان باپ بیٹوں نے بعض شاعروں کے ساتھ مل کر کلکتہ میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ مشاعرے ترتیب دیتے اور ان میں اپنا کلام سنا کر داد وصول کرتے تھے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے بھی جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے اُنہیں شاعر کاظم علی جوان لکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری اُن کے لئے بقائے دوام کی منزل سے ہم کنار ہونے کا ذریعہ اور وسیلہ نہ بن سکی۔

مرزا کاظم علی جوان نے تصنیف و تالیف کا کام کلکتہ ہی میں شروع کیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے سب سے پہلے مہاکوی کالی داس کے ناٹک شکنتلا کی کہانی کو اُردو میں لکھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ :-

"کلکتہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن اُنہوں نے (ڈاکٹر گل کرسٹ) نے نہایت مہربانی والطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر اور للوجی لال کبؔ کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھایا کرے۔ اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا۔"

ڈاکٹر گل کرسٹ کو ہندوستانی ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اُردو زبان کے بھی شیدائی تھے اس لئے ان کی یہ خواہش تھی کہ اعلیٰ ادب کی تمام ادبی تخلیقات کو اس زبان میں منتقل ہونا چاہیئے اسی خیال سے اُنہوں نے شکنتلا کی کہانی کو اُردو میں لکھنے کا کام کاظم علی جوان کے سپرد کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان سے ایک طویل نظم "بارہ ماسہ" بھی لکھوائی۔ یہ نظم مثنوی کی شکل میں ہے اور اس میں ہندوستان کے موسموں اور ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا سبب خود کاظم علی جوان نے

اس طرح بیان کیا ہے ؎

سبب تالیف کا کہتا ہوں میں اب لگا کر دل سنو اس کے تئیں سب
کتابیں کر چکا تالیف جب دو کہا اس صاحب والا نے مجھ کو
کہ جس کے تابع فرمان ہوں میں رہینِ شکر اور احسان ہوں میں
بہ تصیح کتب دل کو لگا کر حضوری میں مری حاضر رہا کر
بجا لایا میں اُن کا حکم تھا جو کہا پھر بعد ایک مُدّت کے مجھ کو
کہ یاں حاضر بھی رہ اور فکر کر کچھ نوازش ہم کو ہے مدِّ نظر کچھ
چنانچہ تھا یہی ارشاد ان کا کہ منظوم اایک لکھ تو بارہ ماسا
کیا میں نے قبول ان کا یہ ارشاد وہیں سے اس کی ڈالی پہلے بنیاد
سُناتے بعد چندے کتنے اشعار پسند اُن کے ہوئے اور کی یہ گفتار
اجازت تجھ کو یہ دیتے ہیں اب ہم بہ خاطر جمع کر مضمون فراہم
تو اپنے بیٹھ کر گھر میں اتمام سُپرد اب ہم نے یہ تیرے کیا کام
دے چھوٹے نہ اس میں کوئی تہوار موافق بہر و مہ کے کیجیو اظہار
اور اس میں رسمیں جو گبر و مسلماں بجا لاتے ہیں لکھیو اس کے عنواں
بروج اور کوکب اور ہر رُت کا احوال لکھا میں نے بہ تفصیل و بہ اجمال
رکھے اہل فراست بات یہ یاد کرے اس پر نہ کوئی تا کہ ایزاد
زبس دستور ہند اس میں لکھا ہے
یہی اب نام بھی میں نے رکھا ہے

یہ مثنوی ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۱۲ء میں اس کو کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ اس نظم میں کاظم علی جوان نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو شروع کرنے سے قبل وہ دو کتابیں تالیف کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک تو شکنتلا ہے لیکن

دوسری کتاب کا صحیح علم نہیں۔ ہوسکتا ہے یہ تاریخ فرشتہ کا وہ ترجمہ ہو جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ۱۸۰۹ء میں اُنہوں نے تاریخ فرشتہ کے اس حصّے کا ترجمہ کیا تھا جو دکن کے سلاطین بہمنیہ کے متعلق ہے۔ اُن کا یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان تصانیف کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے دوران قیام میں کاظم علی جوان نے میرزا سودا اور میر کے کلام کا انتخاب بھی کیا جو کالج کی طرف سے شائع کیا گیا اور بعض مُصنفین کی تصانیف پر نظرثانی بھی کی۔

مرزا کاظم علی جوان ایک زمانے تک کلکتے ہی میں رہے۔ ۱۸۱۵ء تک وہ فورٹ ولیم کالج میں موجود تھے۔ اسی سال اُنہوں نے حفیظ الدین کی تالیف خرد افروز پر نظرثانی کی تھی۔ بینی نرائن جہاں نے اپنا تذکرہ دیوان جہاں ۱۸۱۴ء میں مکمل کیا ہے۔ اس تذکرے میں اُنہوں نے یہ لکھا ہے کہ کاظم علی جوان کلکتہ میں موجود ہیں۔ اس کے بعد ان کے حالات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کب تک فورٹ ولیم کالج میں رہے اور کس سنہ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۲)

کاظم علی جوان کی سب سے اہم تالیف شکنتلا ہے۔ اُن کی یہ کہانی اگرچہ کالی داس کے ڈرامے شکنتلا ناٹک سے ماخوذ ہے لیکن اُنہوں نے اس کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس میں مجموعی طور پر تخلیقی رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی یہ کہانی اتنی پرانی ہونے کے باوجود نئی معلوم ہوتی ہے، اور اس میں شروع سے آخر تک جذب و

کشش کا احساس ہوتا ہے۔

شکنتلا کی یہ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے اگلے زمانے میں وشوامتر نامی ایک شخص تھا جس کی عبادت اور ریاضت مشہور تھی۔ اُس نے دُنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ جنگلوں میں رہتا تھا۔ کھانے پینے تک سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ بس عبادت اور ریاضت ہی اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس مشغلے میں وہ کچھ اس طرح گم رہتا کہ اُسے خبر ہی نہ ہوتی کہ اُس کے آس پاس دُنیا میں کیا ہو رہا ہے راحت اور آرام کے دروازے اُس نے اپنے اوپر بند کر لئے تھے۔ ہر وقت تپسیا کرتا اور اپنے آپ کو تکلیف پہنچاتا۔ شہروں شہروں اور جنگلوں جنگلوں مارا مارا پھرتا۔ گرمیوں میں اپنے آس پاس آگ جلا کر بیٹھتا۔ جاڑوں میں ٹھنڈے پانی کے اندر کھڑا رہتا۔ زندگی کے چونسٹھ سال اُس نے اسی طرح گزار دیئے۔

راجہ اندر نے جب وشوامتر کا یہ حال دیکھا تو اس کو بہت تکلیف ہوئی اور سوچا کہ کسی طرح اُس کے اس جوگ کو ختم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مینکا پری کو بُلایا اور یہ خدمت اُس کے سپرد کی۔ مینکا تیار ہو گئی۔ وہ خوبصورت اور جوان تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے حُسن سے اس کا دل لُبھائے گی اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنی ساری ریاضت اور عبادت بھول جائے گا۔ چنانچہ وہ سج بن کر اُس کے پاس گئی اور چشم زدن میں اُس پر ایسا جادو کیا کہ وہ اس پر ہزار جان سے فدا ہو گیا۔ عبادت و ریاضت خواب و خیال ہو گئی۔ مینکا کی پرستش ہی کو اُس نے عبادت سمجھ لیا۔ وہ اُس کے ساتھ رہنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بن میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں، لوگ باتیں بنانے لگے۔ خاصی بدنامی

ہوئی۔ اس لئے وہ اس بن کو چھوڑ کر کسی اور بن کو چلا گیا۔

اُس کے جانے کے کچھ عرصے کے بعد مینکا کے ہاں ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی پیدا ہوئی۔ بدنامی کے ڈر سے اُس نے اِس لڑکی کو جنگل میں چھوڑ دیا اور خود کسی طرف کو نکل گئی۔ اس جنگل میں اس لڑکی کا کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ اتفاق سے کن منی اس طرف آنکلے۔ انہوں نے اس لڑکی کو اس عالم میں دیکھا تو اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اس کی دیکھ بھال اپنی بہن گوتمی کے سپرد کی اور اُس نے بھی خوشی خوشی اس کو پالنا پوسنا شروع کیا۔ کن منی نے اُس کا نام شکنتلا رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئی۔

شکنتلا بچپن ہی سے بلا کی خوبصورت تھی۔ وقت کے ساتھ اور بھی خوبصورت ہو گئی جنگل کے تمام لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ جانور تک اُس پر جان دیتے تھے۔ اُس کے ساتھ اس جنگل میں دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک کا نام تھا انسویا اور دوسری کا پریم دوا۔ ان دونوں کو بھی شکنتلا سے دلی محبت تھی۔ وہ انہیں دونوں کی صحبت میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اس کی یہ دونوں سہیلیاں بھی بہت خوبصورت تھیں لیکن ان میں شکنتلا تو بقول شخصے چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔

شکنتلا کا حسن اپنے شباب پر تھا، جب کن منی نے تیرتھ پر جانے کا ارادہ کیا۔ اور وہ اُس کو گوتمی کے سپرد کر کے تیرتھ پر روانہ ہوئے۔

کن منی کے رخصت ہونے کے بعد ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ راجہ دشمنت شکار کھیلتا ہوا۔ اُس جنگل کی طرف آنکلا جہاں شکنتلا اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں اپنی جوانی کے دن گذارتی تھی۔ راجہ نے کن منی سے ملنے کی خواہش کی۔ اور ان کے استھان تک پہنچے۔ کن منی تو وہاں موجود نہیں تھے۔ دریافت کرنے

سے یہ معلوم ہوا کہ وہ تیرتھ کو گئے ہیں انہوں نے ایک لڑکی کو بیٹی کی طرح پالا ہے وہ موجود ہے۔

شکنتلا اُس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ کام میں مصروف تھی۔ راجہ کی نظر اُس پر پڑی۔ دیکھتے ہی اُس کے تیر نظر سے گھائل ہو گیا۔ شکار کو بھولا اور خود شکار ہونے کی نوبت آگئی۔

جب شکنتلا کو اس کا علم ہوا تو بہت شرمائی۔ کسی نہ کسی طرح راجہ نے مُلاقات کی صورت نکالی۔ مُلاقات ہوئی۔ اس مُلاقات نے دونوں کی آتشِ شوق کو بھڑکایا راجہ نے گندھرب بواہ کی ٹھانی۔ شکنتلا کو اس پر تیار ہونا پڑا۔ راجہ نے یادگار کے طور پر اس کو ایک انگوٹھی دی اور واپس آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔

دن گزرتے گئے لیکن ایک زمانے تک راجہ نے شکنتلا کی کوئی خبر نہیں لی۔ ادھر شکنتلا کو یہ معلوم ہوا کہ وہ پیٹ سے ہے۔ بہت پریشان ہوئی۔ راجہ کا انتظار کرتی رہی لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اس پر ایک دوسری بلا نازل ہوئی کہ ایک رِکھ نے اُس کو یہ بددُعا دی کہ وہ آتشِ عشق سے جلتی رہے گی اور جس کے دھیان میں وہ بیٹھی ہے وہ اُس کو بھول جائے گا۔ صرف انگوٹھی کو دیکھ کر اسے یاد آسکے گی۔

اس عرصے میں کنی منی تیرتھ سے واپس آئے۔ انہیں یہ سارا احوال معلوم ہوا بجائے ناراض ہونے کے وہ خوش ہوتے۔ اور اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شکنتلا کو راجہ دشمنت کے پاس بھیج دیں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے دو چیلوں کو شکنتلا کے ساتھ کیا اور وہ اپنے پتیم راجہ دشمنت سے ملنے کی غرض سے سفر پر روانہ ہوئی۔

راستے میں ایک جگہ اتفاق ایسا ہوا کہ پانی پینے کے لئے ندی پر جھکی تو وہ انگوٹھی جو راجہ دشمنت نے دی تھی اُسی ندی میں گر گئی۔ شکنتلا کو اُس کا خیال نہ رہا۔

جب شکنتلا دور دراز سفر کی طویل منزلیں طے کر کے راجہ کے یہاں پہنچی تو وہ اُس کو بھول چکا تھا۔ اُس نے اسے پہچانا تک نہیں۔

چیلوں نے بہت کہا سنا اور مِنّت خوشامد کی۔ شکنتلا بہت روئی لیکن وہ اس کو محل میں داخل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ناچار یہ لوگ وہاں سے مایوس واپس ہوتے۔

راستے میں ایک شعلہ سا نمودار ہوا اور شکنتلا سے لپٹ کر اُس کو آسمان کی طرف لے گیا۔ وہ شعلہ دراصل اس کی ماں مینکا تھی۔ ایک زمانے تک کسی کو کچھ علم نہ ہوا کہ وہ کہاں گئی۔

ادھر یہ ہوا کہ جو انگوٹھی شکنتلا سے ندی میں گر گئی تھی، وہ کسی شخص کو ملی۔ وہ بازار میں اس کو بیچنے کے لئے لے گیا، اور پکڑا گیا۔ کوتوال نے اُس کو راجہ کے سامنے پیش کیا۔

جب راجہ نے انگوٹھی دیکھی تب اُس کو شکنتلا کی یاد آئی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ناچار دیوانوں کی طرح اس کی تلاش میں نکلا جنگل جنگل مارا مارا پھرا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

شکنتلا تو اس وقت تک کن منی کے استھان پر پہنچ چکی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس کے یہاں ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ وہ پل کر بڑا ہوا۔ اُس لڑکے کا نام بھرت رکھا گیا منی نے اُس کے گلے میں ایک گنڈا ڈالا جس کا مطلب یہ تھا کہ سوائے ماں باپ کے اگر کوئی اس کو چھوئے گا تو اس کو سانپ ڈس

لے گا۔

اور مینکا ایک روز راجہ اندر کے پاس پہنچی اور اس سے یہ کہا کہ وہ راجہ دشمنت کو بلا کر شکنتلا سے ملا دے۔ راجہ اندر نے اُس کو بلانے کے لئے مائل رتھ بان کو بھیجا۔ اور وہ اُس کے ساتھ وہاں آنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جب ہیم کوٹ پہنچا تو دیکھا کہ ایک لڑکا شیر کے بچّے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ یہ اسی کا لڑکا تھا۔ اُس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شکنتلا کا لڑکا ہے ۔۔ دوڑ کر اس کو گلے سے لگایا اور پیار کیا۔

شکنتلا کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی دوڑی دوڑی آئی۔ راجہ نے اُس کے سامنے شرمندگی کا اظہار کیا۔ وہ رونے لگی۔ کن منی بھی آ گئے۔ انہوں نے دونوں کو آشیرباد دی اس عرصے میں راجہ اندر کا ایک وکیل آیا اور دشمنت سے کہا کہ جس مقصد سے راجہ اندر نے اس کو بُلایا تھا، وہ پورا ہوا۔ اب اُن کے وہاں پہنچنے کی ضرورت نہیں، انہیں اپنے گھر واپس جانا چاہیئے۔

چنانچہ راجہ دشمنت، شکنتلا اور بھرت کو ساتھ لے کر اپنی راج دھانی کو روانہ ہوا اور شکنتلا کو رانی بنا کر راج کرنے لگا۔

(۳)

یہ کہانی کم و بیش وہی کہانی ہے جس کو کالی داس نے اپنے ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کالی داس کے یہاں بعض مناظر ایسے بھی موجود ہیں۔ جو اس کہانی میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ان مناظر کی نظم و ترتیب بھی مختلف ہے اور نظم و ترتیب کا یہ اختلاف مجموعی طور پر ڈرامے اور کہانی کی فضا میں بھی تھوڑی سی تبدیلی

پیدا کر دیتا ہے۔

کالی داس کے ڈرامے کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے اور اس کے مختلف مناظر کچھ اس قسم کی ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

راجہ دشینت رتھ میں سوار تیر کمان ہاتھ میں لئے ہوئے جنگل میں ایک ہرن کا پیچھا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ رتھ بان اور راجہ اس شکار کے موضوع پر آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک سادھو نمودار ہوتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ یہ آشرم کا ہرن ہے۔ اس کو نہ ماریئے۔ چنانچہ راجہ اس سے باز رہتا ہے۔ سادھو اُس کو یہ دُعا دیتا ہے کہ وہ ایسے بیٹے کا باپ ہو۔ جو راجاؤں کا راجہ ہو۔ راجہ کو اس دعا سے بہت خوشی ہوتی ہے۔

سادھو راجہ کو مہمان بنا کر کنو رشی کے آشرم میں لے جاتا ہے۔ یہاں راجہ کی نظر شکنتلا پر پڑتی ہے جو اپنی سہیلیوں انسویا اور پریم ودا کے ساتھ درختوں کو پانی دے رہی ہے۔ وہ آپس میں چہلیں کرتی ہیں اور کام کے ساتھ ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

شکنتلا کو اس عالم میں دیکھ کر راجہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ اُس کے حُسن سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنی سُدھ بُدھ کھو دیتا ہے۔ اُس کی موہنی مورت اُس کے دل میں کھُب جاتی ہے اور اس کی دُنیا میں ایک ہل چل سی مچا دیتی ہے۔ شکنتلا پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔

وہ تینوں ایک مہمان کی طرح راجہ کا استقبال کرتی ہیں اور آپس میں صلاح مشورہ کر کے اُس کے پاس بیٹھ جاتی ہیں اور باتیں شروع کر دیتی ہیں۔ راجہ اُن تینوں کی تعریف کرتا ہے اور وہ راجہ کی تعریف میں رطب اللساں ہو جاتی ہیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی ہے۔ غرض خاصی دیر تک

یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انہیں لمحاتِ حسین میں راجہ کے دل میں شکنتلا کی محبت اور شکنتلا کے دل میں راجہ کی محبت کے چراغ فروزاں ہو جاتے ہیں۔

راجہ اس بن کے قریب ہی اپنا ڈیرہ ڈال لیتا ہے۔ اس موقع پر ایک مسخرا مادھو نمودار ہوتا ہے جو دلچسپ لیکن مضحکہ خیز باتیں کرتا ہے۔ اُس کی یہ باتیں خود راجہ، سپہ سالار اور چوبداروں سے ہوتی ہیں۔ یہاں راجہ دورانِ گفتگو میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ شکنتلا کی محبت کا تیر اُس کے دل میں پیوست ہو چکا ہے لیکن ڈرتا بھی ہے کہ کہیں کسی کو اس کا علم نہ ہو جائے۔

اس کے بعد کالی داس نے بن کی تصویر کھینچی ہے جہاں سب سے پہلے ایک چیلا راجہ دشینت کی عظمت کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر پریم دوا دکھائی دیتی ہے جو شکنتلا کے لئے صندل کا لیپ اور کنول کی پتیاں لئے جا رہی ہے۔ پھر راجہ دکھائی دیتا ہے جس کی حالت عشق کے مارے ہوؤں کی سی ہے۔ وہ شکنتلا کے دیدار کا مُشتاق ہے اور اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں شکنتلا اپنی سہیلیوں سے گفتگو کر رہی ہے۔ راجہ بھی اس گفتگو میں شریک ہو جاتا ہے۔ شکنتلا شرماتی اور لجاتی ہے لیکن باتیں کرتی رہتی ہے۔ اور ان دونوں کی باتوں سے محبت کی باس پھوٹی پڑتی ہے۔

شکنتلا کی سہیلیاں انسویا اور پریم ودا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں اور آپس میں اس موضوع پر باتیں کرتی رہتی ہیں۔ انہیں اگرچہ اس بات کی خوشی ہے کہ شکنتلا کو ایک پریم کرنے والا مل گیا لیکن اس بات کا غم بھی کہ وہ اب اُن سے بچھڑ جائے گی اور اس کے بغیر اُن کا وقت تکلیف اور پریشانی میں

کٹے گا۔ اتنے میں کنو واپس آجاتے ہیں اور وہ بھی اس خبر کو سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ شکنتلا کو سسرال بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

بالآخر شکنتلا گوتمی اور دوسرے چند لوگوں کے ساتھ اپنی سسرال روانہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ راج محل میں پہنچتے ہیں۔ بڑی مُشکل سے راجہ کے حضور میں باریابی ہوتی ہے۔ لیکن راجہ شکنتلا کو پہچاننے اور اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے کہ کبھی اُس کے ساتھ اُس کا بیاہ ہوا تھا۔ شکنتلا مِنّت سماجت کرتی ہے لیکن راجہ نہیں مانتا تب وہ کہتی ہے کہ اُس کے پاس بطور نشانی کے راجہ کی دی ہوئی انگوٹھی موجود ہے راجہ اس کو دیکھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شکنتلا انگوٹھی کو نکالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اسے انگوٹھی نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ کہیں گر چکی ہے، گوتمی اس کو بتاتی ہے کہ جس وقت وہ راستے میں گنگا جی کے تٹ پر کھڑی تھی، ہو سکتا ہے اُس وقت وہ انگوٹھی وہاں گر گئی ہو۔

غرض راجہ کسی طرح نہیں مانتا۔ شکنتلا اور گوتمی سے اُس کی خاصی تیز گفتگو ہوتی ہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ ناکام وہاں سے واپس ہوتے ہیں۔ اُن کے جانے کے بعد راجہ کہتا ہے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس لڑکی نے کبھی میرا دل لُبھایا تھا لیکن میرا دل یہ ضرور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتی ہے وہ سچ ہے۔

یہ لوگ تو چلے جاتے ہیں۔ اُدھر شہر کی ایک گلی میں ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جس کو وہ انگوٹھی ملی ہے جو شکنتلا سے دریا پر گر پڑی تھی۔ کوتوال اس کو پکڑتا ہے۔ راجہ کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو اُس کو شکنتلا کے ساتھ اپنے بیاہ کا خیال آتا ہے۔ یہ سب کچھ یاد کر کے اُس کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔

صلاح و مشورہ کرتا ہے اور بالآخر ماتلی کے ساتھ رتھ میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتا ہے۔

دشینیت اور ماتلی دونوں رتھ میں بیٹھے ہوئے کبھی آکاش پر اڑتے کبھی زمین پر اُترتے ہیں۔ آپس میں باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دونوں اندر کی تعریف کرتے ہیں۔ چلتے چلتے ہیم کوٹ سے ان کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں کشب رشی تپسیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں اترتے ہیں اور آشرم کی طرف چلتے ہیں کہ راستے میں اُنہیں ایک لڑکا شیر کے ساتھ کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راجہ اُس لڑکے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اُس کا دل اُس کی طرف کھنچتا ہے۔ راجہ اُس لڑکے کے پاس جاتا ہے۔ شکنتلا بھی وہاں آجاتی ہے۔ راجہ کی آنکھوں کے سامنے سے بھول کا پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ شکنتلا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں لیکن یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ کشب منی آجاتے ہیں۔ وہ سب کو اشیرباد دیتے ہیں اور یہ لوگ خوشی خوشی وہاں سے رُخصت ہو جاتے ہیں۔

(۴)

کالی داس کی یہ کہانی نئی اور تمام تر طبع زاد نہیں ہے۔ اس نے اس کا مواد مہابھارت کی ایک ضمنی کہانی سے حاصل کیا ہے۔ البتہ اس کہانی میں اُس نے تھوڑا سا ردّ و بدل اور ترمیم و اضافہ کر کے کچھ نئی ترتیب کے ساتھ اس کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ اچھوتی اور طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔

مہابھارت کی اس کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ایک زمانے کا ذکر ہے کہ ایک راجہ بڑی فوج کے ساتھ ایک گھنے

جنگل میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی اس فوج کے ساتھ بہت سے جنگلی جانوروں کا شکار کیا، اور ایک ہرن کا پیچھا کرتا ہوا، ایک اور جنگل میں جا پہنچا۔ یہاں اُس نے دیکھا کہ ایک ندی کے کنارے سادھوؤں کی ایک خوبصورت سی بستی ہے۔ اس بستی میں کنوا رہتے تھے۔ راجہ نے ان کے درشن کرنے کی کوشش کی لیکن قریب جا کر دیکھا تو یہ بزرگ وہاں موجود نہیں تھے اور وہ بستی دور دور تک ویران نظر آتی تھی۔

راجہ کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا اور وہ اس صدمے کی وجہ سے اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اُس کی آواز سُن کر ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی نکل کر سامنے آئی۔ راجہ نے اُس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کنوا سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ لیکن جلد ہی واپس آجائیں گے۔ اگر وہ کچھ دیر انتظار کرے تو مُلاقات ہو سکتی ہے۔

اس لڑکی نے ایک ہی نظر میں راجہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ اس لڑکی نے بتایا کہ وہ کنوا کی بیٹی ہے۔ اُسی نے اُس کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔

راجہ پر اُس کے حُسن و جمال کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ فوراً ہی نہ صرف اُس نے اظہارِ عشق کر دیا بلکہ یہ خواہش بھی ظاہر کر دی ہے کہ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

یہ لڑکی شادی کرنے کے لئے اس شرط پر تیار ہو گئی کہ جو لڑکا پیدا ہو گا وہ اُس کے تاج و تخت کا وارث سمجھا جائے گا۔

راجہ اس کے لئے تیار ہو گیا اور اس لڑکی سے شادی کر لی اور اُس کے ساتھ رہنے لگا۔

پھر وہ کنوا کی تلاش میں نکلا۔ جیسے ہی وہ گیا کنوا اپنے اس استھان پر واپس پہنچے۔ اس لڑکی نے اُس کو ساری روداد سُنائی۔ اُنہوں نے اُس کو یہ کہہ کر آشیرباد دی کہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ اُس سے بیاہ کرے۔

کچھ عرصے بعد اس لڑکی کے یہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا جو وقت کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت اور بہادر نوجوان بن گیا۔ یہ لڑکا شیروں کے ساتھ کھیلتا تھا اور یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

کنوا نے یہ سوچ کر کہ اس لڑکے کو ولی عہد ہونا چاہیئے۔ اُس کو اور اُس کی ماں کو راجہ کے پاس بھیجا۔ لیکن راجہ نے اُن کو پہچاننے سے انکار کر دیا، اور اُن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔

یہ سُن کر تو لڑکی کے حواس جاتے رہے۔ تکلیف بھی ہوئی غصہ بھی آیا۔ اُس نے راجہ کو بُرا بھلا بھی کہا اور وہاں سے جانے کی تیاری کی۔ اتنے میں غیب سے یہ آواز آئی کہ "راجہ! یہ تیرا ہی بیٹا ہے"۔

راجہ نے یہ سُن کر اُس لڑکے کو اپنے پاس بُلایا گلے سے لگایا، پیار کیا۔ اُس کا نام بھرت رکھا اور وہ دونوں ماں بیٹے خوشی خوشی راجہ کے ساتھ رہنے لگے۔

کالی داس نے اسی کہانی کو اپنے ڈرامے کی بُنیاد بنایا لیکن اُس میں، جیسا کہ اُس کی کہانی سے ظاہر ہے، بعض اضافے بھی کئے ہیں، اور اس کو بالکل ہی ایک نئی شکل دے دی ہے۔

(۵)

کاظم علی جوان نے کالی داس کی اسی کہانی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن ترتیب

بدل دی ہے۔ اور اُن کی نئی ترتیب اور تھوڑے سے اضافے اور ترمیم نے کہانی میں جمالیاتی اعتبار سے کچھ اور بھی لُطف پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً اُن کی کہانی وشوامتر کی تپسّیا کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ راجہ اندر کو یہ بات پسند نہیں اس لئے وہ مینکا پری کو بُلاتے ہیں اور اس کے سُپرد یہ کام کرتے ہیں کہ وہ شوامتر کو دُنیا سے دلچسپی لینے کا اہم کام انجام دے۔ وہ تیار ہو جاتی ہے، اور اُس کو اپنے حُسن سے اس طرح رِجھاتی ہے کہ وشوامتر کا سارا جوگ ہوا ہو جاتا ہے۔ شکنتلا اُسی کی بیٹی ہے جس کو وہ بدنامی کے ڈر سے جنگل میں چھوڑ کر کسی طرف کو نکل جاتی ہے۔ اتفاق سے کنو منی اُس کو اُٹھا لے جاتے ہیں اور اپنے آشرم میں رکھتے ہیں۔ اُن کی بہن گوتمی اُس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر راجہ آتا ہے۔ اُس سے محبت کر کے بیاہ کرتا ہے۔ اس کو انگوٹھی دے کر واپس جاتا ہے۔ کنو منی تیرتھ سے واپس آکر شکنتلا کو راجہ کے پاس بھیجتے ہیں۔ راستے میں شکنتلا سے انگوٹھی گُم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو پہچانتا نہیں لیکن جب انگوٹھی مل جاتی ہے تو پہچان لیتا ہے اور وہ اطمینان سے رہنے لگتے ہیں۔

کہانی کی اس ترتیب میں نسبتاً زیادہ ہم آہنگی ہے کیونکہ اس کے مختلف واقعات میں ایک منطقی تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔

کاظم علی جوان نے ان واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر یہ کہانی بنائی ہے لیکن ان کی ترتیب میں ہر جگہ ڈرامائی شان کو باقی رکھا ہے اور یہ ڈرامائی شان مکالمہ نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے حسین اور مُتوازن امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی اہم ہے۔ مجموعی طور

پر اس کا اسلوب کہانی کی عام فضا سے مُناسبت رکھتا ہے لیکن اس میں کسی تصنّع اور تکلّف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایک فطری روانی نظر آتی ہے۔ یہ روانی ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اسی خوبی نے اس کو اُردو نثر کی روایت میں ایک نمایاں مقام دیا ہے۔

۷ر جون ۱۹۶۳ء

عبادت

(۱۱)

شاعری اور شاعری کی تنقید

ارسطو کے زمانے سے لے کر اس وقت تک شاعری اور شاعری کی تنقید کے معاملات و مسائل نہ صرف شاعروں، ادبی تنقید نگاروں، فلسفیوں اور جمالیات کے ماہروں بلکہ عام پڑھنے والوں کی بھی دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے انسانی زندگی کے ہر دور میں ان کی ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اپنی اپنی تہذیبی روایت میں ان کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اسی کوشش نے شاعری کی نظریاتی اور عملی تنقید کے چراغ روشن کئے ہیں۔

یہ کتاب "شاعری اور شاعری کی تنقید" بھی اسی قبیل کی ایک نہایت حقیر سی کوشش ہے اس میں سب سے پہلے شاعری اور شاعری کی تنقید کے

اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر اُن کی روشنی میں ولی سے لے کر اس وقت تک کے تقریباً تمام اہم اُردو شاعروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کا لکھنے والا شاعر، ادیب، تنقید نگار، فلسفی اور ماہر جمالیات ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اُس کی حیثیت تو محض ایک عام پڑھنے والے کی ہے اور اس نے ایک عام پڑھنے والے ہی کی طرح ان موضوعات کو دیکھنے، اُن کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور اُن کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

اگر اس کتاب میں شاعری کی نظریاتی اور عملی تنقید کے بعض پہلو اپنی جھلک دکھاتے ہیں تو اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کا لکھنے والا گذشتہ کئی سال سے ایک عام پڑھنے والے کی طرح اپنی تہذیبی روایت کے پس منظر میں اُردو شاعری کا مطالعہ کرتا رہا ہے، اور اس مطالعے نے اس پر نہ صرف شاعری کی حقیقت اور انسانی زندگی میں اُس کی اہمیت واضح کی ہے بلکہ اُس کے دل میں شاعری کی تہذیبی عظمت کا احساس بھی بیدار کیا ہے۔

عبادت

شعبۂ اُردو و ثقافت پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۷، نومبر ۱۹۶۳ء

۱۲

مُقدّماتِ عبدالحق

مُقدماتِ عبدالحق عرصہ ہوا میرزا محمدؐ بیگ صاحب نے مرتب کر کے
دو جلدوں میں حیدرآباد سے شائع کئے تھے۔ اشاعت کے بعد ان مقدمات
کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُنھیں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بہت
تھوڑے عرصے میں ان کا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا۔ ایک زمانے تک یہ نایاب
رہے۔ اس لئے آج سے چند سال قبل میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی
کہ اِن مقدمات کو اُن کی اہمیت اور مقبولیت کے پیشِ نظر از سرِ نو ترمیم، تصیح

اور اضافے کے ساتھ شائع ہونا چاہیئے۔ میں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم سے اس خواہش کا اظہار کیا— پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن پھر میرے اصرار پر اُنھوں نے نہ صرف اِن کو از سرِ نو مرتب کر کے شائع کرنے کی اجازت دے دی بلکہ تصحیح کے خیال سے ان کو ایک نظر دیکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ میں نے مرزا محمد بیگ صاحب کے مرتب کئے ہوئے مقدمات کی دونوں جلدیں فراہم کیں۔ اور ان کے علاوہ اُن مقدمات کو بھی جمع کیا جو اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم نے ان سب پر نظرِ ثانی کی اور ترمیم و اضافے کے بعد ان کا مسودہ مجھے اشاعت کے لئے دیا— اب یہ تمام مقدمات ایک جلد میں یک جا کر کے شائع کئے جاتے ہیں۔

ایک عظیم ادبی شخصیت میں اپنے فن کے ساتھ ایک طرح کی بے نیازی ضرور ہوتی ہے۔ فن کار کو اپنی فنّی تخلیق محبوب تو ہوتی ہے لیکن وہ اس کو مکمل نہیں سمجھتا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں بھی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جب بھی وہ اپنی تحریروں کو دیکھتے تو یہی کہتے کہ جب میں ان کو پڑھتا ہوں تو یہ میری نظر سے گر جاتی ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، اور اسی لئے ان کو کتابی صورت میں شائع نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے اصرار پر اُنھوں نے جب اُن مقدمات کی تصحیح کی اور ان کا مسودہ مجھے واپس بھیجا تو اپنے خط میں ان خیالات کا اظہار کیا :-

"مقدمات کی پہلی جلد تصحیح کے بعد بھیجتا ہوں۔ یہ بے حد غلط چھپے ہیں اور خراب چھپے ہیں۔ تصحیح میں میرا بہت سا وقت ضائع ہوا۔ مرزا محمد بیگ صاحب نے یہ مقدمات مرتب کئے تھے۔ جب

اُن سے میں نے ذکر کیا کہ میرے دوست ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب
اسے دوبارہ مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے دونوں
جلدیں مہیا کر کے مجھے عنایت فرمائیں اور ان مقدمات کے بارے
میں جو خط و کتابت اُن میں اور نواب صدر یار جنگ (مولوی حبیب الرحمٰن
شروانی) اور مجھ میں اور مرزا صاحب میں ہوئی تھی اُس کی نقل بھی عنایت
فرمائی جو میں آپ کو بھیجتا ہوں۔ آپ اپنے مقدمے میں ان سے
(مناسب سمجھیں تو) کام لے سکتے ہیں۔ دوسری جلد اس کے بعد
دیکھ کر بھیجوں گا۔

مقالات کے بارے میں آپ جو فرمائیں گے تعمیل کی جائے گی۔
اس مرتبہ جو میں نے اپنے مقدمات پڑھے تو یہ میری نظر سے
گر گئے۔ میری رائے میں ان کا شائع کرنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ آپ اس پر
غور کر لیجیے۔ ان پر محنت، وقت اور روپیہ صرف کرنا بے سود تو
نہ ہوگا۔ آپ بے رو رعایت اپنی رائے لکھیئے۔ بعض مقدمے
فضول اور بہت طویل ہیں۔ اگر آپ کی قطعی رائے شائع کرنے کی ہو
تو بعض کو مختصر کرنا ہوگا اور بعض بالکل خارج کر دیئے جائیں۔
البتہ مقالات میں اکثر ایسے ہیں جو قابل اشاعت ہیں۔"

عبدالحق

میں نے ان خیالات کو ان کی شخصیت کی عظمت کا نتیجہ سمجھا۔ اسی لئے نہ تو
طویل مقدمات کو مختصر کیا اور نہ ان میں سے بعض خارج کئے ـــــ جس صورت میں یہ لکھے
گئے تھے بالکل اسی صورت میں اِس وقت بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم نے ان مقدمات کے بارے میں جو خطوط مرزا محمد بیگ

صاحب کو لکھے تھے، اُن کو بھی یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان سے نہ صرف مولوی صاحب کی شخصیت اور ان مقدمات کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض مقدمات کے بارے میں کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں ــــ ان خطوط کی نقلیں مجھے ازراہِ نوازش مرزا محمد بیگ صاحب نے بھجوائی ہیں اور میں اس کے لئے اُن کا بہت شکرگذار ہوں۔

"شفیقی و مکرمی"۔

عنایت نامہ اور اُس کے ساتھ چار مقدموں کی نقل پہنچی۔ میں نہیں چاہتا تھا اور کئی عنوان سے آپ سے عرض بھی کیا تھا کہ آپ معرکہ مذہب و سائنس کو اس مجموعے میں داخل نہ فرمائیں لیکن آپ نہ مانے۔ تعجب ہے کہ یہ مقدمہ آپ کو پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ میرے نوٹ تھے جو میں نے مقدمے کے لئے تیار کئے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب کو آپ جانتے ہیں۔ اُن کی طبیعت میں جلدبازی ہے۔ وہ آئے اور لے کر چل دیئے۔ اس کے بعد دفعتاً ان کا یہاں سے جانا ہوا میں نے بہت لکھا کہ اِسے واپس کر دو تو میں اصل مقدمہ جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ دوں مگر اُنھوں نے کاغذات واپس نہ کئے اور یہ خیال کیا کہ شاید میں نہ لکھوں کاغذات تلف کر دوں اور آخر یہی چھپ گئے۔ مجھے یہ مقدمہ اس لئے بھی پسند نہیں کہ اگر میں اب لکھتا تو وہ کچھ اور ہوتا۔ یہ وجوہ تھے کہ میں چاہتا تھا کہ یہ مقدمہ اس مجموعے میں شائع نہ ہو۔ مگر میں اب آپ کو روک بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ شائع ہو چکا ہے لیکن اگر کبھی مجھے ان مقدمات کے چھاپنے کی توفیق ہوتی تو اسے کبھی شامل

کرتا۔ بہر حال اب جو آپ کی رائے ہو۔ میں دیکھ کر بھیج دیتا ہوں۔

مقدمۂ کلام میر کو میں از سرِ نو لکھنے والا ہوں۔ اس میں کچھ تغیّر وتبدل کی ضرورت ہے۔

اس زمانے میں میں نے ایک اور مقدمہ لکھا ہے جو فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ پر ہے۔ یہ کتاب انجمن کی طرف سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی اور صاحب لکھ دیتے۔ ایک صاحب نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وقت گذرتا چلا گیا اور وعدہ وفا نہ ہوا۔ جب دو روز رہ گئے۔ میں نے خود لکھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس کتاب کی چند جلدیں جشن جوبلی میں علی گڑھ لے جاؤں۔ فوراً لکھا اور چھپوایا، راتوں رات کچھ کتابوں کی جلدیں بنوائیں اور جوبلی میں ساتھ لے گیا۔ آپ فرمائیں تو کتاب بھیج دوں۔ اِسے ملاحظہ فرمائیے۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو شریک کر دیجئے۔

کیوں صاحب آپ نے ٹکٹ پھر بھیجے۔ آخر آپ مجھے کیوں بار بار نادم کرتے ہیں۔ آپ بھیجتے رہیں گے اور میں واپس کرتا رہوں گا۔ اس سے نتیجہ؟

مولانا شروانی کے عزمِ حج کی اطلاع سے مجھے بھی کھٹکا ہوا تھا کہ اب مقدمے کا خدا حافظ لیکن اُن کے خط سے جس کی نقل آپ نے بھیجی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور لکھیں گے لیکن میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ بہت دیر لگائیں گے۔

تعجب ہے کہ مقدمہ تمدّنِ ہند آپ کو ابھی تک نہیں ملا۔ اڈیٹر' الناظر، کے پاس ضرور ہوگا۔ ان کے پاس اپنے رسالے کی تمام جلدیں

مکمل موجود ہیں۔ وہ چند روز کے لئے مستعار دے سکتے ہیں
یا نقل کروا کر بھیج سکتے ہیں۔ میں ہاشمی صاحب کو لکھتا ہوں کہ وہ
پھر لکھیں اور تاکید کر کے منگوا لیں۔

آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے متردد نہ ہوں۔ اس سے مولانا
شبلی کی منقصت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ
نرے خشک مُلّا یا مولوی نہ تھے۔ بلکہ لطیف انسانی جذبات بھی
رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے اور عاشق مزاج بھی تھے اور یہ ان کے
لئے عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس سے ان کی وقعت اور بڑھنی
چاہیئے۔ لوگوں کے سمجھنے اور بدگمانی کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ
رائیں فوری ہوتی ہیں۔ صحیح فیصلہ زمانے کے ہاتھ ہے۔

مقدمات کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا چاہتا تھا وہ
یہ کہ اعظم الکلام اور تمدّنِ ہند کے مقدموں میں ایک حصّہ مصنفین
کے ذاتی حالات کا ہے۔ یہ حصّہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔ کیونکہ اِن
دونوں کے حالات اس نہج سے کہیں نہیں ملیں گے اور ان کے
کاموں کو سمجھنے کے لئے اِن کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صاحبوں
نے ان حالات کی بہت قدر کی تھی کیونکہ وہ اس طرح لکھے گئے ہیں
کہ ان مصنفین کی سیرت کا پڑھنے والوں کو صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔
اگر آپ نامناسب نہ خیال فرمائیں تو یہ حصے بھی ضرور شریک کر
دیجیئے ورنہ جو آپ کی رائے ہو۔ مجھے کوئی اصرار نہیں۔ اس کتاب
کی ترتیب وغیرہ آپ کی رائے اور ذوق پر موقوف ہے۔"

نیاز مند
عبدالحق

بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن
۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء

شفیق مکرم زاد لطفہ، تسلیم

دو تین روز ہوئے مجھے مکتبۂ ابراہیمیہ سے مقدمات کا اوّل
حصہ وصول ہوا۔ میں نے آپ کا دیباچہ اور شروانی صاحب کا مقدمہ
پڑھا۔ آپ صاحبوں نے میری بابت جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں میں
اس کا ہرگز مستحق نہیں ہوں میں ایک معمولی مزدور ہوں لیکن آپ
نے اپنی عنایت سے مجھے معمار بنا دیا ہے۔ یہ میں انکساری سے
نہیں کہتا بلکہ امر واقعی ہے۔ ایسی حالت میں میں حیران ہوں کہ شکر
کروں یا شکایت یہ محض آپ کی کریم النفسی اور مُروّت ہے۔ جو
آپ میری نسبت ایسا حسن ظن رکھتے ہیں۔ ورنہ میں اپنی اور اپنے
مقدمات کی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ میرے شان وگمان
میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ مقدمات کبھی اس طرح کتاب کی صورت
میں شائع ہوں گے۔ یہ صرف آپ کی قدردانی ہے، جس کی بدولت
انہیں یہ دن نصیب ہوا۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ علاوہ
دوسرے کاموں کے لغات کا کام ایسا کٹھن ہے کہ مجھے اس کا اندازہ
نہ تھا۔ اگرچہ مدد کے لیئے پورا اسٹاف موجود ہے لیکن اس کی دُشواریاں
ایسی ہیں کہ بعض وقت ہمت جواب دے دیتی ہے۔ وقت کم ہے اور
کام بہت، اس لئے میں گوشہ نشین ہوگیا ہوں اور گذشتہ غفلت
کی تلافی کرنا چاہتا ہوں اور ایک ایک منٹ کو بڑی کفایت شعاری
سے صَرف کرتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا ممنون
عبدالحق

میں نے ان مقدمات کی فراہمی میں اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ مرزا محمد بیگ صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے بھی اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا ہے اور اسی لئے میں اس مجموعے میں مولوی صاحب کے لکھے ہوئے تمام مقدمات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ اب کوئی مقدمہ ایسا نہیں ہے جو اس مجموعے میں شامل نہ ہو۔ اِن مقدمات کو میں نے موضوعات کے اعتبار سے مُرتب کیا ہے اور اپنے مقدمے کے ساتھ مرزا محمد بیگ صاحب اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے لکھے ہوئے وہ مقدمے بھی اس میں شامل کر دیئے ہیں جو اس سے قبل پہلے اڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔

شعبۂ اردو و ثقافتِ پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء

عبادت

اُردو ادب میں "مقدمات عبدالحق" کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ وہ اُردو ادب میں کئی لحاظ سے اضافہ ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ وہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ان کے موضوعات بھی مختلف اور متنوع ہیں۔ان میں خیالات و نظریات کی رنگا رنگی اور افکار و تصورات کی بوقلمونی ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر وحدت اور ہم آہنگی بھی نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود زندگی اور ادب دونوں کے پرستاروں کے لئے ان میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے۔ان میں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت سے اسرار اور رموز کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔زبان و لسان کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات و مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور شعر و ادب کے اَن گنت رموز و نکات کی تہوں کے کھُلنے کا پتہ چلتا ہے۔ان میں بڑی وسعتیں ہیں۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے۔ کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں لیکن ان میں سوانح اور

سیرت نگاری کے بھی بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ادبی اور لسانی تحقیق و تفتیش کا بھی ان میں کمال نظر آتا ہے ادبی تنقید اور تبصرہ نگاری بھی ان میں اپنے شباب پر دکھائی دیتی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ خود لکھنے والے کی عظیم شخصیت کا عکس بھی اپنا جلوہ دکھاتا ہے، اور یہ ان مقدمات کی شاید سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان میں ایک عظیم انسان، ایک عظیم محقق، ایک عظیم ماہر لسان، ایک عظیم نقّاد اور ایک عظیم قومی رہنما کے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ مقدمات جن مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھے گئے ہیں، ان پر اردو زبان میں خاصا کام ہو چکا ہے، اور آج بھی اس کام کا سلسلہ جاری ہے، لیکن یہ مقدمات ان موضوعات کو جس طرح پیش کرتے ہیں، اور ان کے مختلف پہلوؤں پر جس طرح روشنی ڈالتے ہیں اس کی مثال اُردو میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اُردو تو کیا، کسی اور زبان میں بھی، کسی ایک شخص نے، اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ایسے بلند پایہ مقدمے نہیں لکھے، بابائے اُردو کے مقدمات اس اعتبار سے منفرد ہیں اور ان میں واقعی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔

مقدمہ نگاری ایک فن ضرور ہے۔ اس کے کچھ بُنیادی اصول بھی ہیں۔ ان اصولوں کا اس میں خیال بھی رکھا جاتا ہے بعض لوازم و عناصر کے مجموعی امتزاج سے اس فن کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے اور یہ لوازم و عناصر بہر صورت اس میں پیشِ نظر رکھے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقدمہ نگاری کی حیثیت کسی مستقل صنفِ ادب کی نہیں ہے۔ کسی زبان کے ادب میں بھی اس کو ادب کی ایک باقاعدہ شاخ نہیں سمجھا گیا ہے۔ کیوں کہ مقدمے

توکسی مصنف یا کسی کتاب کے بارے میں محض تعارف کے طور پر لکھے جاتے ہیں اور عام طور پر ان کا انداز کچھ رسمی سا ہوتا ہے۔ اکثر تو وہ کسی کے کہنے سے یا کسی کی فرمائش پر لکھے جاتے ہیں، اسی لئے ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو کسی ادبی تصنیف کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ بابائے اُردو کے مقدمات میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ کسی کی فرمائش پر محض رسمی انداز میں نہیں لکھے گئے ہیں۔ ایک لگن اور ایک دھن نے یہ مقدمات ان سے لکھوائے ہیں اور ان کا ایک والہانہ جذب وشوق ان مقدمات کی تخلیق کا محرک ہوا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اُردو زبان وادب کے عالم ہی نہیں، عاشق بھی ہیں، اس زبان اور ادب میں جو بھی اہم کام ہوتا ہے اس کو وہ تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے مرتبے کو متعین کرنے میں انہیں خاص طور پر خوشی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ ان موضوعات پر اپنے مقدمات میں دل کھول کر اظہار خیال کرتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے بیشتر مقدمات اُردو زبان اور ادب ہی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہیں، اور ان پہلوؤں سے غیر معمولی دل چسپی ہی نے ان کے یہاں ان مقدمات کو لکھنے کا خیال پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیشتر مقدمات زبان وادب کے انہیں پہلوؤں سے متعلق ہیں اور ان میں بڑی ہی بصیرت افروز باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب کے علاوہ اُنھوں نے جن موضوعات پر مقدمات لکھے ہیں، اس کا محرک ان کا علمی میلان ہے لیکن یہ علمی میلان محض کتابی نہیں ہے وہ انسانی زندگی کو دیکھنا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہی خواہش ان کے یہاں ایسے مقدمات کی تخلیق کا باعث بنی ہے، جن کا موضوع اُردو زبان اور ادب نہیں ہے، بلکہ

انسانی زندگی کے عام معاملات ہیں چوں کہ وہ ان معاملات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں اس لئے اُنہوں نے ان موضوعات پر مقدمات میں اظہارِ خیال کو ضروری سمجھا ہے، اور اس سلسلے میں بڑی ہی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ غرض یہ مقدمات چاہے، ان کے موضوعات کچھ بھی ہوں محض لکھنے کی خاطر نہیں لکھے گئے۔ کسی نے زور دے کر انہیں نہیں لکھوایا ہے۔ ان میں فرمائش اور اثر و رسوخ کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اسی لئے ان میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو مقدمہ نگاری کے فن کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں لگی لپٹی باتیں نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے دو ٹوک بات کہنے کا انداز ہے۔ زیرِ نظر موضوع پر متوازن طریقے سے اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ جذبات کو اظہارِ خیال میں ذرا بھی دخل نہیں۔ برخلاف اس کے عقل و شعور پر ان کی بنیادیں استوار نظر آتی ہیں۔ اسی لئے ان میں ہر جگہ ایک منطقی زاویۂ نظر ملتا ہے۔ ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے وہ تفصیل اور جزئیات میں ضرور جاتے ہیں لیکن اس تفصیل و جزئیات میں دل چسپی کا بڑا سامان ہوتا ہے اور اس سے پڑھنے والے کو بڑی روشنی ملتی ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مقدمات میں جو انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ حد درجہ شگفتہ اور شاداب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقدمات دماغ ہی کو متاثر نہیں کرتے، دل پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے اور اس طرح ان تمام خصوصیات کے مجموعی امتزاج سے ان مقدمات میں وہ لوازم اور عناصر رونما ہو جاتے ہیں جن کے ہاتھوں مقدمہ نگاری کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ بابائے اُردو نے یہ مقدمے لکھ کر واقعی مقدمہ نگاری کو ایک فن بنا دیا ہے اور اس طرح اسے ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت دے

دی ہے۔

یہ مقدمات تعداد میں بھی خاصے ہیں۔ ان کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق بیسویں صدی کے اُردو ادب کی عظیم شخصیت ہیں۔ اس عظیم شخصیت نے اُردو زبان اور ادب پر جتنا کام گزشتہ نصف صدی میں کیا ہے کئی شخصیتیں مل کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتیں۔ اُنھوں نے لسانی معاملات پر تحقیق کی ہے۔ زبان کے اصول و قواعد مرتب کیے ہیں۔ لغات لکھی ہیں۔ قدیم ادب کا سُراغ لگایا ہے۔ پُرانے شعراء کے دیوان مرتب کئے ہیں، شعراء کے تذکروں کو ترتیب دیا ہے۔ نثر کی قدیم سے قدیم کتابیں تلاش کی ہیں اور ان کا صحیح متن تیار کیا ہے۔ اور چھپتے وقت ان سب پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان مقدمات کا اصل مقصد تو تعارف تھا لیکن اس میں تحقیق اور تنقید کے پہلو بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس تحقیقی اور تنقیدی کام نے بابائے اُردو کو زبان و ادب کا سب سے بڑا عالم اور محقق ثابت کر دیا اور ان کی یہ عظمت تسلیم کر لی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنے والوں نے جب بھی کوئی کام کیا تو ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا کام مولوی عبدالحق صاحب کے تعارف کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ اُنھوں نے ان کاموں میں سے جن کو اہم سمجھا ان پر مقدمات کی صورت میں اظہارِ خیال کیا اور اس طرح ایسے مقدمات بھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے جو انہیں اپنے بعض ہم عصروں کی کتابوں پر لکھنے پڑے اس زمانے میں زبان اور ادب میں جو رجحانات پیدا ہوئے اور علمی و تعلیمی اداروں میں جو تحریکیں شروع ہوئیں اُنھوں نے بھی بعض تصانیف کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ ان پر بھی مولوی عبدالحق صاحب ہی کو مقدمے لکھنے پڑے۔ اس طرح گزشتہ

پچاس ساٹھ سال میں مختلف موضوعات پر بابائے اُردو کے مقدمات کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اور ان مقدمات نے بہت تھوڑے عرصے میں نہ صرف اپنی اہمیت تسلیم کرالی بلکہ اُردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔

ان میں سب سے اہم تو وہ مقدمے ہیں جو خود ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ کتابیں اُردو کے قدیم کلاسیکی ادب سے تعلق رکھتی ہیں مولوی عبدالحق صاحب نے ان کتابوں پر مقدمے لکھ کر نہ صرف ان کا تعارف کرایا ہے بلکہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے ان پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ جن مصنفوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں ان کے حالات، شخصیت، ماحول اور ادبی مرتبے کے تمام خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ ان مصنفوں کے بارے میں جتنا مواد مولوی صاحب نے فراہم کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اس مواد سے نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بعض اہم انکشافات ہوتے ہیں مصنف کے صحیح حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ماحول کی خوصیات واضح ہوتی ہیں اور اس کی تصانیف کی ادبی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا سادہ لیکن پُرکار اسلوب اس بیان میں بڑی دل کشی اور دل آویزی پیدا کر دیتا ہے ان کے یہ بیانات نہ صرف عالموں، ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کے لئے دل چسپ ہو جاتے ہیں بلکہ عام آدمی بھی ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بابائے اُردو اس سلسلے کی تمام تفصیل و جزئیات کو زندگی کا جز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں خالص تحقیقی باتیں بھی دل چسپ بن جاتی ہیں۔ نام نہاد محققوں کا یہ عام انداز ہوتا ہے کہ وہ بے شمار حوالوں سے پڑھنے والے کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ سیدھی سادی باتوں پر بھی اسی طرح حاشیے لکھتے ہیں کہ

اصل موضوع پس منظر میں جا پڑتا ہے، اور اس طرح ان کی تحریر جس کو وہ خود تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں پڑھنے والے کے لئے گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

بابائے اُردو کے ان مقدمات میں تحقیقی پہلوؤں پر بہت زور ہے لیکن یہ عام تحقیقی تحریروں کی طرح اُلجھی ہوئی خشک، بے مزہ اور پراگندہ نہیں ہیں، ان میں تو ان کا سیدھا سادہ لیکن دل موہ لینے والا انداز جادو جگاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر میر تقی میرؔ پر دو معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں۔ ایک تو ان کے انتخاب کلام پر ہے۔ اور دوسرا میرؔ کی خود نوشت سوانح حیات ذکر میرؔ پر۔ یہ مقدمے آج سے برسوں پہلے لکھے گئے تھے لیکن ان میں میرؔ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں جو بصیرت افروز باتیں ہیں ان پر آج تک کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ میرؔ پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور بعض لوگوں نے بزعم خود میرؔ صاحب کے بارے میں بڑا کام کیا ہے لیکن بابائے اُردو نے اپنے مقدمات میں میرؔ پر جو کچھ لکھا ہے اس کے سامنے ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہ جاتی۔ اس آفتاب عالم تاب کے سامنے وہ محض ٹمٹماتے ہوئے چراغ معلوم ہوتے ہیں۔

میرؔ کے انتخابِ کلام پر جو مقدمہ بابائے اُردو نے لکھا ہے اس کا آغاز میرؔ کے تعارف سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں۔

"میر تقی میر سرتاج شعرائے اُردو ہیں، ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں۔ اگر

دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام
ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل
کرنا ہوگا، یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے موزونی طبع کی وجہ
سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے
لئے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں
ڈوبے ہوئے تھے، اور جنہوں نے اپنے کمال سے اُردو کی
فصاحت کو چمکا دیا، اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری میر صاحب
کی زندگی کا جُز تھی۔ گویا فطرت نے انہیں اسی سانچے میں ڈھالا
تھا۔ ان کا احسان اُردو زبان پر تا قیامت رہے گا اور ان
کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس میں وہ
عالمگیر حسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں"۔
اس مختصر بیان سے میر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کی ایک مکمل تصویر
آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اس کے قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو
جاتا ہے اور ان کی شخصیت کے ساتھ ایک طرح کی موانست پیدا ہو
جاتی ہے۔ بابائے اردو اس موانست کو پیدا کرنے کے بعد آگے بڑھتے
ہیں اور میر صاحب کی زندگی کے بارے میں تحقیقی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔
اس بحث سے میر کی زندگی کے نشیب و فراز کا علم ہو جاتا ہے لیکن یہ علم ذہن
پر بوجھ نہیں بنتا۔ کیوں کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش
اس موانست کے ہاتھوں بیدار ہو جاتی ہے جس کو مقدمہ نگار مقدمے
کے آغاز ہی میں بیدار کر دیتا ہے۔ میر کے حالات بیان کرتے ہوئے اُنہوں
نے نکات الشعراء، گلزار ابراہیم اور گلشنِ ہند کے حوالے سے جو معلومات فراہم

کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب اکبر آباد کے رہنے والے تھے
لیکن انہوں نے شاہ جہاں آباد میں پرورش پائی۔ سراج الدین علی خاں
آرزو ان کے دور کے رشتے داروں میں تھے۔ میر کے بزرگ حجاز کے رہنے
والے تھے۔ ان کے والد کا نام میر علی متقی تھا اور وہ ایک گوشہ نشیں بزرگ
تھے۔ میر ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ انہیں تلاش
معاش کی فکر ہوئی۔ وہ دلی پہنچے اور وہاں صمصام الدولہ امیر الامراء سے
ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک روپیہ روزانہ مقرر کیا لیکن وہ نادر شاہ
کی جنگ میں مارے گئے۔ اس کے بعد انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا
پڑا۔ انہوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ اس سلسلے میں دلی سے باہر بھی جانا
پڑا۔ بالآخر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۲۲۵ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ تمام
واقعات تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کو بیان کرتے ہوئے بابائے
اردو نے خواہ مخواہ بہت سی کتابوں کے حوالے نہیں دیئے ہیں صرف ذکر میرؔ
کے حوالے سے مطلب کی باتیں بیان کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذکر میر، سے زیادہ
مستند حوالہ کوئی اور نہیں ہو سکتا اس لئے وہ خواہ مخواہ دوسرے حوالوں کی
تلاش میں بھٹکے نہیں ہیں، اور انہوں نے ان حوالوں سے اپنی تحریر کو گراں
بار نہیں کیا ہے۔ اس مقدمے کے آخری حصے میں انہوں نے میر کی شاعری
کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں بڑی پتے کی باتیں
کہی ہیں اور بہت ہی نپے تلے انداز میں چند خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خیالات
سے میر کے شاعرانہ مرتبے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پوری طرح بے نقاب
ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میر صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے

اُردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔
الفاظ کا صحیح استعمال اور اُن کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں
موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی
عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ میر کے کلام میں یہ سب
خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام اتنا درد بھرا ہے
کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لطف سے خالی
نہیں ہوتی"۔

اور آگے چل کر میر کے کلام کی وسعت اور ہمہ گیری پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:۔

"جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے
شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن
ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں، اسی طرح اگرچہ میر صاحب
کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن
ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا رہتا ہے"۔

یہ تنقیدی فقرے میر کے کلام کی بنیادی خصوصیات کو واضح کر دیتے ہیں اور یہی
ان کا مقصد بھی ہے۔

کم و بیش یہی انداز اس مقدمے کا بھی ہے جو اُنھوں نے میر صاحب کی
خود نوشت سوانح حیات 'ذکرِ میر' پر لکھا ہے۔ اس میں پہلے میر صاحب کا مختصر سا
تعارف اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی اہمیت کی وضاحت ہے، پھر ادب
میں آپ بیتی کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے۔ آپ
بیتی کے لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک

بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخ کی
ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا
دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی آپ بیتی لکھ جایا کرے تو
ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہوں۔

"ذکر میر" ایسا ہی انمول موتی ہے۔ کیوں کہ اس سے میر کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی باتیں جن کا لوگوں کو مطلق علم نہیں تھا ذکر میر سے واضح ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں اس زمانے کے جو تاریخی اور سیاسی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی اہمیت کو خاص طور پر بابائے اُردو نے واضح کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ

"اُس زمانے کی تاریخ کے لئے یہ کتاب ایک اہم حیثیت
رکھتی ہے۔ کیوں کہ میر نے اس زمانے کی تباہی اور بربادی، ہنگاموں
اور پریشانیوں کا چشم دید حال لکھا ہے اور ذکر میر میں نجی حالات
سے زیادہ ان پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔"

بابائے اُردو نے میر صاحب کے تاریخی شعور پر اپنے مقدمے میں خاص طور پر بحث کی ہے اور انہیں ایک اعلیٰ درجے کا مؤرخ ثابت کیا ہے، اس کے بعد ایک ایک کر کے ان نئی باتوں کی وضاحت کی ہے جو ذکر میر سے معلوم ہوتی ہیں۔ مقدمے کا یہ حصہ تحقیقی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اُنہوں نے ذکر میر کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر کے والد کا نام میر عبداللہ نہیں بلکہ میر علی متقی ہے، کیونکہ ذکر میر میں ہر جگہ یہی نام لکھا ہے۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ میر صاحب نجیب الطرفین سید تھے، خان آرزو سے میر صاحب کے تعلقات کی کشیدگی کا اصل سبب بھی اُنہوں نے معلوم کرلیا

ہے۔ نکات الشعرا میں میر نے خان آرزو کی جو تعریف کی ہے اور ذکر میر میں اُنہیں جو بُرا بھلا کہا ہے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ نکات الشعرا کی نوعیت چوں کہ ذاتی نہیں تھی اور خیال یہ تھا کہ وہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں جائے گا، اس لئے وہاں اس قضیے کو چھیڑنا اُنہوں نے مناسب نہیں سمجھا، لیکن ذکر میر چوں کہ آپ بیتی تھی اس لئے وہاں اس کو لکھ کر خوب خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ میر صاحب کے لکھنؤ جانے پر جو روشنی اس کتاب سے پڑتی ہے، اس کی اہمیت کو بھی بابائے اُردو نے اس مقدمے میں واضح کیا ہے اور آزاد نے آبِ حیات میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید کی ہے۔ ان کی بد دماغی کو جس طرح بعض لوگوں نے مبالغے سے بیان کیا ہے اس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے اور ذکر میر کے بعض حصّوں سے جس طرح میر کی بعض نظموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرض اس کتاب کے جتنے اہم پہلو ہیں۔ ان میں کوئی بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ ایک ایک کر کے سب پر اُنہوں نے تحقیقی اور تنقیدی زاویہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقدمے کو پڑھ کر نہ صرف اس کتاب کی اہمیّت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ میر کی زندگی اور شخصیت کے تقریباً تمام پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی مقصد سے یہ مقدمہ لکھا گیا ہے۔

تحقیقی اعتبار سے بابائے اُردو کا شاید سب سے اہم مقدمہ وہ ہے جو اُنہوں نے میرامن دہلوی کی باغ و بہار پر لکھا ہے۔ اس میں اُردو کی اس مشہور داستان کے ماخذ پر اُنہوں نے بڑی ہی بصیرت افروز بحث کی ہے اور بحث کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، وہ آج بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرامن نے باغ و بہار کے دیباچے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ

باغ و بہار کا قصہ امیر خسروؔ کی چہار درویش سے ماخوذ ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باغ و بہار کا ماخذ فارسی کی کتاب چہار درویش نہیں بلکہ نوطرز مرصع ہے۔ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اُردو کی کتاب نوطرز مرصع ہے، اس کے مؤلف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین اٹاوے کے رہنے والے تھے۔ میر امن نے فارسی کتاب اور اُس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر نوطرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔"

اور اس کے بعد تینوں کتابوں کے بعض مقامات کا مقابلہ کر کے اپنے اس خیال کو صحیح ثابت کیا ہے۔ اس سے باغ و بہار کے ماخذ کے بارے میں جو ایک غلط فہمی عام ہو گئی تھی، وہ دور ہو گئی ہے۔ اس مقدمے میں وہ زیادہ تر تحقیقی پہلو کی طرف متوجہ رہے ہیں اس لئے اس میں تنقیدی پہلو زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا ہے البتہ بعض لسانی پہلوؤں کی وضاحت اُنہوں نے ضرور کی ہے۔ اسی میں ضمنی طور پر میر امن کے اسلوب اور ان کی زبان کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

شعرائے اُردو کے بیشتر تذکرے خود بابائے اُردو نے مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ان کا مقدمہ بھی ہے۔ ان مقدمات میں اُنہوں نے صرف ان تذکروں ہی کی اہمیت کو واضح نہیں کیا ہے ان کے لکھنے والوں پر بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں میرؔ کے تذکرے نکات الشعرا، شفیقؔ کے تذکرہ چمنستانِ شعرا، قائمؔ کے تذکرہ مخزنِ نکات، گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں،

لُطف کے تذکرہ گلشن ہند، مصحفی کے تذکرہ ہندی گویاں اور ریاض الفصحا، وغیرہ پر جو مقدمے اُنہوں نے لکھے ہیں وہ ادبی تحقیق کے شاہکار ہیں، ان سے اردو شاعری اور اردو شعرا کے بارے میں بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جن تک ان سے قبل کبھی کسی کی نظر پہنچی ہی نہیں تھی۔ نکات الشعرا کا مقدمہ مختصر ہے لیکن اختصار کے باوجود اس میں بعض نئی اور دل چسپ باتیں ملتی ہیں۔ یہ تذکرہ چوں کہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس لئے وہ اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں کہ تقریباً تمام تذکروں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

> اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ان میں نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے۔ میر صاحب کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انہوں نے لکھا ہے۔ مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ ہجری ہے یا خاکسار جس نے ۱۱۶۵ھ ہجری میں "معشوق چہل سالہ خود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ گارساں دتاسی نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گردیزی کو بھی یہ دعوی ہے کہ اس کا تذکرہ سب سے پہلا ہے، حالاں کہ اس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں ان تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہے جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے اپنا تذکرہ میر صاحب کے جواب میں لکھا ہے۔
> خاکسار کے تذکرے کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں کہ "علی الرغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالہ خود، احوال

خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار
دادہ اس کی حقیقت ان چند سطروں سے صاف ظاہر ہے۔ تذکرہ
گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ ہجری ہے اور قائم کا ۱۱۶۸ ہجری"۔
اس بیان سے نکات الشعرا کی نہ صرف اولیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ شعرائے
اُردو کے بعض دوسرے تذکروں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں میر کے
حالات پر اُنہوں نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کے
بارے میں مقدمہ "ذکر میر" اور مقدمہ انتخاب کلام میر میں اس سے قبل لکھ چکے
تھے صرف سراج الدین علی خاں آرزو سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کو
واضح کیا ہے۔ چمنستان شعرا کے مقدمے میں اُنہوں نے اس تذکرے کے
مؤلف لچھمی نرائن شفیق کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں اس لئے کہ
ان کے حالات کہیں اور نہیں ملتے، ساتھ ہی اس تذکرے کی حقیقت بھی
واضح کی ہے۔ لکھا ہے:۔

"اگرچہ شفیق نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح
کے تذکروں پر رکھی ہے، لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو
حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔
چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم حاکم کے تذکرہ
مردم دیدہ اور تذکرہ مجمع النفائس تالیف سراج الدین علی خاں
آرزو سرو آزاد اور حاجی علی اکبر وصال اور رضا خان انوار کی بیاضوں
کا حوالہ ملے گا"

اس سے اس تذکرے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ اندازہ ہو
جاتا ہے کہ یہ کون کون سی کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اسی طرح

مخزن نکات کے مقدمے میں پہلے تو انہوں نے قائم چاندپوری کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہیں اور پھر اس کے تذکرے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور تذکرے کے بارے میں اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"قائم کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسین الگردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی لیکن ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دیتے ہیں وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں اشعار کے انتخاب اور حالات دونوں مختلف ہیں۔"

اس بیان نے قائم کے تذکرے کی صحیح حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ اسی طرح گردیزی کے تذکرے پر جو چند صفحات کا مقدمہ لکھا ہے اس میں اس کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ یہ تذکرہ میر کے نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا ہے اور اس میں میر کو گرانے کی کوشش کی گئی ہے، اصل تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"گردیزی نے جس دعوے کے ساتھ اس تذکرے کے لکھنے کا قصد کیا ہے اس کا کتاب میں کہیں نشان نہیں ملتا، اس میں کہیں غلط حالات کی تصحیح کی گئی ہے، نہ مظلوم ہمسروں اور ہم عصروں کی بے جا خوردہ گیری کا جواب دیا گیا ہے۔ نہ ان

نازک خیال رنگین نگار شعراء کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے
جو دوسروں کی بے اعتنائی کے شکار ہو گئے تھے اور نہ ان
حقائق کو آشکارا کیا جو دوسرے تذکرہ نویسوں کے ایجاز کی وجہ
سے نظروں سے پوشیدہ تھے، ایسی صورت میں ان کا دعویٰ
بے دلیل اور اس کا الزام بے بنیاد ہے۔"

اس بیان سے گردیزی کے تذکرے کی خصوصیات کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے اور حقیقت حال سامنے آجاتی ہے۔ مرزا علی لطف کے گلشن ہند کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :۔

"حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۴ عیسوی میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا، اُنھوں نے مؤلف تذکرہ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ ان کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور ان میں اردو زبان اور اردو شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل

نئی صورت پیدا ہوگئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہوگئی ہے۔"
اس سے بھی پڑھنے والا اس تذکرے سے پوری طرح واقف ہوجاتا ہے اور اس کی شانِ نزول اس پر روشن ہوجاتی ہے۔ اسی طرح مصحفی کے تینوں تذکروں کی حقیقت صرف چند جملوں میں واضح کردیتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"تین تذکرے بھی ان کی بڑی یادگار ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوتے تھے، سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے، جس کا نام عقد ثریا ہے۔ اس میں تین قسم کے شعراء کا ذکر ہے۔ اول شعراء ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اردو کہنے والے شاعروں کا ہے۔ تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے ان کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔"

اس بیان سے ان تمام باتوں کا علم ہوجاتا ہے کہ مصحفی نے اپنے تینوں تذکرے کیوں لکھے، کس طرح لکھے اور یہ کہ ان کو اس طرح تین ناموں سے لکھنے کا کیا مقصد تھا۔

یہ تفصیل صرف اس خیال سے پیش کی گئی ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے مختلف مقدمات کے اقتباسات صرف اس خیال سے دیئے گئے ہیں کہ ان سے بابائے اردو کے ان مقدمات کا صحیح انداز معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے قدیم ادب کی کتابوں پر لکھتے ہوتے اختیار کیا ہے۔

مقدمات میں وہ ہمیشہ تحقیق اور تنقید دونوں کو اپنے پیش نظر رکھتے

ہیں لیکن تحقیق کو خشک اور بوجھل نہیں بناتے، بلکہ کچھ ایسی سادگی سے ضروری
باتوں کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی تحقیق پڑھنے والے کے لئے حد درجہ
دل چسپ بن جاتی ہے اور وہ اس سے لُطف اندوز ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی
تمام ضروری معلومات اُسے حاصل ہو جاتی ہیں اور موضوع کے تمام نشیب
و فراز اُس پر روشن ہو جاتے ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب اس ضمن میں کبھی
غیر ضروری باتیں نہیں کرتے وہ تو صرف ایسی باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جن
سے اصل موضوع پر روشنی پڑتی ہے اور اُس کے خط و خال پوری طرح
واضح ہو جاتے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ کتاب کے مصنف کا
حال بھی بیان کر دیتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اُن کی توجہ اصل موضوع ہی کی
طرف رہتی ہے۔ مثلاً جب کسی تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں تو تذکرہ ہی
اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور وہ اسی کی تفصیل کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے
میں بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ باتیں معلومات میں اضافے
کا باعث بنتی ہیں۔ اصل تفصیل و جزئیات کو پیش کرتے ہوئے وہ تمام تحقیقی
پہلوؤں کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن ان سے ملی جلی تنقید بھی اُن کے یہاں
نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان مقدمات میں اُنھوں نے تحقیق و تنقید کو ایک دوسرے
کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ جن کتابوں پر وہ مقدمات لکھتے ہیں، اُن کی لسانی
اور ادبی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے وہ تنقید سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس
لئے تحقیق اور تنقید دونوں ان کے یہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور اس طرح
تحقیق و تنقید میں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے اور ایک ہم آہنگی نظر آنے
لگتی ہے، تحقیق اور تنقید دونوں کا ان مقدمات میں کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے،
اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ جس کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں،

اُس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اُن کے یہاں ذریعہ ہیں، مقصد نہیں، اور یہ خصوصیت اُن کے اُن مقدمات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں اور جن میں شعرائے اردو کے تذکروں پر لکھے جانے والے مقدمات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

زبان و بیان کے مختلف معاملات و مسائل سے مولوی عبدالحق صاحب کو ہمیشہ دل چسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقدمات میں بھی جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں وہ اردو زبان اور اُس کے لسانی پہلوؤں پر جگہ جگہ بعض بہت ہی بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ مثلاً نکات الشعراء کے مقدمے میں اُنہوں نے میر کے حوالے سے اردو زبان کے ابتدائی نام ریختہ پر اظہارِ خیال کیا ہے، اور مصحفی کے تذکروں پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں بھی لسانی معاملات و مسائل کو نظر انداز نہیں کیا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُنہوں نے ادبی مقدمات میں لسانی معاملات و مسائل پر جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ محض اشارے ہیں اس پر مفصل بحث تو اُنہوں نے ان مقدمات میں کی ہے جو ایسی کتابوں پر لکھے گئے ہیں جن کا موضوع زبان و لسان کے مختلف پہلو ہیں، ان مقدمات میں سید انشا کی دریائے لطافت کا مقدمہ، مقدمہ قواعد اردو، مقدمہ فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ اور مقدمہ مطبوعات دارالترجمہ عثمانیہ وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

قواعد اُردو خود مولوی صاحب کی قابلِ قدر تالیف ہے، اس پر اُنہوں نے جو مقدمہ لکھا ہے، اُس میں سب سے پہلے علم اللسان کا یہ اصول بیان کیا ہے کہ :-

زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اُسے ایجاد کرسکتا

ہے، جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتیں، پھولتی ہیں اور وہی ایک ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اُسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔"

اور پھر اس اصول کی روشنی میں اُردو کی پیدائش اور اُس کے آغاز کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں :-

"اُردو اُس زمانے کی یادگار ہے، جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہل ہند سے اُن کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا، اُس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا گیا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی، جس کا اُن میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانے تک اُن کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اُسی کا سکّہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اُسے شوق سے سیکھا۔ اس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستار فضیلت کا ملنا عربی زبان کی تحصیل کے بغیر ناممکن تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ اِدھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی، اُسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چنانچہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور علماء و شعراء نے بھی یہ زبان سیکھی، اور اس میں تالیف و تصنیف (جو زیادہ تر نظم تھی) بھی کی۔ غرض ہندو

مسلمانوں کے اس میل جول اور خلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم
لیا، جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا، اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور
لشکری زبان جیسی ہوتی ہے یعنی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر۔ اس لئے
اوّل اوّل ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اُس کے
لکھنے کو عار سمجھتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے قدم جمتے چلے گئے اور
مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایۂ
عاطفت میں لیا۔ اور پال پوس کر بڑا کیا، بہت کچھ صفائی پیدا کی اور
نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر
کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مسلّط ہوئی جو مسلمانوں سے
بالکل غیر تھی۔ اُس قوم نے اُس کی اُنگلی پکڑی، اُس نے اُنگلی پکڑ کر
اُن کا پہنچا پکڑا، اور دربار میں اُس کی رسائی ہو گئی، اور رفتہ رفتہ
دفاتر سے اُس کو نکال باہر کیا اور خود اُس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی،
آخر ہندوستان کی قدیم راج دہانی اُس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس
کا وطن ہوا۔ اب دور دور پھیل چکی ہے اور ہندوستان کے اس
سرے سے اُس سرے تک چلے جایئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے"۔

ان چند جملوں میں مولوی صاحب نے اُردو زبان کی تاریخ اور اُس کے لسانی
ارتقا کو پوری طرح واضح کر دیا ہے، اپنے ارتقائی سفر میں وہ جن حالات سے
دوچار ہوئی ہے، اُس کی تصویر بھی کھینچ دی ہے اور ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی
اور معاشرتی تاریخ نے اس زبان کو جس مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے اُس کا پورا
نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اُس کے
لسانی پہلوؤں پر بابائے اُردو کی نظر کتنی گہری ہے اور وہ اس موضوع پر کتنے

اعتماد کے ساتھ کیسی بصیرت افروز گفتگو کرسکتے ہیں۔ اس مقدمے میں انہوں نے اردو زبان کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اُس کی صرف ونحو پر بھی بحث کی ہے، اور یہ بحث بھی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہ اردو زبان کے نہ صرف بڑے عالم بلکہ مزاج داں ہیں۔

زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور ان کے اُس مقدمے میں بھی نظر آتا ہے جو اُنھوں نے سیّد انشا کی کتاب "دریائے لطافت" پر لکھا ہے۔ اس میں سیّد انشا کے حالات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے اور اُن کے لسانی شعور کی وضاحت کرنے کے بعد اُنھوں نے جہاں اس کتاب کی اہمیت کی طرف اشارے کئے ہیں وہاں زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور نظر آتا ہے، لکھتے ہیں:۔

> سیّد انشاء اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت واصلیت پر غور کیا اور اُس کے قواعد وضع کیے۔ اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہ بھولے، علاوہ اس کے الفاظ ومحاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور اُن کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کئے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنہیں زبان کا ذوق ہے۔"

اور پھر ان نکات پر مفصل بحث کی ہے، جس سے زبان کے بارے میں اُن کے صاحبِ ذوق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس مقدمے میں لسانی تحقیق کے ساتھ زبان کے ذوق وشعور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اردو نہ صرف اردو زبان کے سب سے بڑے محقق

ہیں بلکہ مزاج داں بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مزاج دانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی اور زبان کا یہ ذوق وشعور آسانی سے عام نہیں ہوتا۔اس کے لئے تو زبان سے عشق کرنے کی ضرورت ہے بابائے اردو کو اس زبان سے محبت تھی، اور ان کی یہ محبت عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی، چناں چہ ان کے مقدمات میں جگہ جگہ اُردو زبان سے والہانہ وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے۔اسی لئے ان کی تحقیق محض تحقیق نہیں رہ جاتی، بلکہ اُس میں زبان کی یہ محبت رس پیدا کردیتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لسانی تحقیق کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور خشک سے خشک موضوع کو بھی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے۔

ادبی ولسانی موضوعات کے ساتھ ساتھ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے بعض مقدمات ایسے موضوعات پر ہیں جو اُن کا خاص میدان نہیں ہے لیکن جن پر اُنھوں نے بڑے ہی عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں بہت ہی سلیقے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً اُنھوں نے ایسی کتابوں پر بھی مقدمے لکھے ہیں جن کا موضوع اسلام اور اس کے مختلف معاملات و مسائل ہیں۔ان مقدمات میں مقدمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مقدمۂ تحقیق الجہاد اور معرکۂ مذہب و سائنس بہت اہم ہیں۔ان مقدمات میں جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُس سے دینی اور دنیاوی پہلوؤں کے متعلق اُن کے خیالات و نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مولوی چراغ علی کا رسالہ تھا جو اُنھوں نے پادری کینن میلکم میکال کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا، اس مضمون میں پادری صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے

جو موجودہ حالت میں چل نہیں سکتا۔ اور اگر مسلمان اس پر عامل رہے تو کبھی ترقی نہیں کر سکتے، مولوی چراغ علی نے اپنے رسالے میں انہیں اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور بقول مولوی صاحب بہت پُر زور اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں اُن تمام بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں، اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس کے پہلے حصے میں سیاسی حالات پر اور دوسرے حصے میں معاشرتی اور تمدّنی حالات پر بحث ہے۔ کتاب کے مقدمے میں فقہ اور اصولِ فقہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور قرآن و حدیث پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے بابائے اُردو مولوی چراغ علی کے بیشتر خیالات سے اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً اسلامی فقہ کے بارے میں اُنھوں نے مولوی چراغ علی سے اتفاق کرتے ہوتے لکھا ہے کہ :۔

> ”اگرچہ اسلامی فقہ کے بعض ضابطے اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت مناسب اور معقول تھے لیکن موجودہ ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شے سوائے قرآن پاک کے قطعی اور ناقابل تبدیل نہیں۔ لہذا اِس زمانے میں بھی اجتہاد کو وہی حق حاصل ہے جو پہلے زمانے میں تھا بشرطیکہ وہ احکامِ قرآنی سے مطابق ہوں۔“

مولوی صاحب کے مقدمے میں اس کتاب پر تنقید نہیں ہے، اُس کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے اور اس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولوی چراغ علی کے خیالات سے متفق ہیں۔ یہ مقدمہ اس لحاظ سے بھی

قابل قدر ہے کہ اس کے پہلے حصّے میں مولوی چراغ علی کا حال بہت تفصیل سے درج کیا گیا ہے اور ان کی شخصیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بابائے اُردو ان سے متاثر ہیں اور ان کے مذہبی اور دینی خیالات و نظریات کا اُن پر گہرا اثر ہے۔ اُن کے رسالے تحقیق الجہاد پر بھی اُنھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے، اسی لئے وہ مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مولوی چراغ علی مرحوم کی کتابیں پیاسے کے لئے آب حیات، مریض کے لئے نوش دارو مارگزیدہ کے لئے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے، اور جب کہ مقلد اور غیر مقلد، سنی و شیعہ، توتو میں میں مصروف تھے وہ ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے دین و ملت کی ادا کر رہے تھے کہ اُس کی نظیر ان کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض داعیان حمایت دین کی آنکھیں اب کھلی ہیں اور دن ڈھلے پر ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اور اُس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں لیکن انہیں خبر نہیں کہ مدت ہوئی اس کی بنیاد سر سید ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اُس کی تکمیل بھی کر چکے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو سر سیّد اور چراغ علی کے مذہبی تصورات سے پوری طرح اتفاق ہے اور وہ انہیں کے نظریات و خیالات کے قائل ہیں" کیوں کہ اُن میں انہیں عقلیت اور روشن خیالی نظر آتی ہے۔

"معرکۂ مذہب و سائنس" پر مولوی صاحب نے نہایت معرکہ آرا مقدمہ لکھا ہے اور ان دونوں کے مختلف پہلوؤں پر اس میں بہت تفصیل سے بحث

کی ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر ڈاریپر کی کتاب پر ہے جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کیا تھا۔ اس مقدمے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مذہب کی اہمیت واضح کی ہے، اور اس کو انسانی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیا ہے، اُن کے خیال میں مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اُس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود و قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہی چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقات، ہوتی رہیں گی، جدوجہد قائم رہے گی اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ سائنس بھی مذہب کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کیوں کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ وہ صرف مادے سے تعلق رکھتا ہے لیکن مذہب کی حکمرانی روح پر ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :-

> سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے کیوں کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے، اُس کی رسائی صرف مادّی اشیاء تک ہے لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے اور وہ مادّی اور غیر مادّی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی میں مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں اور سائنس کے مقابلے میں اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں لیکن تمام مذاہب میں اُن کے نزدیک مذہب اسلام زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اس نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ غرض اس مقدمے میں مولوی صاحب نے بڑی ہی فلسفیانہ بحث کی ہے اور اس موضوع پر بہت سلجھے ہوئے خیالات پیش کیے ہیں۔

ان مقدمات کے علاوہ بابائے اردو کے بعض مقدمات ایسے بھی ہیں جن سے ان کے معاشرتی تصوّرات اور نفسیاتی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سب سے اہم تو مقدمۂ تجرد و ازدواج ہے جس میں اُنھوں نے شادی شدہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اس مقدمے کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ خود اس نازک مسئلے کی اونچ نیچ سے واقف نہیں لیکن اس موضوع پر جو خیالات اُنھوں نے پیش کئے ہیں۔ ان میں گہرے معاشرتی اور نفسیاتی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کے خیال میں شادی اور شادی شدہ زندگی کی بنیاد محبت پر استوار ہونی چاہیئے۔ کسی اور ذریعے سے اس میں کامیابی ناممکن ہے۔ شادی کے معاملے میں آزادیٔ انتخاب کے بھی وہ قائل ہیں اور ایسی رسموں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے جن سے یہ آزادی سلب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ چوں کہ شادی کا بوجھ لڑکے اور لڑکی کو اُٹھانا پڑتا ہے اس لئے اس کی تمام تر ذمہ داری انہیں دونوں پر ہونی چاہیئے، ماں باپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ :۔

> شادی کی ابتدا جبر سے شروع ہوئی۔ قدیم زمانے میں دُلہن کا اُڑالے جانا ایسا ہی تھا جیسے مال واسباب اور مویشی کا لوٹ مار کر لے جانا۔ جس کے آثار اب بھی شادی کی مختلف رسوم اور ماں باپ کی زبردستی میں پائے جاتے ہیں اور اسی لکیر کو پیٹتے چلے آرہے ہیں۔ دو شخصوں کو مجبور کرنا کہ آپس میں محبت کرو ایک لایعنی بات ہے، جہاں جبر ہے وہاں محبت کہاں اور جہاں جبر ہے وہاں محبت کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا

ہو جاتی ہے، مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاقات پر بھروسہ کرنا
دانش مندی کے خلاف ہے۔"

اس سے مولوی صاحب کی روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ وہ ان معاملات کو عقلی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے بابائے اُردو کے معاشرتی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اور اُن کے نفسیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

غرض مولوی صاحب نے مختلف اور متنوع موضوعات سے متعلق کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان کے موضوعات علمی بھی ہیں ادبی بھی، معاشرتی بھی ہیں تہذیبی بھی ان مقدمات میں انھوں نے فلسفہ و سائنس کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں، دین اور مذہب کے حقائق کے چہرے سے پردہ بھی اُٹھایا ہے، ادب و شعر کے نکتے بھی بیان کئے ہیں، معاشرت اور تہذیب کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں، تاریخی اور سیاسی حقیقتوں کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ غرض ان مقدمات میں زندگی اور ادب کے اَن گنت پہلوؤں پر اظہارِ خیال ہے اور ان تمام موضوعات پر بابائے اردو کے خیالات و نظریات ان مقدمات سے پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی شخصیت پوری طرح سامنے آجاتی ہے، حالاں کہ وہ ان مقدمات میں براہِ راست اپنی بات بہت کم کہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت کم نمایاں کرتے ہیں لیکن اسی میں اُن کی بڑائی ہے، اُن کے خیالات و نظریات کی وضاحت ان مقدمات میں بالواسطہ طور پر ہوتی ہے۔ جب وہ دوسروں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ایک خاص اسلوب سے اپنی بات کی پوری طرح وضاحت کر دیتے ہیں، اسی انداز کی بدولت ان کی بات

اثر کرتی ہے اور اُن کے خیالات ونظریات دل چسپی کا باعث بنتے ہیں، ان خیالات ونظریات میں گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وسیع مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک تحقیقی مزاج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک روشن خیال طبیعت کا عکس نظر آتا ہے، ایک انسانیت پرست اور انسانیت دوست شخص کے دل کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں، ایک قوم پرست شخص کی افتاد طبع اور ذہنی رجحانات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی آزادی کے ایک بہت بڑے پرستار کی جنوں سامانیاں نظر آتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان خیالات ونظریات میں ایک زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے اور یہ درحقیقت اُس شخصیت کا عکس ہے جو شروع سے آخر تک زندگی ہی زندگی اور جولانی ہی جولانی ہے جو پیہم رواں دواں اور ہر دم جواں ہے جس کو کسی مقام پر رُکنا نہیں آتا اور جس کی منزل آسمانوں سے بھی پرے ہے۔

ان مقدمات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی عظیم شخصیت کے صحیح آئینہ دار ہیں ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا سب سے بڑا مقصد اردو زبان کی خدمت ہے۔ وہ اس کو فروغ دینا چاہتے ہیں اُس سے والہانہ محبت اُن کا نصب العین ہے، اس لئے ان مقدمات میں جگہ جگہ وہ اُردو زبان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے ہیں اور اُس کی ترقی کی باتیں بڑی اخلاص مندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، انہیں اردو ادب کے ساتھ گہری دل چسپی ہے اور وہ اُس کو بھی ترقی کے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لئے اُردو ادب کے قدیم سے قدیم شاہ کاروں کا سراغ لگانے میں پیش پیش رہتے تھے، جدید ادب کے علم برداروں کی ہمت افزائی بھی اُن کے نزدیک ضروری ہے تاکہ اُردو ادب کا ارتقائی تسلسل قائم رہے اور ادب

کا قافلہ آگے بڑھتا رہے۔ اسی خیال سے وہ بعض نوجوانوں کی کتابوں پر بھی مقدمے لکھنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں اور اُن کے کاموں کی دل کھول کر داد دی ہے۔ بابائے اُردو اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ وہ نوجوانوں اور جدت پسندوں کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں اور اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہیں۔ اس میں ان کی روشن خیالی اور کشادہ دلی کو بھی خاصا دخل ہے۔ تنگ نظری ان کے مزاج میں نہیں ہے، قدامت پسندی سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان مقدمات میں جگہ جگہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دھن کے پکّے ہیں، انہیں کام کرنے کی لگن ہے، اُن کے سامنے ایک بلند نصب العین ہے، اس نصب العین کی نوعیت قومی اور ملّی معاشرتی اور تہذیبی ہے، اور اردو زبان وادب کی خدمت کا خیال بھی درحقیقت اُن کے اسی نصب العین کا جُزہے۔ برعظیم کے مسلمانوں کے جو قومی اور ملی مسائل ہیں اُن سے انہیں گہری دل چسپی ہے، وہ انہیں اجتماعی طور پر تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اسی لئے اُن کا نقطۂ نظر ہر جگہ قومی اور اجتماعی ہوتا ہے۔ انفرادی معاملات کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کے نزدیک وہی افراد زیادہ قابل قدر اور لائق ستائش ہیں جن کا زاویہ نظر قومی ہوتا ہے اور جو انفرادی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ مذہب سے بھی انہیں دل چسپی ہے۔ اُن کے نزدیک وہ انسانی فطرت اور مزاج میں داخل ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک خیر کی قدروں کا علم بردار ہوتا ہے، اور کوئی قوم اُس کے سہارے صحیح راستے پر گام زن ہوتی ہے۔ سائنس کی ترقی اور عقلیت کے فروغ سے بھی مذہب کی روشنی ماند نہیں پڑ سکتی لیکن اُن کے خیال میں سائنس کی ترقی بھی انسانی زندگی کے ارتقا کے لئے لازمی

ہے اس لئے مذہب اور سائنس کو بہ یک وقت فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کی حیثیت ایک میان میں دو تلواروں کی نہیں ہے۔ مذہب تہذیب نفس کے لئے ضروری ہے اور اس اعتبار سے تمام مذاہب میں اسلام کو فوقیت حاصل ہے، لیکن مذہب کو انسانی زندگی کے لئے ضروری سمجھنے اور خود مذہبی ہونے کے باوجود وہ طبیعت اور مزاج کے خشک نہیں ہیں، ان کے یہاں تو بڑی شگفتگی اور شادابی ہے اور وہ غضب کا احساس مزاح رکھتے ہیں، اُن کے پاس ایک رچا ہوا ذوقِ جمال ہے اور وہ حسن کے پرستار ہیں، اس حسن کی تلاش ان کے یہاں برابر جاری رہتی ہے، زندگی اور ادب دونوں میں وہ حسن کو تلاش کرتے ہیں، اس کا اثر اُن کے مزاج اور طبیعت پر بھی ہوتا ہے اور اسی لئے اس میں اس حسن کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے شگفتگی سب سے زیادہ نمایاں ہے، اُن کی شگفتہ مزاجی کی مثالیں اُن مقدمات میں جگہ جگہ بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

ان مقدمات سے ان کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ذہانت اُن کی ایک ایک بات میں معنویت کی تجلیاں بھر دیتی ہے۔ اسی ذہانت کی بدولت وہ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتِ حال اُن پر بغیر کسی کوشش و کاوش کے روشن ہو جاتی ہے، اس ذہانت کو اُن کا عالمانہ رنگِ طبیعت چار چاند لگا دیتا ہے، اور وہ اس کے لئے سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ذہانت کے ساتھ علمیت کا یہ امتزاج جو مولوی صاحب کی شخصیت میں اتنا نمایاں ہے اُس کی مثال کہیں اور ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج ہی نے بابائے اردو کی شخصیت میں تنقیدی شعور کو اُبھارا ہے اور اسی لئے وہ زندگی و ادب دونوں کے بہت اچھے نقاد نظر آتے ہیں۔ غرض مولوی صاحب کی شخصیت کے اُن تمام پہلوؤں کی جھلکیاں اُن کے ان مقدمات میں جگہ جگہ نمایاں ہیں اور

اس آئینے میں اس شخصیت کی عظمت کو پوری طرح بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔
یہ مقدمات اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں مقدمہ نگاری ایک مستقل فن کا روپ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کو ایک فن بنا دینا مولوی عبدالحق صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدمات بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ لکھے گئے ہیں، ان کا مقصد محض کسی مصنف یا کتاب کا معمولی سا تعارف نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت کا مکمل اظہار ہے۔ اسی لئے بابائے اردو کے بیشتر مقدمات مفصل ہیں، اُن میں تفصیل و جزئیات ہے۔ وسعت اور پھیلاؤ ہے، گہرائی اور گیرائی ہے یہ خصوصیات ان مقدمات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اور انہیں کی بدولت یہ مقدمات ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بابائے اردو کے ذہن میں مقدمہ نگاری کا ایک واضح تصور ہے اور وہ مقدمے لکھتے وقت اس تصور کو بہرصورت اپنے سامنے رکھتے ہیں، اس تصور کو عملی صورت دینا ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور اپنے مقدمات میں اُس کو عملی صورت دیتے ہیں، اُن کے مقدمات کی تکنیک یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو کتاب کے مصنف یا مؤلف کا تعارف کراتے ہیں۔ اس تعارف میں اُس کی زندگی کے حالات کا بیان اور اُس کے کردار کی تصویر کشی اُن کے پیش نظر رہتی ہے، اسی ضمن میں وہ اُس کی مختلف تصانیف پر اختصار کے روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح کتاب کے مصنف یا مؤلف سے پڑھنے والے کو پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ حالات، سیرت اور تصانیف کے اس بیان میں وہ صرف عام باتوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اس سلسلے میں تلاش و جستجو کے بعد نئے مواد کو پیش کرتے اور اس میں نئے نکتے پیش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ

اُن کے مقدمات میں بعض مصنفین کے متعلق ایسی معلومات ملتی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ بڑی خوبی اُن کی یہ ہے کہ حالات کے بیان کو وہ سیرت نگاری کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ سیرت نگاری میں بابائے اُردو کو کمال حاصل ہے۔ اس لئے حالات اور سیرت کی یہ ہم آہنگی اُن کے مقدمات کے اس حصے کو بلا کا دل چسپ بنا دیتی ہے اور پڑھنے والے کو اس میں ہلکے پھلکے ادب کا سا لطف آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات پر اُن کے مقدمات میں جذبے اور تخیل کی آمیزش ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کو نمایاں کرتی ہے۔

حالات اور سیرت پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ زیر نظر تصنیف یا تالیف کا تعارف کراتے ہیں اور اس سلسلے میں پہلے تو یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ کیوں اور کس طرح لکھی گئی اور پھر اُس کے موضوع کا خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔ چناں چہ اس خاکے سے کتاب کا ایک خلاصہ سامنے آجاتا ہے اور اُس کے موضوع سے پوری طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس کی ادبی، فنی اور لسانی حیثیت پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اس بحث میں اُن کا زاویہ نظر ہمیشہ تحقیقی اور تنقیدی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس بحث سے کتاب کے فنّی اور جمالیاتی پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں اور آخر میں وہ ان مباحث سے بعض نتائج نکال کر علم و ادب میں اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کا مقدمہ کتاب کا ایک مکمل تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بن جاتا ہے اور پڑھنے والے کو اس سے بڑی روشنی حاصل ہوتی ہے، وہ کتاب سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیتا ہے، اور پھر کتاب کو پڑھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا بلکہ ایسی موانست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اجنبیت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور رجحانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی مقصد سے یہ مقدمات

لکھے بھی گئے ہیں۔ ان کا مقصد محض تحقیق اور علمیت کا اظہار نہیں ہے، صرف تنقید اور تبصرے کا خیال ہی ان کا محرک نہیں ہوا، بلکہ مصنف، مؤلف اور کتاب کا ایک مکمل تعارف جس سے لکھنے اور پڑھنے والے کے درمیان ایک موانست پیدا ہو جائے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح آشنا ہو جائیں۔ اسی بنیادی خیال نے مقدماتِ عبدالحق میں وہ تکنیک پیدا کی ہے جس نے ان کی مقدمہ نگاری کو ایک فن بنا دیا ہے۔

مقدمہ نگاری کے اس فن میں مولوی صاحب کے اسلوب بیان اور اندازِ نگارش کو بھی نمایاں مرتبہ حاصل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اس اسلوب نے ان مقدمات کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔

یہ مقدمات جو اتنے دلچسپ نظر آتے ہیں اور اس قدر دلکشی کا احساس ہوتا ہے، اس کا سبب ان کا اسلوب ہے۔ اسی اسلوب نے ان میں وہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو تخلیقی ادب میں پائی جاتی ہیں۔ مولوی صاحب کا اسلوب صاف اور سادہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے انداز میں سوچتے ہیں، ان کے افکار و خیالات میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے، اسی لئے اسلوب میں بھی کوئی پر پیچ کیفیت نظر نہیں آتی وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اور جو کچھ سوچتے ہیں، اس کو سادہ اور آسان زبان میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں ایک فطری روانی اور بہاؤ اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے، اُس میں کسی قسم کی کاوش کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیتے، کیوں کہ تکلف اور تصنع تو اُن کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسلوب میں آرائش و زیبائش کا شائبہ تک نہیں ہوتا، وہ سجا سجایا نہیں ہے، لیکن اُس میں باقاعدگی اور سلیقہ ضرور ہے اور اسی باقاعدگی اور خوش سلیقگی ہی میں

اس کا حسن ہے۔ اس حسن کا زیور سادگی ہے اور اسی سادگی میں اُن کے یہاں ایک پُرکاری نظر آتی ہے۔ موضوع اور خیال کی مناسبت سے زبان کے استعمال اور الفاظ کی دروبست کو اُنہوں نے ایک فن بنا دیا ہے اور اُن کے اسلوب کی یہ نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ مقدمات کی یہ چند عبارتیں اُن کے اسلوب اور اندازِ نگارش کی بنیادی خصوصیات کو پوری طرح واضح کرتی ہیں :۔

"جن ملکوں میں انتہا سے زیادہ آزادی ہے اور جہاں انتہا سے زیادہ پابندی ہے اُس کا رونا دونوں جگہ یکساں ہے مگر ملک میں تو غضب یہ ہے کہ ماں باپ لڑکے کی کچھ پیش نہیں جانے دیتے، وہ آنکھ بند کر کے انہیں کنویں میں دھکیل دیتے ہیں اور جب گرنے کی دھم سے آواز آتی ہے تو اس پر تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے اور خوشی مناتے ہیں اور اس قدر غل غپاڑہ مچاتے ہیں کہ اُن کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔"

(مقدمہ تجرد و ازدواج)

"شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا۔ ایک آدھ محاورہ آگیا۔ کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا، رہا مضمون سو خدا کے فضل سے اُس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے۔"

(مقدمہ گلشنِ ہند)

"خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولٹیکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے اسی طرح اُنہوں

نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا، بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا اور صلح جوئی، آزادی، بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔"

(مقدمۂ معرکۂ مذہب و سائنس)

ان عبارتوں میں کیسی شگفتگی اور شادابی ہے، کس غضب کی سادگی اور صفائی ہے، یوں تو یہ عبارتیں سیدھی سادی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ایک حسن نظر آتا ہے اور یہ حسن اُن کی سادگی اور صفائی، روانی اور بہاؤ، ترنم اور نغمگی، بے ساختگی اور برجستگی، زبان اور الفاظ کے استعمال کی خوش سلیقگی میں ہے،

ان عبارتوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔ ان میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان میں گہرائی ہے لیکن اس سنجیدگی اور گہرائی کے باوجود یہ شگفتہ اور شاداب ہیں، ان میں لکھنے والے کی ذہانت جگہ جگہ گل بوٹے سے کھلاتی ہے اور اس کے مزاج کی لطافت اور طبیعت کی شگفتگی کہیں بجلیاں سی چمکاتی ہے، اسی لئے ان کا اثر ہوتا ہے، یہ دلوں میں جگہ بناتی ہیں — بابائے اُردو کے مقدمات اس قسم کی شگفتہ اور شاداب عبارتوں سے بھرے پڑے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان مقدمات میں شروع سے آخر تک یہی اسلوب پایا جاتا ہے جس کی جھلک یہ عبارتیں دکھاتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اسی اسلوب نے ان مقدمات کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اردو ادب میں یہ مقدمات ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس

اعتبار سے اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان سے قبل اُردو میں مقدمہ نویسی کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ کتابوں پر صرف تقریظیں لکھنے کا رواج تھا۔ ان تقریظوں میں صرف مداحی ہوتی تھی اور لکھنے والے الفاظ کے ساتھ کھیلتے تھے۔ صداقت ان میں ناپید تھی۔ خلوص نام کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان حالات میں یہ مقدمات لکھے گئے اور مولوی صاحب نے ان کی طرف ایسے خلوص، انہماک اور جذب و شوق کے ساتھ توجہ کی کہ انہیں ایک مستقل فن بنا دیا، اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی کیوں کہ بہر حال یہ مقدمے مقصد نہیں، ذریعہ تھے۔ چناں چہ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ مسلم ہو گیا اور فنّی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی انہوں نے اپنی جگہ بنالی۔

کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں جن سے صرف کسی مصنف، مؤلف یا کتاب کے تعارف کی توقع کی جاتی ہے لیکن درحقیقت یہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے ہیں جن میں تاریخی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، لسانی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس بحث سے ان موضوعات کے تقریباً تمام اہم اور پیچیدہ پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان میں نئی معلومات ہیں، نیا تحقیقی شعور ہے، نئی تنقیدی بصیرت ہے۔ اسلوب کی نئی جمالیاتی شان ہے اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے ان مقدمات کو اس رنگ و آہنگ سے آشنا کر دیا ہے جس میں ان کی فنّی انفرادیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

عبادت

۱۴

سیّد حیدر بخش حیدری

مُختصر کہانیاں

فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں میں سیّد حیدر بخش حیدری بلاشبہ سب سے زیادہ اہمیّت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح تالیف و ترجمہ کا کام ہی نہیں کیا ہے۔ طبعزاد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ اُن کی تصانیف میں سب سے اہم وہ مُختصر کہانیاں ہیں جن کو ابھی تک اشاعت کی منزل سے ہم کنار ہونا نصیب نہ ہوا۔ یہ کہانیاں نہ صرف اُردو کی آسان اور سادہ ادبی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں بلکہ مختصر افسانے کی فنّی روایت میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اس اعتبار سے یہ کہانیاں

حیدری کو نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کا نثر نگار بلکہ اُردو مختصر افسانے کا اوّلین تخلیقی فن کار ثابت کرتی ہیں۔

سیّد حیدر بخش حیدری دِلّی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے بزرگ نجف اشرف سے دلّی میں آئے اور اسی سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا۔ حیدری دلّی ہی پیدا ہوئے۔ لیکن ابھی سن شعور کو بھی نہ پہنچے تھے کہ اُنہیں وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ اُن کے والد سید ابوالحسن گردشِ روزگار سے پریشان ہو کر دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور انہیں ملازمت کے سلسلے میں لالہ سکھ دیو رائے کے ساتھ بنارس جانا پڑا۔ اُنھوں نے یہیں اقامت اختیار کر لی۔ اس لئے حیدری کا بچپن اور عنفوانِ شباب اسی سرزمین پر گذرا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کے مؤلّف نواب علی ابراہیم خاں خلیل بنارس میں عدالت کی ججی کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اُنھوں نے حیدری کے جوہرِ قابل کو پہچانا، اور اُن کی تعلیم و تربیّت میں دلچسپی لی۔ خلیل نے انہیں قاضی عبدالرشید اور مولوی غلام حسین غازی پوری کے سپُرد کیا، اور ان بزرگوں سے حیدری نے عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارویں صدی کی آخری تاریخوں میں وہ کلکتہ پہنچے، اور جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ وہاں اُردو کے پروفیسر مقرّر ہوئے تو حیدری نے قصّہ مہر و ماہ اُردو میں لکھ کر اُن کو پیش کیا۔۔ ڈاکٹر گلکرسٹ اُن کی اِس تالیف سے متاثر ہوئے اور اُن کے توسّط سے اُنھیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت مل گئی۔ اُنھوں نے اپنا بیشتر ادبی کام اسی کالج میں کیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کے کام سے گہری دلچسپی لی اور وہ انہیں کے ایما پر اپنی بیشتر کتابیں تالیف کرتے

رہے۔ ۱۸۱۴ء میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوکر بنارس واپس آئے اور یہیں ۱۸۲۳ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

سید محمدؔ نے ارباب نثر اردو میں لکھا ہے ـــــ

"یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں کب تک ملازم رہے اور کس سنہ میں وہاں سے علیحدہ ہوئے، اتفاق سے تذکرۂ ریاض الوفاق مؤلفہ ذوالفقار علی مستؔ میں جو ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا اور جس میں کلکتہ اور بنارس کے فارسی گو شعرا کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ حیدریؔ کے متعلق دو فقرے نظر پڑے مستؔ کا بیان ہے کہ حیدری ۱۲۲۹ھ میں بنارس میں تھے اور وہ کچھ عرصے تک فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر بخش ۱۲۲۹ھ سے بہت پہلے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ جس کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان کی تاریخ وفات بھی صرف ایک زبانی بیان کی بنا پر ۱۸۲۳ء قرار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے منشی غلام حیدر کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ حیدر بخش نے سنہ مذکور میں وفات پائی۔ منشی غلام حیدر حیدر بخش کے دوست اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ چونکہ اُن کے بیان کے علاوہ اور کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت یہی سنہ قابل قبول ہے۔

حیدری نے اپنی غیر مطبوعہ تحریروں میں اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے۔ اُس سے اُن کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے

اُن کی ان تحریروں سے چند اقتباسات کا پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

احوال اس سید حیدر بخش حیدری شاہجہاں آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سید ابوالحسن والد اس فقیر نے دلّی چھوڑی اور ہمراہی لالہ سُکھ دیو رائے کی قبول کی تو بنارس میں تشریف لائے اور پیچھے دِلّی کے قصداول سے بُھلائے۔ اس وقت یہ ہیچ مداں نہایت خورد سال تھا لیکن زیر سایہ قبلہ وکعبہ کے آفاتِ فلکی سے ازبس کہ بے خطر تھا۔ اس میں بھی مشتاقِ اہلِ کمال تھا۔ چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی۔ اور اس فقیر کی بھی عمر حد بلوغیت کو پہنچی۔ اس عرصے میں امین الدولہ عزیزالملک نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل انشیٹن صاحب بہادر جلالت جنگ کے حاکمی بنارس کی قبول کرکے، ساتھ عزّ و وقار کے مسندِ عدالت پر بیٹھے تو قبلہ گاہی نے اس قدر دان بُجیا کی نوکری پر دل دیا۔ اور اس کمترین کو واسطے تربیت اور خوشہ چینی کے اُس خرمنِ سُخن کے سُپرد کیا — چنانچہ اس فقیر کو خدمت گذاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب دام اقبالہ کی پسند آئی اور شاگردی قبلہ وکعبہ کو نین مولوی غلام حسین کی بھائی۔ بیت

بہت سی میں نے یاں کی جبہ سائی جب ایسی گفتگو یہ مجھ آئی

اور صحبت سے نخل بند چمنِ دوستی سیّد جمعیت علی رضوی کی بھی اس عندلیب ہیچمداں نے موافق اپنی فہم کے بہت سی کیفیت

اُٹھائی ہے۔ لیکن افسوس کہ گردش فلکی نے اس گُلبن باغ مرتضوی سے نصیب کی جُدائی ہے۔

حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گذاری سے بزرگوں کی اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فُرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اُسے جمع کرتا۔ اب سنہ ۱۲۱۵ھ عنایات و تفضلات سے صاحبانِ عالیشان والا خاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے ایک صورت اطمینان کی ہے، اور مفارقت میں یارانِ قدیم اور دوستانِ صمیم کی اوقات یوں ہی گذرتی ہے۔ اس واسطے چند قصّے زبانِ ریختہ ہندی میں موافق اُردوئے مُعلّٰی کے نثر کئے گئے — جیسے قصّہ حاتم طائی اور "مہر و ماہ" کا قصّہ اور طوطی نامہ بخشی اور قصّہ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسروؒ دہلوی، مُرید حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے — اور چند اشعارِ پریشاں اور کئی مخمس و چند قطعے جو اس ہیچ مداں نے تصنیف کئے سوا احاطۂ تحریر میں آئے۔"

دیباچہ گلدستۂ حیدری (غیر مطبوعہ)

حمد کرتا ہوں اُس بادشاہ قادر بے چوں کی کہ جس نے اپنی قدرت کبریائی سے سلطان مہر و ماہ کو اوپر تخت فلک بے ستوں کے ساتھ ندیمان سیاروں کے جلوہ گر کیا اور فیضانِ جمال بے مثال وحدانیت سے ہیژدہ ہزار عالم کو مخلوق کر کے اپنی عنایات صمدیت سے خصوصاً خلقتِ انسان کو اشرف المخلوقات خطاب دیا۔ اور خلعت انواع انواع حسن و جمال کے دے کر سرفراز کیا اور جاگیر اپنے عشق کی عطا کر کے عاشق و معشوق نام رکھا۔ کیا خدا ہے جلّ جلالہٗ

وعم نوالہ — اور نعت ہے اُس رسول مقبولؐ کی کہ جس کو اُس واحد ذوالجلال نے اپنے فضل وکرم سے افضل البشر و خاتم الانبیاء کیا — اور اُس کے واسطے زمین وآسمان کو پیدا کرکے لولاک لما خلقت الافلاک خطاب دیا۔ صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ وسلّم — اور مدح ہے اُس حیدرؓ شہ سوار لافتا ساقیٔ حوضِ کوثر کی کہ جو حامیٔ روزِ جزا ہے اور دامادِ مصطفےٰ ہے — اور مدح ہے اُن گوہر دریائے رسالت کی کہ سرورِ سینۂ طہرائے اطہر ہیں اور شفیع روز محشر صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ واجمعین۔

پس اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو سنہ ۱۲۱۴ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبانِ عالیشان گفتگوئے اُردوئے معلےٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں اور اہلِ سخن کو از راہِ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں — خصوصاً صاحب والا مناقب عالی مقام صدر نشینِ محفل اہلِ کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کہ جو بحرِ سخن وری وسخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں، اور موجدِ کلام شیریں سُخنی کے سرچشمہ سخن وراں ؎

به دل دریا به کف چوں ابر نیساں — جہاں ہے فیض سے جس کے دُرافشاں
نہ ہوں اُس کی شجاعت کے مقابل — اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اُس کی سخاوت کی جو تعریف — وہیں ہو صفحۂ کاغذ زرافشاں
ہے اُس کا نامِ نامی گلکرسٹ اب — جہاں ہے مہر جو دُس کے سے تاباں

دُعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دنیا میں خوش یارب وہ ہر آں

اس واسطے یہ دلِ مُضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغِ فصاحت و بلاغت

سے تیار کرکے واسطے نذر پُرنور اُس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے، یقین ہے کہ منظور نظر ہوئے۔ اور اگر کہیں اُس کی عبارت میں نامربوطیٔ الفاظ دکھائی دیوے تو اُس کی دُرستگی کے واسطے باغبان خامہ وزباں کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے۔ بہ حق محمدؐ و آل محمدؐ۔

قطعہ ؎

مُنصفو! مُنصفی کی جا ہے یہ ۔۔۔ میری محنت کی داد ٹک دیجیو
قصّہ مہر و ماہ کو میں نے ۔۔۔ نثر کیوں کر گیا ہے دیکھو تو"۔

قصّۂ مہر و ماہ (غیر مطبوعہ)

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلویؒ مُرید حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اُس حقیقت آگاہ نے تالیف کی ہیں۔ اور ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ مجنوں کا جو لکھا ہے سو اُس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے اور ہاتفی نے بھی اُس قصّہ دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا اور عبارتِ فصیح سے اُسکے ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا اور اس قصّہ کو خواجہ لیسین شاہجہاں آبادی، کہ شاعری میں یکتائے عصر ہیں، اور بالفعل مسندِ حیات پر جلوہ گر ہیں، بہ موجب فرمائش اطہر علی خاں مرحوم کہ مسٹر چیمبرز صاحب نے حکیم موصوف سے درخواست اس قصّے کی نظم ہندی میں کی تھی، خواجہ ممدوح نے زبان ریختۂ ہندی میں حقیقت اُس کی سابق سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بہ طور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ھ بارہ سے پندرہ ہجری

مطابق ۱۸۰۱ء اٹھارہ سے ایک عیسوی دستہ پنیتالیسواں جلوس
بادشاہ موصوف سے ہے جناب صاحب عالیشان، پشت پناہ
سخن سنجاں، بحر ہمت، گوہر مروت، کوہ حشمت، مخزن سخاوت،
اعلیٰ دودمان، جان گلکرسٹ صاحب بہادر زادا فضالہٗ نے
اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چین خرمن علم
کونین مولوی غلام حسین غازی پوری مولوئ عدالت نواب علی ابراہیم
خاں بہادر مرحوم حاکم بنارس، کو فرمایا کہ تو اس قصۂ پرسوز ہندی
کو بیچ زبان ریختۂ اُردوئے معلّیٰ کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی
کے نثر کر اور احاطۂ تحریر میں لا، کیونکہ عبارت سلیس مفید ہے۔
اُن صاحبوں کو کہ جو بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں۔ اُن کی
درستگی زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت
نظر نہیں آئی۔ چنانچہ اس کمترین ہیچ مداں نے موافق اپنی طبع کے
زبان محاورہ اُردوئے معلّیٰ کے قصۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔
اور ہر ایک صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمے
کو بچشم فیض اثر سے دیکھے، اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے
تو لازم ہے کہ وہ اپنی دستگیریٔ قلم غلط بردار سے اُس حرف
اُفتادہ کو صفحۂ غلط سے اُٹھالے اور اجر اُس کا اُس کو دونوں

جہان میں خدا دے ؎

کمیت خامہ کو میں نے اُٹھا کر — کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصّۂ لیلےٰ و مجنوں — سُنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں

(قصّۂ لیلیٰ مجنوں (غیر مطبوعہ))

اِن بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سید حیدر بخش حیدری نے بنارس میں ہوش سنبھالا اور نواب علی ابراہیم خاں خلیل، مولوی غلام حسین، قاضی عبدالرشید خاں اور سید جمیعت علی رضوی کے زیر سایہ اُن کے ادبی ذوق کی نشوونما ہوئی۔ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی شخصیت اس کام میں ہمیشہ اُن کی معاون رہی۔ اُنھوں نے اپنا بیشتر ادبی کام انہیں کی فرمائش پر کیا۔ اپنی تصانیفِ نثر کے علاوہ نظم میں بھی اُنھوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل قطعہ اُن کی تعریف میں لکھا ہے ؎

گلکرسٹ صاحب وہ ہے عادل زماں
خوشہ چیں ہو اُس کا اب نوشیرواں

کیوں نہ وہ حاکم ہو ہفت اقلیم کا
چاکری کرتا ہے جس کی آسماں

خامہ ہو جاوے وہیں زرّیں رقم
گر لکھوں اُس کی سخاوت کا بیاں

زیرِ دست اُس کے ہو انبارِ طلا
گر ہو اک ذرّہ کسی پر مہرباں

کھل گئے اُس کی نسیم خلق سے
غنچۂ امید دل ہائے جہاں

ایک نگاہِ لطف اُس کی حیدری
تجھ کو مستغنی کرے گی بے گماں

دیوانِ حیدری (غیر مطبوعہ)

حیدری کی سب سے پہلی تالیف 'قصۂ مہر وماہ' ہے جس کو انہوں نے ۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۰ء میں مکمل کیا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کے سامنے پیش کر کے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی۔ اُن کی دوسری کتاب لیلےٰ مجنوں ہے جس کو انہوں نے ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں لکھا۔ یہ حضرت امیر خسروؒ کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ ان دونوں کے بارے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ یہ ضائع ہو گئی ہیں اور ان کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا لیکن ان کے قلمی نسخے مجھے آکسفورڈ میں ملے اور اب انشاء اللہ یہ جلد شائع ہوں گی۔

اِن کے علاوہ طوطا کہانی، آرائش محفل، تاریخ نادری، گُل مغفرت اور گُلزار دانش بھی اُن کی مشہور کتابیں ہیں۔

طوطا کہانی محمدؐ قادری کی فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں لکھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے دیباچہ میں خود لکھا ہے۔

"بہ موجب فرمائش صاحب موصوف (ڈاکٹر گلکرسٹ) کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء نخشی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوئے معلّٰی کے عبارت سلیس وخوب، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔"

یہ کتاب ۱۸۰۲ء عیسوی میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی اور پھر بار بار چھپی۔ ڈاکٹر ڈنکن فوربس نے لندن سے بھی ۱۸۵۳ء میں اس کو شائع کیا انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔

آرائش محفل میں حیدری نے حاتم طائی کی داستان کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی سے اُردو میں منتقل کی گئی لیکن یہ فارسی کی داستان سے کسی قدر مختلف ہے۔ کیونکہ حیدری نے اس میں اضافے بھی کئے ہیں۔ دیباچے میں انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"۱۸۰۱ء کے موافق اور سنِ جلوس پینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق، زبانِ ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی، ترجمہ نثر میں کیا اور اُس کا نام 'آرائش محفل' رکھا۔ مگر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں اور مُناسب پایا، وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قِصّہ طولانی ہو جائے اور سُننے والوں کو خوش آئے۔"

یہ کتاب بھی فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۳ء میں شائع کی گئی اور پھر مختلف مقامات سے اس کے متعدد ایڈیشن چھپ کر شائع ہوتے رہے۔

تاریخ جہاں کشائے نادری کو بھی حیدری نے اُردو میں منتقل کیا اور اس کا نام 'تاریخ نادری' رکھا۔ فارسی کتاب کے مؤلف مرزا محمدؐ مہدی استر آبادی ہیں اور اُنہوں نے اس میں نادر شاہ کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کو حیدری نے ۱۲۲۴ھ نے ۱۸۰۹ء میں مکمل کیا۔ اس کا ابھی تک کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ غالباً یہ شائع نہیں ہوئی۔

گُلِ مغفرت ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء کا اُردو خلاصہ ہے اس میں شُہدائے کربلا کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ حیدری نے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی سید حسین علی

جون پوری کی فرمائش پر ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں لکھی۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

صاحبانِ دردو غم و مُبتلایانِ رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے
کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشنِ شہیداں سے جس کو پہلے
روضتہ الشہداء سے زبانِ ریختہ میں ترجمہ کرچکا تھا۔ اب شہر
محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب
فیض مآب گل گلزار معانی، شمعِ بزم نُکتہ دانی، بحر سیادت و امانت،
سرو جوئبار گلشنِ شرافت و نجابت مولوی سید حسین علی صاحب
جون پوری زاد الطافہٗ کے ارشاد کرنے سے، جن کی خدمتِ فیض
درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخِ دلی نہ نیاز باطنی ہے۔
اس نسخۂ وہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اُس کا گُلِ مغفرت رکھا۔
اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گذرے۔ بحق
محمد و آلہ الامجاد“

گل مغفرت ۱۸۱۲ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔ اس کے تقریباً تمام مطبوعہ نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی فارسی کتاب بہار دانش کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کو حیدری نے کس سنہ میں لکھا اور یہ کب شائع ہوئی۔

ان کتابوں کے علاوہ سید حیدر بخش حیدری کی مختلف غیر مطبوعہ تحریروں کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ کے

کے کتب خانوں میں ہیں۔ جن میں اُن کی چھوٹی بڑی کہانیوں کے علاوہ غزلوں کا دیوان اور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ شامل ہے۔ یہ مجموعہ اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں آنے کے بعد میر بہادر علی حسینی کی دستگیری سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس کے اختتامیہ میں لکھتے ہیں :۔

اور یہ جلد دو چار جزکی جو کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامیٔ بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دُنیا میں خوش و خرّم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مُشکل کشا کرے! بحق محمد و آلہ او مجاد۔

اس کا نام اُنھوں نے گلدستۂ حیدری' رکھا۔ چنانچہ دیباچے میں اپنے حالات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گذاری سے بزرگوں کی اور فرمانبرداری یہ دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا آپ بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفضّلات سے صاحبان عالی شان والاخاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی ایک صورت اطمینان کی ہے۔ اور مفارقت میں یارانِ قدیم اور دوستانِ صمیم کی اوقات یوں ہی گذرتی ہے اس واسطے چند قصّے زبانِ ریختۂ ہندی میں موافق اُردوئے مُعلّٰے کے نثر کیئے گئے، جیسے قصّہ حاتم طائی، اور مہر و ماہ کا قصّہ اور طوطی نامہ بخشی اور قصّہ لیلےٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسروؒ دہلوی مُرید

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خمسے میں لکھا ہے،
لکھے گئے — اور اس مجموعۂ بے سررشتہ و بے محاورہ کو جو
اس بے سروپا نے جمع کیا ہے، نام اُس اوراقِ پریشاں کا
گلدستۂ حیدری رکھا۔

ان دونوں نسخوں میں مجھے حیدری کی ایک سو اسی مختصر کہانیاں ملیں۔
ان مختصر کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نہ صرف
اُردو کی ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ مختصر افسانے کی فنّی روایت میں بھی
بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان میں مختصر افسانے کے فن کی جھلکیاں
واضح طور پر نظر آتی ہیں — ان کے موضوعات زندگی کے عام معاملات
سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی بُنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں۔
ان میں سے اکثر میں وحدتِ تاثر کا پہلو بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے —
تہہ داری اور رمز و ایما کی خصوصیت بھی ان میں سے اکثر میں موجود ہے
— ان کا مواد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے
اسی لئے ان میں زندگی کے جذباتی اور ذہنی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل
فن کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں — اور یہی ان کی سب
سے بڑی خوبی ہے۔

میں نے ان مختصر کہانیوں کو اُن کی ادبی اہمیت اور فنّی قدر و قیمت
کے پیشِ نظر مرتب کیا اور اب یہ شائع کی جا رہی ہیں۔ ان میں بعض کہانیاں
فحش ہونے کی وجہ سے مذاقِ لطیف پر گراں گزرتی تھیں۔ میں نے ایسی
کہانیوں کو اس مجموعے سے خارج کر دیا ہے۔ اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں
کی ہے۔ سوائے اس کے کہ پیراگراف بنا دیئے ہیں اور مکالموں کی وضاحت

کر دی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدری کی یہ معاصر کہانیاں جو اس وقت شائع کی جا رہی ہیں نہ صرف اُردو ادب کے طالب علموں، نثر اُردو کے پرستاروں، فن افسانہ نگاری کے شیدائیوں بلکہ عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان فراہم کریں گی۔

عبادت

شعبۂ اُردو و ثقافت پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۵ جولائی ۱۹۶۴ء

مظہر علی خاں ولاؔ کی یہ تالیف (مادھونل اور کام کنڈلا[1]) دراصل موتی رام کبشیر کی برج بھاشا میں لکھی ہوئی کہانی سے ماخوذ ہے۔ ولاؔ نے اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں اُردو کا جامہ پہنایا۔ چنانچہ حمد و نعت کے بعد دیباچے میں لکھتے ہیں :-

---

[1] مادھونل اور کام کنڈلا (قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

" بعد اس کے اضعف العباد احقر الناس مظہر علی خاں
متخلص بہ ولاؔ یہ قصہ مادھونل اور کام کنڈلا کا، کہ زبان برج
میں موتی رام کبشیر نے کہا ہے، بموجب فرمائش جناب گل کرسٹ
صاحب دام اقبالہ کے بہ محاورۂ زبان اُردو بیان کرتا ہے"[۱]
اور آخر میں اس کی تکمیل کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں :-
الحمد و للہ کہ یہ رنگین دلچسپ داستان تاریخ دسویں ذیقعدہ
کی ۱۲۱۵ھ مطابق بسنہ ۱۸۰۱ء میں مع دو تاریخ، ہجری و عیسوی
کے تمام ہوئی۔

ابیات ؎

جو کہتے ہوں باتیں بنا عشق کی تو سُنتے کہانی ذرا عشق کی
ہے رنگیں و مطبوع و دلکش تمام لکھی داستاں یہ ولا عشق کی
کہ تاریخ یہ ہے زروئے بیاں کہی من لگن سب کتھا عشق کی
ردیف و قوافی بدل اور بھی ولاؔ کہہ یہ آئی ندا عشق کی

سنہ عیسوی کے مطابق تمام جو اعداد تاریخ چاہے جیب
سرجہل کر دور اور دیکھ لے فسانہ ہے یکسر عجیب و غریب[۲]

اس سے قبل یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔ صرف ڈاکٹر گل کرسٹ
نے اپنی بیاض ہندی میں اس کے کچھ اقتباسات چھاپے تھے۔ مولانا حامد حسن
قادری داستان تاریخ اُردو میں لکھتے ہیں۔
"مادھونل اور کام کنڈلا قدیم ہندی زبان کے قصہ (مُصنّفہ

---

[۱] [۲] مادھونل اور کام کنڈلا (قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

موتی رام کبیشر) کا اُردو ترجمہ ہے۔ ولانے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ عیسوی میں مرتب کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے انتخاب بیاض ہندی میں اس کا ایک حِصّہ چھاپا تھا۔ پوری کتاب نہیں چھپی"!

مجھے اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں ملا۔ یہ حُسین علی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۰۱ء کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر J. C. HAUGHTON کے دستخط ہیں اور اس کے نیچے فروری ۱۸۱۸ء تاریخ درج ہے۔ غالباً یہ نسخہ بھی ہفت گلشن، کی طرح اسی شخص کی ملکیت تھا اور عرصے تک اُس کے پاس رہا۔ برٹش میوزیم نے اس کو سر ٹامس ریڈ مرحوم سے ۲۸ جنوری ۱۸۰۲ء کو خریدا۔ چنانچہ اس کے آخری صفحے پر انگریزی کی یہ عبارت ملتی ہے۔

PURCHASED OF SIR THOMAS READE LATE. 28 JANUARY 1852

چونکہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی، اور اس کے قلمی نسخے کا بھی بہت کم لوگوں کو علم ہے، اس لئے اس کو اب نئی ترتیب کے ساتھ مع ایک مقدمے کے شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت

شعبۂ اُردو وثقافت پاکستان

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز

یونیورسٹی آف لندن

۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء

لہ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اُردو ۱۱۶

مظہر علی خاں ولا فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا مرتبہ میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا علی لطف، مرزا کاظم علی جوان، میر شیر علی افسوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ایک بلند پایہ نثر نگار تھے۔ لیکن نہ تو اُن کا دیوان چھپا نہ وہ کتابیں شائع ہوئیں جو اُنہوں نے نثر میں لکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی ادبی دنیا میں ابھی تک اُن کا مرتبہ متعین نہ ہو سکا ہے اور لوگ اُن کے صحیح مقام کو پہچان نہیں سکے ہیں۔

مصحفی، شیفتہ اور بینی نرائن جہاں نے اُن کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ یہ سب کے سب اُن کی عزت کرتے ہیں اور اُن کی اہمیت سے پوری طرح آشنا ہیں۔

مصحفی لکھتے ہیں :۔

"مظہر علی خاں ولا تخلص عرف مرزا لطف علی خلف سلیمان علی خاں وداد، جوان حلیم و سلیم بہ مقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے خیال شعر ہندی می کند و بہ نام پدر بزرگوار خود ہر جا فروختہ می شود۔ استفادۂ شعرش چندے بہ مرزا جان طپش و چندے

بہ مولف بود۔ حالا بہ میر نظام الدین ممنون کلام خود راہی نماید۔"[1]

"ولا تخلص مظہر علی خاں فرزند سلیمان علی خاں وداد کہ از شعرائے مشہور پارسی است۔ نسبت تلمذ وے بہ میر نظام الدین ممنون کردہ اند۔"[2]

اور بینی نرائن جہاں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :-

ولا تخلص، نام مرزا لطف علی خاں عرف مظہر علی خاں خلف سلیمان علی خاں عرف مرزا محمد زماں وداد ابن محمد حسین بہ خطاب علی قلی خاں، دلّی کے رہنے والے ہمیشہ عمدہ روزگار رہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور اس خاکسار پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں۔"[3]

افسوس ہے مظہر علی خاں ولا کے حالات کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ جن لکھنے والوں نے اُن کے حالات لکھے ہیں اُن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلّی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ کلکتہ میں گذارا اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انہیں شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ مصحفی اور ممنون کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری کا یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے والد سلیمان علی خاں وداد بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ولا کی تعلیم اچھے ماحول میں ہوئی اور انہوں نے عربی، فارسی،

---

[1] مصحفی : تذکرہ ہندی ۲۶۶

[2] شیفتہ : گلشن بے خار : ۲۳۷

[3] بینی نرائن جہاں : دیوان جہاں : ۲۵۸

سنسکرت اور ہندی میں مہارت حاصل کی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو وہ بھی لکھنؤ سے کلکتہ چلے گئے اور وہاں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ اُن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں۔ بینی نرائن جہاں کے تذکرے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء تک زندہ تھے اور کلکتہ میں مقیم تھے۔

ولا نے اپنے آپ کو خود بھی شاعر کہا ہے۔ 'ہفت گلشن' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"مظہر علی خاں شاعر کہ ولا جس کا تخلص ہے، واسطے سمجھنے اور سیکھنے نوآموز صاحبوں کے، بموجب حکم جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ، زبان اُردو میں بیان کرتا ہے۔"[۱]

انہوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے:۔

"ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ مع سوانح عمری مصنف کے ہیں۔ اس کا نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا۔"[۲]

اور سید محمد نے اُن کے دیوان کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے :۔

"ولا صاحب دیوان ہیں اور اُن کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ شاہان اودھ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں اُن

[۱] مظہر علی خاں ولا : ہفت گلشن ۱۹
[۲] عسکری : تاریخ ادب اُردو ۱۴

کے دیوان کا پتہ نہیں چلا۔[1]

ولاؔ کے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سنے
ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر

نہ حاجت کے لئے دست دعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے سچ تو یہ ہے ہاتھ اُٹھاتا ہوں

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا تھی یہ میرے دیدۂ گریاں کے بیچ

یوں ہی گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں
آپ بھی رو دیں گے اک دن منہ پہ دھر کے آستیں
قتل سے میرے نہ منکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیرے سرا سر آستیں
عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں ولاؔ
رنگ زرد و آہ سرد و اشک سے تر آستیں

ہرگز نہ گریں اس سے اشک اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشم تر آلودہ

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اُردو : ۱۶۱

ازبس کہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے گرتے ہیں
آنکھوں سے میرے آنسو لخت جگر آلودہ
واں رشک چمن اُس نے گھر اپنا کیا ہے، یاں
اشک جگری سے ہے دیوار و در آلودہ
اک پل میں گذر جاوے یہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بری ظالم آہ اثر آلودہ
بخش اپنے ولا کو بھی از راہ کرم یارب
ہرچند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

دل کیونکہ نہ ہو اُس بت طرار کے صدقے
ہوتے ہیں سبھی وضع طرح دار کے صدقے
گہہ چشم و گہہ ابرو وگہے چین جبیں کے
گہہ خال کے ہوں گاہ میں رخسار کے صدقے
اک بوسہ تو لینے دے مجھے اپنے لبوں سے
انکار نہ کر میں ترے انکار کے صدقے
اس عشق کے قطرے کو اثر دے مرے یارب
تا ہووے ولا چشم گہربار کے صدقے

ہمدم فقط نہ مجھ ہی کو اُس گل نے غش کیا
آیا جو انجمن میں تو بس گل نے غش کیا

یک قطرہ خون نہیں جگر و دل میں یاں مرے
مجھ کو تو اشک خون کے تسلسل نے غش کیا
عالم نہ سکتے کا ہے فقط اپنا ہی ولا
عالم کو اس کی شان تجمل نے غش کیا

زلفوں میں جا اسی کی دل زار بندھ گیا
چھٹتے ہی آہ پھر نہ گرفتار بندھ گیا
اُس برق وش کی یاد میں رویا ہوں یاں تلک
مینہ کی جھڑی کی طرح سے اک تار بندھ گیا
ہوش و حواس اُڑ گئے فی الفور اے ولا
دل میں خیال یار جو اک بار بندھ گیا

یاد میں اُس کی کون سا دل جو مثل جرس نالاں نہیں
چشم نظارہ کس کی یہاں اب آئینہ ساں حیراں نہیں
ایک نگہ اُس ماہ جبیں کو دیکھا ہے جس نے اُس کا تو
دیدہ گریاں، سینہ ہے بریاں، ہوش نہیں اوساں نہیں
بزم میں اپنی بیٹھ کے ہم کو جو جو کچھ تم کہتے ہو
ہم پر گو ہموار ہوا سب، آپ کے یہ شایاں نہیں
کون سنے ہے، کس کنے جا کر حال دل اپنا عرض کرے
تیرے سوا تو کوئی ولا کا جان نہیں پہچان نہیں
یہ اشعار اعلیٰ درجے کے اشعار ہیں، اور ان سے یہ صاف ظاہر ہے

کہ ولاؔ غزل کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اس فن پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی اور انہوں نے شاعری کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔

مظہر علی خاں ولاؔ نے اپنی کتاب جہانگیر شاہی میں اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں اُس کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

——"حقیر مظہر علی خاں جو سلیمان علی خاں کا چھوٹا بیٹا اور پوتا آقا محمد حسین اصفہانی کا، جس کا خطاب علی قلی خاں تھا، اور پرپوتا آقا صادق ترک کا یہ بیان کرتا ہے کہ۔ جب وہ دونوں بزرگوار ساتھ ساتھ ولایت اصفہان سے شاہجہان آباد میں آئے ——شدہ شدہ آقا محمد حسین نے نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش غفراں پناہ کی وساطت سے سنہ احد میں فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ کا شرف ملازمت اختیار کیا۔ ادر اپنی لیاقت وقابلیت سے یہ رسائی بہم پہنچائی کہ شہنشاہ گیتی ستاں نے ازراہ نوازش ومہربانی حضور کی بائیس خدمتوں سے۔ جیسے خاصہ، بارہ اور کھہری اور گلال باد ادر پیادۂ کرناٹک اور اکثر حلقوں سے اہتمام کے سوا، اور خدمتوں کی داروغگی سے سرفراز کرعلی قلی خاں خطاب عنایت فرمایا—— خان مغفور کی رحلت کے بعد سلیمان قلی خاں عرف مرزا محمد زمان ودادکہ کمالات حمیدہ سے متصف تھا، نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں بہادر جو بہ نواب شہید مشہور ہے، اس کے وسیلے سے اور بہ نظر قدامت ازراہ نوازش اور مہربانی کے ظل سبحانی نے

تجویز کر منگل باشی کے منصب سے سرفراز فرمایا — نواب موصوف اس کے جوہر کے ملاحظے سے برابر کا سلوک کرتا، اور اس بزرگوار کی تقلید و تتبع شاہ وگدا کرتا۔ چنانچہ یہ بات مشہور و معروف ہے۔ اور شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ بر ہانہ ملکہ، کی ابتدائے سلطنت میں نواب عزت الدولہ صولت جنگ موسیٰ خاں بہادر غفراں پناہ کی رفاقت اختیار کی تھی۔ جو فن اشعار فارسی و ہندی اور محاورہ دانی اُردو و فارسی میں مہارت کلی تھی، چنانچہ فخر الشعراء مرزا رفیع سودا اور میاں خاکسار خادم قدیم شریف نے سرمایہ ریختہ گوئی کا اسی جناب کی شاگردی سے حاصل کیا — یہ عاصی مدت تلک نواب سیف الدین بخشی الملک نجف علی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت میں رہا۔ اور کتنے دنوں شہزادہ جہاندار شاہ جنت آرام گاہ کے حضور اشعار گذرانتا، تفضلات و مہربانی سے تحسین و آفرین فرماتے۔ جس وقت کہ شہزادہ عالی جاہ نے بنارس کو کوچ کیا، اتفاقاً بندے کا رہنا لکھنؤ میں ہوا۔ بعد اس کے معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج دھراج نراندر مہاراج ٹکیٹ رائے بہادر صلابت جنگ نے اس بندے کی نوکری سررشتۂ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر ہزبر جنگ کی سرکار میں درست کر، اپنا رفیق کیا۔ چنانچہ چھ سات برس تلک اس کے سررشتے میں رہا۔ جب مہاراج کی مختاری کا سررشتہ برہم ہوا، راقم کتنے دنوں معطل رہا — اتفاق حسنہ سے سنہ اٹھارہ سو (۱۸۰۰ء) عیسوی میں نواب

مستطاب معلی القاب تاج بخش سلاطین ہندوستان مارکوئس
ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ، جو لکھنؤ سے شاعروں کو بلوایا
تھا، بندے نے بخشی الملک فخر الدین احمد خاں بہادر عرف مرزا
جعفر ابن محسن زماں خاں مرحوم کی وساطت و مربی گری سے
ملازمت اسکاٹ صاحب والا مناقب و عالی مناصب کی
حاصل کی اور اُنیس مارچ کی دسویں تاریخ نوکر ہو کر سنہ مذکور
میں وارد کلکتہ ہوا ـــ اور ملازمت امیر الامرا بہادر (چیف
سیکرٹری) کی حاصل کی ـــ اُنہیں کے حکم کے بہ موجب
صاحب عالی شان، عالم معانی و بیان جان گل کرسٹ صاحب
کی خدمت میں، جو زبان ہندی کے مدرس تھے، متعین ہوا
ـــ اور صاحب ممدوح کے فرمانے سے مادھونل اور
بیتال پچیسی سے، جو برج بھاشا میں ہیں، ان کا ترجمہ للولال
کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی بیتال پچیسی
میں رہنے دی کہ مرضی صاحب مدرس کی یوں ہی تھی۔ بعد اس
کے ہفت گلشن کا ترجمہ کیا۔ جب اس سے فراغت حاصل ہوئی،
محسن زماں، حاتم دوراں، فیض رسان شرفا مسٹر ہارنگٹن دام
حشمتہ، کی نذر کے لئے پند نامہ سعدی شیرازی کا ترجمہ زبان
اُردو میں شعر کا شعر کیا۔ چنانچہ ہزار جلد اس کی چھاپی گئی۔ پانچ
سو گلستان ہندی کے ساتھ اور پانچ سو علیحدہ ـــ بعد اس کے
صاحب مدرس والا مناقب نے ازراہ نوازش والطاف مجوز ہو
کر فرمایا کہ لطائف و ظرائف کا ترجمہ بہ لطائف و ظرائف کیا جائے

بہتر ہے کہ تو ہی اس کا ترجمہ کر کہ زبان اُردو میں تجھے خوب دخل ہے۔ اور یہ مرتبہ مہارت راقم نے بہ موجب ارشاد کے قبول کیا، اور اُسے انصرام کو پہنچایا۔ اس عرصے میں صاحب ممدوح (گل کرسٹ) کو ولایت جانے کا اتفاق ہوا اور کپتان جیمس مویت صاحب والامناقب قائم مقام ان کے ہوئے۔ حقیر نے موافق حکم کے ترجمہ تاریخ شیر شاہی کا کیا۔ بعد اس کے صاحب عالی شان منبع لطف واحسان ڈاکٹر ولیم ہنٹر ثروتہ، کی ابتدائے ارشاد میں اقبال نامہ جہانگیری کا ترجمہ شروع کیا۔ اور بارہ سو چوبیس ہجری مطابق سنہ اٹھارہ سو نو عیسوی میں نواب معلی القاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے عہد دولت میں اس طرح تمام اتمام کو پہنچا کہ بالکل لفظاً باللفظ ترجمہ کیا۔ مگر بعضی جگہ رعایت محاورہ کے لئے اس کا مدعا لیا اور جہانگیر شاہی اس کا نام رکھا۔ اور اس کو کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کہ بالفعل مدرس مدرسۂ ھندی کے ہیں ان کی وساطت سے حضور والا میں گُذارنا"۔[1]

مظہر علی خاں ولا کی تصانیف نثر میں (۱)، ہفت گلشن (۲)، مادھونل اور کام کنڈلا (۳)، بیتال پچیسی (۴)، تاریخ شیر شاہی اور (۵)، جہانگیر نامہ مشہور ہیں۔ ہفت گلشن، ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی لیکن شائع نہ ہو سکی۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مادھونل اور کام

---

[1] مظہر علی خاں ولا: تاریخ جہانگیر شاہی بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی صفحہ ۳۰۶

کنڈلا، موتی رام کبیشر کی برج بھاشا میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔
ولانے اس کو ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا۔ اس میں مادھونل اور کام کنڈلا کے عشق
کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اس
اس کا بھی صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ہے۔ بیتال
پچیسی بھی ترجمہ ہے۔ یہ سنسکرت زبان کی قدیم کتاب ہے جس کو محمد شاہ کے
زمانے میں سورت کبیشر نے برج بھاشا میں لکھا تھا۔ ولانے اس کا ترجمہ
۱۸۰۳ء میں کیا۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں۔ جن کو ایک بھوت بیان کرتا
ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے کلکتہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بار
بار چھپی اور موجودہ دور میں ناگری رسم الخط میں اس کے متعدد اڈیشن
شائع ہوتے ہیں۔ تاریخ شیر شاہی عباس خاں بن شیخ علی شیروانی کی
فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب شیر شاہ سوری کے بارے میں ہے
اور اکبر اعظم کے حکم سے فارسی میں لکھی گئی تھی۔ ولانے اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء
میں کیا۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا
آفس کے کتب خانے میں ہے جہانگیر نامہ فارسی کتاب تزک جہانگیری
کے ایک حصے کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی
اور بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ نایاب ہے۔ راقم کو اس کا ایک
نسخہ برٹش میوزیم میں ملا ہے لیکن یہ ناقص ہے۔ اور اس سے کتاب
کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

مادھونل اور کام کنڈلا مظہر علی خاں ولا کی ایک اہم تالیف ہے۔
یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں مادھونل اور کام کنڈلا کی داستان
عشق کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں کوئی خاص بات نہیں لیکن منظر نگاری،

جذبات نگاری اور ایک مخصوص فضا کی تصویر کشی نے اس میں بڑی
دل موہ لینے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس کا اسلوب اور اندازِ بیان
صاف اور سلیس لیکن شگفتہ اور شاداب ہے اور اس اسلوب اور اندازِ
بیان نے مجموعی طور پر اس کو اُردو نثر کی ایک اہم کتاب بنا دیا ہے۔

خلیل علی خاں اشک

رسالۂ کائنات

خلیل علی خان اشک کی یہ تالیف رسالۂ کائنات اگرچہ مختصر سی کتاب ہے لیکن کائنات اور اس کے عناصر و متعلقات کے علمی موضوع پر اُردو میں اپنے طرز کی پہلی تصنیف ہے۔ اشک نے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ایما پر مسٹر ہربرٹ ہارنگٹن کے لیے ۱۲۱۷ھ - ۱۸۰۲ء میں اس رسالے کو اختصار کے ساتھ اُردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

بعد حمد لایزال اور نعمت رسولؐ بے مثال اس احقر العباد
خلیل علی خان نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے، عصر میں شاہ
عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ، کے اور وقت میں امیر الامراء زبدۂ نوینان

عظیم الشان مشیر خاص حضور شاہ کیوان بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلق کشور ہند کے، یہ رسالہ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سے سترہ میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی زبان ریختے میں بموجب مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام دولتہ کی مصلحت کے، واسطے اُس نیسان سخا کے کہ جس کہ رشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے۔ یعنی گوہر یکتائے دریائے امارت و شجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگ ٹلین صاحب عالی جاہ، کہ بلند اختر سے جس کا پایۂ قدر عالی و برتر ہے، تصنیف کیا۔ اور اختصار کیا اسے دس فصل پر۔[۱]

یہ کتاب آج تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی۔ اور اُردو نثر کے کسی مورخ کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ تقریباً تمام لکھنے والے آج تک یہی لکھتے رہے کہ خلیل علی خاں اشک صرف داستان امیر حمزہ کے مؤلف تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں صرف اتنی معلومات اور فراہم کی کہ اشک نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامۂ علامی ابوالفضل کو واقعات اکبر کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا۔[۲]

---

[۱] خلیل علی خان اشک: رسالہ کائنات (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۴

[۲] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: اہل یورپ نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی۔ رسالہ اُردو نمبر ۱۵ ص ۴۸۵۔

محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین میں سید محمد نے ارباب نثر اُردو میں اور حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں کم و بیش انہیں خیالات کو دُہرایا ہے۔

راقم کو رسالۂ کائنات کا قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ملا۔ یہ نسخہ خلیل علی خاں اشک نے مسٹر مار وانٹ رکٹس کے لئے ۱۲۱۹ھ۔۱۸۰۴ء میں تیار کیا تھا۔ چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ عبارت ملتی ہے :۔

"رسالہ کائنات .... تصنیف خلیل علی خان اشک کا"

مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عصر میں مدرسہ جدید کی خاطر لکھا گیا۔ واسطے صاحب والا ہمت عالیشان مار وانٹ رکٹس صاحب دام دولتہٗ کے، سنہ ہجری بارہ سے انیس میں مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی کے۔

قطعہ

صاحب جود مار وانت رکٹس
فیض سے جس کے اک جہاں ہے شاد
کس طرح سے رہے نہ زیر نگین
اُس کے ہر ملک دل سدا آباد"[۱]

---

[۱] خلیل علی خان اشک : رسالۂ کائنات (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۲

یہ نسخہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ اس کا تب کا نام درج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ نسخہ خلیل علی خان اشک نے مار وانٹ رکٹس کو خود اپنے ہاتھ سے نہایت خوش خط لکھ کر پیش کیا۔ اور رکٹس نے اپنے قیام ہندوستان ہی کے زمانے میں، محفوظ کرنے کے خیال سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کو دے دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یہ قلمی نسخہ اس کتب خانے میں ایک ایسی کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا کہ اس کا شائع ہونا تو درکنار، کسی کو اس کا علم تک نہ ہو سکا۔ اُردو نثر کے محقق اور مؤرخ تک اس سے بے خبر رہے۔

اب اُردو نثر کی اس نادر و نایاب تالیف کو، اُس کی اہمیت کے پیشِ نظر، ایک نئی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت

شعبۂ اُردو و ثقافت ہند و پاکستان
اسکول آف اورئینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن

۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء

خلیل علی خاں اشک فورٹ ولیم کالج کے مشہور لکھنے والے تھے۔ وہ اپنی کتاب داستان امیر حمزہ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ کتاب اُنیسویں صدی میں اتنی مقبول ہوئی کہ بار بار چھپی اور پڑھنے والوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس مقبولیت کے باوجود کتاب اور اُس کے مصنف دونوں پر کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ بقول سید محمد "فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مؤلف ہیں جن کی کتاب تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اُس کی بدولت مشہور ہونے کے بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے"[1] ایک اور حسرت کی بات یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے جو دوسری کتابیں لکھیں، اُن کا کسی کو علم تک نہ ہو سکا۔ حالانکہ اُنہوں نے فورٹ ولیم کالج ہی کے دوران قیام میں داستان اُمیر حمزہ کے علاوہ گلزار چین، واقعات اکبر، رسالہ کائنات اور انتخاب سُلطانیہ کی سی اہم کتابیں لکھیں۔ لیکن آج تک کسی نے اُن کا سراغ نہیں لگایا اور اُن

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اُردو: ص ۲۰۳

کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ایک ایسے عالم کس مپرسی میں پڑے رہے کہ ان کا چھپ کر شائع ہونا تو درکنار، کسی کو اُن کا دیکھنا تک نصیب نہ ہو سکا۔

فورٹ ولیم کالج کے بعض دوسرے مصنفوں کی طرح خلیل علی خاں اشک کے حالات بھی کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ اُن کا تخلص اشک تھا اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے لیکن اُردو شاعروں کے تذکرے اُن کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہاں تک کہ سید حیدر بخش حیدری کے تذکرے گلشن ہند، بینی نارائن جہاں کے تذکرے دیوان جہاں اور مرزا علی لطف کے تذکرے گلشن ہند تک میں اُن کا ذکر نہیں ملتا، حالانکہ ان تذکروں کے لکھنے والے نہ صرف اُن کے ہم عصر بلکہ فورٹ ولیم کالج میں اُن کے رفقائے کار تھے۔

اُردو ادب کی تاریخوں میں اُن کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ لیکن ادبی مورخوں نے نہ تو اُن کی زندگی کے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ اُن کی کتابوں کا سُراغ لگایا ہے۔ اس لئے ان ادبی تاریخوں سے صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے، اور انہوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر امیر حمزہ کی داستان کو اُردو میں لکھا تھا۔ وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ اُن کی تعلیم و تربیت کہاں اور کس طرح ہوئی؟ وہ کہاں کہاں ملازم رہے؟ کب کلکتہ پہنچے؟ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے؟ وہاں انہوں نے کیا کام کیا؟ وہ ملازمت سے کب سبک دوش ہوئے؟ کلکتہ میں وہ کب تک رہے؟ اور کب اُن کا انتقال ہوا؟ ان تمام باتوں کی تفصیل اُردو کی اُدبی تاریخوں میں نہیں ملتی۔

ان میں سے بعض پہلوؤں پر تو خود اُن کی تحریروں اور فورٹ ولیم کالج کی بعض قدیم دستاویزوں سے تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے، اور ان کو سامنے رکھ کر ذہن اُن کی زندگی کے حالات شخصیت، ماحول اور ادبی کارناموں کی ایک دھندلی سی تصویر تیار کر لیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کے حالات کے بیشتر پہلو آج بھی تاریکی میں گم نظر آتے ہیں۔

محمد خلیل علی خاں اشک دلی کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے اُن کا نام خلیل خاں لکھا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی اُن کتابوں میں جن کے قلمی نسخے نہایت اہتمام سے خود لکھ کر، یا کسی اچھے خوش نویس سے لکھوا کر، اُس وقت کی بعض اہم شخصیتوں کو پیش کیے تھے اُن میں واضح طور پر اپنا نام خلیل علی خاں ہی لکھا ہے۔ گلزار چین کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> اُس بے نام و نشان خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے، اس قصے کو اُس اخترِ برجِ اقبال، گوہرِ درجِ جاہ و جلال، نیرِ اعظم، سپہرِ کرم، دریائے سخا، کانِ عطا، مطلعِ امارت، مقطعِ شجاعت، نواب اعتماد الدولہ مشیر الملک جاناتن ھنری لوٹ، نصرت جنگ بہادر دام دولتہٗ کی خاطر زبان میں اُردوئے معلے کی تیار کیا۔[1]

اور رسالۂ کائنات کے دیباچے میں اس طرح کی وضاحت کرتے ہیں۔

---

[1] خلیل علی خاں اشک گلزار چین (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۱

اُس احقر العباد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے، عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے اور وقت میں امیرالامرا، زبدۂ نوینان عظیم الشان مشیر خاص حضور شاہ کیوان بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسۂ سرکار کمپنی انگریز، متعلق کشور ھند کے یہ رسالہ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سے سترہ میں، مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے، زبان ریختے میں، بموجب مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام دولتہ کی مصلحت کے، واسطے اُس نیسان سخا کے کہ جس کے رشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے، یعنی گوہر یکتائے دریائے امارت و شجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگٹن صاحب عالی جاہ، کہ ہر بلند اختر سے جس کا پائے قدر عالی و برتر ہے، تصنیف کیا۔"[1]

اشک کا وطن تو دلی تھا۔ اُن کی ولادت بھی وہیں ہوئی لیکن وہ بچپن ہی میں دلی کو چھوڑ کر فیض آباد آگئے۔ اور یہیں اُن کی نشو و نما ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دلی کو چھوڑ کر فیض آباد میں آباد ہونے کا سبب وہی سیاسی انتشار ہوگا، جس سے دلی کی سرزمین اُس زمانے میں دوچار تھی۔ جس کے نتیجے میں افراد پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تھا، اور بے شمار شرفاء اپنی آبرو کو بچانے کے لئے اس سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ دلی کے لئے نہایت منحوس ثابت ہوا۔ اس

---

[1] خلیل علی خان اشک۔ رسالۂ کائنات (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۴

زمانے میں اس سرزمین پر نادر و ابدالی کی تلواریں چمکیں۔ مرہٹوں، اور جاٹوں نے سلطنت، تہذیب اور معاشرت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ خون کے دریا بہے۔ ادبار کا طوفان اُمڈا۔ اور اس میں اُس وقت کی زندگی خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلی۔ اس طوفان نے بے شمار افراد کو تتر بتر کر دیا، اور وہ کلیجے پر پتھر رکھ کر اس سرزمین کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت پورب میں اودھ کی سلطنت ایک ایسی جگہ تھی جہاں ان بے خانماں افراد کو پناہ مل جاتی تھی۔ خیال یہ ہے کہ اس طوفان میں خلیل علی خاں اشک کا خاندان بھی دلی سے باہر نکلا ہوگا۔ اور اُسے فیض آباد میں پناہ مل گئی ہوگی۔

خلیل علی خاں اشک کے خاندان، ان کے آبا و اجداد کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا خاندان دلی سے آکر فیض آباد میں آباد ہوا اور وہ اسی سرزمین پر سن تمیز کو پہنچے۔ اُن کی تعلیم کے بارے میں بھی صحیح حالات کا علم نہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی ہی میں انہوں نے فیض آباد کی مجلسی زندگی میں اپنی جگہ بنالی تھی، اور وہاں کے اُمرا و رؤسا کی صحبتوں میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس کی وجہ ان کی علمیت اور شاعری سے دلچسپی ہی ہو سکتی ہے۔ وہ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) تک فیض آباد میں رہے۔ اور یہاں مختلف شہزادوں کی صحبتوں میں عزت کی زندگی بسر کی۔ لیکن زیادہ وقت مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے ساتھ گذرا۔

جب فیض آباد کی یہ محفلیں برہم ہوئیں تو خلیل علی خان اشک نے اس سرزمین کو بھی خیر باد کہا، اور تلاش معاش کے سلسلے میں بنگال پہنچے۔ یہاں بھی اُنہوں نے اُس وقت کے مختلف اُمرا کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کی۔

وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کلکتہ جانے سے قبل بنگال میں کہاں کہاں اور کن کن لوگوں کے ساتھ رہے۔ لیکن خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں ان کا قیام بیشتر مرشد آباد ہی میں رہا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت بنگال میں یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں علم وادب سے دلچسپی لینے والوں کے لئے ماحول کسی حد تک سازگار تھا۔

خلیل علی خاں اشک ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں کلکتہ پہنچے۔ لیکن اس شہر میں معاش کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اس لئے بددل ہوکر اس زندگی سے علیحدگی اختیار کی اور کچھ عرصے گوشہ نشین رہے۔

اسی زمانے میں انہیں یہ اطلاع ملی کہ لکھنؤ سے جن شاعروں کو بسلسلۂ ملازمت کلکتہ میں طلب کیا گیا ہے، اُن میں مرزا کاظم علی جوان بھی ہیں۔ جوان سے اُن کو بڑی عقیدت تھی اور وہ اُن کی علمیت کے قائل تھے۔ اپنی غیر مطبوعہ داستان گلزار جبین کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"صاحبان بلند ہمت و عالیشان کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ اگر اس کتاب میں کوئی لفظ مشکل نکلے، کہ اُس کے معنی حل نہ ہو سکتے ہوں تو ملوک الکلام، دل آرام، مجمع البحرین شاعر زماں مرزا کاظم علی جوان کہ سرکار میں کمپنی بہادر دام اقبالہ کے متعلق ہیں چنانچہ گلستان روزگار میں زبان خلق گل کی مانند اُس طوطی گلزار معانی کی تعریف میں ہے، اغلب ہے کہ اُن سے وہ کلمہ دریافت ہو۔"[1]

---

[1] مرزا کاظم علی جوان: گلزار جبین (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ص ۱۔)

یہ عقیدت انہیں مرزا کاظم علی جوان کے پاس کھینچ لے گئی۔ جوان سے انہیں یہ معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بعض ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو قصہ گوئی کے فن میں مہارت رکھتے ہوں۔ اور اس سلسلے میں یہاں سے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کو لکھا بھی گیا ہے۔ وہاں ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے، لیکن کوئی کلکتہ آنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس لئے کاظم علی جوان نے خلیل علی خاں اشک کو مشورہ دیا کہ انہیں ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملنا چاہیئے۔

چنانچہ مرزا کاظم علی خاں اشک کو ڈاکٹر گلکرسٹ کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ اشک کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے امیر حمزہ کے قصے کو اُردو میں لکھنے کا کام اُن کے سپرد کیا۔ اشک اُن کی فرمائش پر اس کام میں مصروف ہوئے۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض ناسازگار حالات راستے کا روڑہ بن گئے۔ اس لئے بددلی کے عالم میں انہیں پھر کچھ عرصے کے لئے گوشہ نشین ہونا پڑا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب مولوی سعید الدین نے اُن کی مدد کی اور انہیں ہربرٹ ہارنگٹن سے ملایا۔ ہارنگٹن نے اشک کی مدد کی۔ اُن کے لئے کونسل کو لکھا اور اُنہیں یقین دلایا کہ امیر حمزہ کی تمام جلدیں اُن سے لکھوائی جائیں گی۔

اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور خلیل علی خان اشک ۹ اگست ۱۸۰۳ء کو بحیثیت منشی کے فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ ملازم ہو گئے تیس ۳۰ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔[۱]

---

[۱] ROEBUCK : ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM.
محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹۔

فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہونے کے بعد انہیں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں اُنہوں نے امیر حمزہ کی داستان مکمل کی۔ ایک مختصر سا رسالہ رسالۂ کائنات کے نام سے لکھا۔ انتخاب سلطانیہ کے نام سے مغل بادشاہوں کے حالات قلم بند کئے۔ اور گلزار چین کے نام سے رضوان شاہ اور روح افزا کی دلچسپ داستان کو اُردو کے قالب میں ڈھالا۔

اس بات کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ خلیل علی خان اشک کب تک فورٹ ولیم کالج کے ساتھ منسلک رہے اور کس سنہ میں اُن کا انتقال ہوا۔

انتخاب سلطانیہ کے دیباچے میں اشک نے اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ اس لئے اس کا نقل کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"محمد خلیل علی خان فیض آبادی اشک کہ تولد اس کا شاہجہان آباد دلی ہے۔ لیکن سن تمیز کو فیض آباد میں پہنچا۔ اکثر محفل میں شہزادوں کی معتز و ممتاز رہا۔ چنانچہ خدمت میں صاحب عالم مرزا جہاں بخت جہاندار شاہ کی مدت باریاب رہا۔ اور انعامات سے کامیاب۔

"سنہ ہجری بارہ سو نو (مطابق ۴ ۹ ۷ ۱ء) میں آب و خور ملک میں بنگالے کے کھینچ لایا۔ یہاں بھی شرف اندوز خلوت میں اس ملک کے ناظموں کی رہا۔ بعدہ چندے کے سنہ ہجری بارہ سو پندرہ میں مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے شہر دارالخلافت کلکتہ میں وارد ہوا۔ لیکن احوال یہاں کا دیکھ کر اکثر لوگوں سے ترک ملاقات کر کے خانہ نشینی اختیار کی۔

ایک دن مخدوم زادہ والاشکوہ خلف الرشید قاضی القضات قاضی محمد نجم الدین خاں صاحب مولوی سعید الدین سلمہٗ کی زبانی دریافت ہوا کہ صاحبان عالی شان نے لکھنؤ سے کئی شاعر بلوائے ہیں۔ چنانچہ اُن میں مرزا کاظم علی صاحب کہ جوان تخلص کرتے ہیں، تشریف لائے ہیں۔

اُس نوید بہجت اثر سے دل کو نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ احقر نے انہیں کے فیض کلام سے طریقہ شعر و شاعری کا اور فن سخن آوری کا حاصل کیا تھا۔ اسی وقت جاکر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور شرف اندوز ملازمت۔

اُز بس کہ عنایت بے حد قدیم سے تھی۔ نہایت توجہ فرما ہوئے اور ارشاد کیا کہ تعجب ہے کہ تم اس شہر میں رہو اور مسٹر گلکرسٹ صاحب سے ملاقات نہ کرو کہ جوہر شناس گوہر لفظ و معانی ہیں اور فن نکتہ دانی میں لاثانی۔ چنانچہ صاحب موصوف نے بموجب ارشاد صاحبان عظیم الشان لکھنؤ میں اسکاٹ صاحب رزیڈنٹ کو لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس فن کا قصہ کہ کہنے میں مہارت رکھتا ہو تو اُسے مقرر بھیجا چاہیئے۔ لیکن وہاں سے جواب آیا کہ کوئی شخص اس فن کا ادھر کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اب تم چلو اور صاحب موصوف سے ملاقات کرو۔

چُنانچہ اپنے ہمراہ لے کر ملازمت کروائی۔ صاحب موصوف ملاقات کے وقت گفتگو سے اس احقر کی نہایت خوش ہوئے۔ اور از راہِ الطاف و بندہ نوازی کے فرمایا کہ خاطر جمع رکھو۔ ہم

تمہارے واسطے حتی المقدور سعی میں کوتاہی نہ کریں گے ہمارے لئے قصہ امیر حمزہ کا زبان ریختہ میں تصنیف کرو۔

بہ موجب فرمانے کے احقر اس کام میں مشغول ہوا۔ چند داستانیں لکھی تھیں کہ سبب سے زمانے کی ناتواں بینی کے طبیعت پر گرانی گذری۔ پھر آکر خانہ نشین ہوا۔ اور گوشۂ عافیت کو اختیار کیا۔

یہ احوال سن کر مولوی سعید الدین صاحب نے توجہ فرمائی۔ لے جا کر خداوند نعمت ہربرٹ ہارنگٹین صاحب عالی جاہ سے ملازمت کروائی۔

صاحب عالی ہمت نے فرمایا خاطر جمع رکھو۔ ہم تمہاری خاطر کونسل میں لکھیں گے، اور سب دفتر امیر حمزہ کے تصنیف کروادیں گے۔

چنانچہ انہیں کی شفقت بے پایاں سے سبب روزگار کا ہوا۔ اور مسٹر گلکرسٹ صاحب نے موصوف سے احقر کو مانگ لیا۔ اور اُسی روز سے مقرر کیا کہ شب کو ہندی درس کے روز کالج میں بعد کھانے کے، بندے کو لے کر اوپر کے مکان میں درمیان میں صاحب عالی شان کے بیٹھا کرتے۔ اور یہ احقر جو کچھ تقریر کرتا وہ صاحبان کو انگریزی میں تفہیم کرتے۔ چنانچہ اکثر اس تقریر سے از راہ بندہ پروری فرماتے کہ صاحبان کو تمہارے فیض صحبت سے اس زبان میں نہایت ترقی ہوئی۔ سب صاحب تعریف تمہاری کرتے ہیں۔

بعد چندے کے جب صاحب موصوف نے کالج میں رات کا جانا موقوف کیا، بندے کو بھی اس خدمت سے باز رکھا، اور

منشیوں میں درجۂ اول کے مقرر کر کے فرمایا: "ہمارا جی نہیں چاہتا ہے کہ تم بیکار رہو۔ اب تو اسے قبول کرو۔ بعد چندے کے تمہاری خاطر کوئی اور کام لائق تمہارے تجویز ہوگا"۔

جب سے یہ کمترین فرصت میں ہوا۔ اور بہ موجب صاحب موصوف کے فرمانے کے اس عدم فرصت میں، اپنے صاحب کو پڑھانے اور سرکاری فرمائشات بجالانے کے بعد راتوں کو محنت کر کے دو جلدیں امیر حمزہ کے قصے کی کہیں۔ اور رسالۂ کائنات جو کا کہ فن حکمت سے تعلق رکھتا ہے، تصنیف کر کے حضور عالی شان میں گزرانا۔ اور قصہ رضوان شاہ کا کہ بہ نگار خانۂ چین موسوم ہے، واسطے صاحب عالی شان خداوند نعمت مسٹر مارونٹ رکٹس صاحب کے تصنیف کیا۔ اور احوال ان کتابوں کا ہر خورد و کلاں پر ظاہر ہے۔

اب سن ہجری بارہ سے اُنیس میں مطابق اٹھارہ سو پانچ عیسوی کے فرمائش سے اس منبع جود و سخا یعنی جناب مارونٹ رکٹس صاحب بلند اختر کے واسطے مدرسۂ جدید کے، اس تاریخ کو لکھا۔ چنانچہ صاحب عالی قدر کی فرمائش یہ تھی کہ ابتدائے بنیاد دلی سے سنہ حال تک شاہ عالم کے، شہر مذکور میں کتنے بادشاہ ہوئے۔ اس احوال کو لکھو۔ سو حقیر نے یہ کتاب اُسی طور پر لکھی، اور نام اس کا انتخاب سلطانیہ رکھا۔ کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی پائی"۔[1]

---

[1] خلیل علی خان اشک کی انتخاب سلطانیہ (بحوالۂ محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۱-۳۰۲)

خلیل علی خان اشک کی سب سے اہم تالیف اس میں شبہ نہیں، کہ قصۂ امیر حمزہ ہے۔ یہ کتاب اُنہوں نے ۱۲۱۵ھ۔ (۱۸۰۱ء) میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اُردو میں لکھی۔ چنانچہ اس کے دیباچے لکھتے ہیں:۔

"بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے۔ انہوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں لکھیں۔ واسطے بادشاہ کے سنانے کے۔ اس کے سننے سے آئین ہر طرح کی خلقت کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے منصوبے لڑائیوں کے اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے یاد آتے ہیں۔ اس خاطر ہر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کی مصلحت کا درماندہ نہ رہے ــ اور اب عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق سنہ ہجری بارہ سو پندرہ اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خان نے جو متخلص بہ اشک ہے، بہ موجب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے، واسطے نو آموزان زبان ہندی کے، اس قصے کو زبان میں اُردوئے معلے کی لکھا کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"[1]

اور آخر میں اس داستان کے موضوع اور اس کی تالیف و ترتیب کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

---

[1] خلیل علی خان اشک: قصۂ امیر حمزہ (قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) ص ۴-۵

آخر ہوئی جلد اول قصہ صاحبان قران امیر حمزہؑ نامدار عم رسول آخر زماں کی۔ ازبس کہ یہ احقر العباد قصد رکھتا تھا کہ بائیسوں جلدوں کو تصنیف کرے۔ پر زمانے نے نہ چاہا۔ جس پر بھی اس اول میں اسی داستان مع مفرد و مرکب لکھی ہیں۔ مفرد داستان اور مرکب۔ بعضی داستان اس میں دو داستان کی ہیں، اور بعض تین کی۔ سب ملا کر اسی داستان ہوئی۔ یہ تصنیف مُلّا جلال بلخی کی ہے۔ اس جلد کو مولد قصہ کہتے ہیں یعنی بنیاد قصہ۔ اس چار جلد تک قصہ خرد سال ہے یعنی لڑکا اور ہرمز نامہ کی جلدوں کو نوجوانی قصہ کہتے ہیں اور کوچک باختر و بالا باختر۔ عین جوانی غرو بیا اور شمالیہ و پائین باختر۔ اور ایرج نامہ کی جلدوں کو آخر جوانی مشہور کیا ہے۔ صندلی نامہ کی جلدوں کا نام شروع پیری رکھا ہے۔ اور نورج نامہ کو عین پیری۔ لعل نامہ میں قصہ آخر ہوتا ہے۔ ان نو دفتروں میں بائیس جلدیں مشہور کی ہیں۔ اس سب احوال صاحب قرآن کا ہے۔ اور کوئی عیاری چرتر یا حکایت زمانے میں ایسی نہ ہوگی جو اس قصّے سے باہر ہوگی۔ چنانچہ اُستادوں نے عجیب عجیب طرح کی لڑائیاں، خانہ جنگیاں، قلعہ گیریاں، شبخون، قزاقی، حصار بائیاں کہی ہیں۔ اور چوریاں، عیاریاں، مکاریاں، جہاں تک ہیں، سب اس میں ہیں عشق اور طلسم اقسام کے۔ غرض کوئی افسانہ اس سے باہر نہیں۔ سنہ بارہ سے سترہ مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے یہ جلد دفتر

ل‍ہ خلیل علی خان اشک : قصہ امیر حمزہ، ص ۲۸۰ - ۲۸۱

خانے میں مسٹر جان گلکرسٹ صاحب عالی جاہ والا مناقب کے
تیار ہوئی۔"[۱]

یہ کتاب گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں بار بار چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ترمیم و اضافہ بھی ہوتا رہا ہے۔ سیّد وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں :-

"فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشک نے داستان امیر حمزہ کو چار حصوں میں ترجمہ کر کے اسے ایک جلد کی شکل میں ترتیب دیا۔ اس کا سنہ ترجمہ و تالیف ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ ہے۔ اس کتاب میں محمد عبداللہ بلگرامی نے ۱۸۷۱ء میں نول کشور والوں کے لئے نظر ثانی کی اور پھر اس نظر ثانی کے بعد ۱۸۸۷ء میں نول کشور کی ایما پر شیخ تصدق حسین نے اس پر مزید نظر ثانی کی۔ آج کل بازار میں داستان امیر حمزہ کے نام سے جو کتاب عام طور پر بکتی ہے وہ یہی نول کشور والی شیخ تصدق حسین کی نظر ثانی کی ہوئی کتاب ہے۔"[۲]

خلیل علی خان اشک کی ایک اور اہم داستان گلزار چین ہے اس میں انہوں نے رضوان شاہ شہزادۂ چین اور روح افزا شاہ جن کی بیٹی کی عشقیہ کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے جاناتن ہنری لوٹ کی خاطر ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) میں لکھی اور اس کا ایک نسخہ نہایت اہتمام سے تیار کر کے مارونٹ رکٹس کو بھی پیش کیا۔ کتاب بہت پسند کی گئی۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :

"وقت میں خدیو ملک شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ خورشید

---

[۲] سیّد وقار عظیم : ہماری داستانیں پہلا اڈیشن لاہور ۱۹۹

فلک حکومت کے۔ اور عصر میں صاحب عدل و داد، آبادی ملک
مراد، عادل زماں، باذل جہاں، حاتم وقت، امیرالامراء، زبدۂ
نوینان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، اشرف
الاشراف، مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار
کمپنی انگریز متعلقہ کشور ہند کے، سن ہجری (۱۲۱۹) بارہ سو
انیس اور اٹھارہ سو چار عیسوی میں اس بے نام و نشان خلیل علی خاں
نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے، اس قصے کو اس اختر و برج اقبال،
گوہر درج جاہ و جلال، نیر اعظم، سپہر کرم، دریائے سخا، کان عطا،
مطلع امارت، مقطع شجاعت، نواب اعتماد الدولہ مشیر الملک جاناتن
ہنری لوٹ نصرت جنگ بہادر دام دولتہ، کی خاطر زبان میں اردوئے
معلّے کی تیار کیا، کہ اس کے مطالعہ فرمانے سے طبیعت کو فرحت
حاصل ہو۔ اور رشحۂ فیض اُس ابر اقبال کا اس تشنۂ زلال کرم
کو ہادی راہ ہوکر خضر وار منزل مقصود کو پہنچاوے۔ لیکن جب یہ
رسالہ مانند درج جواہر لبریز ہوا، اور اکثر گوہر مضامین اس کے
گوش جاناں میں سامعان سخن سنج کے پہنچے گنج آفرین و تحسین سب
نے اس کمترین کو عنایت فرمایا۔"[1]

اور اختتامیہ میں اپنے ممدوح کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

"اے ممدوح! تیری جناب وہ فیض بخش ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں

---

[1] خلیل علی خاں اشک: گلزار حسین (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۴۔

سکتا۔ اگر تیرے مداح کا ہر بن مو بہ رنگ شمع ہزار زبان پیدا کرے
پر ہرگز شکرانۂ احسان کو ادا نہ کر سکے۔ چنانچہ ایک پتھر خلقت میں
مشہور ہے جس کو لوگ پارس کہتے ہیں۔ اُس میں یہ خوبی ہے کہ لوہے
کو سونا کرتا ہے۔ پر اگر وہ چاہے کہ تیرے سنگ آستان کی منزلت
کو پہنچے سو کیا تاب؟ اُس میں وہ مقدور کب ہے کہ جو پتھر اُس کو
آکر لگے اُسے وہ پارس کر دے۔ بس اس خاطر یہ نسخہ لکھ کر حضور
اقدس میں گزارتا ہے کہ نظر کیمیا اثر سے گزر کر سرکار عالی میں داخل
ہو کہ یہ بے نام و نشان بھی اس کے سبب ناموری پیدا کرے اور
دعائے عمر و دولت میں مشغول رہے۔"[۱]

گلزار چین کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس کی نظم و ترتیب میں وہ انفرادی
شان ہے جو فنی اعتبار سے ایک اعلیٰ درجے کی کہانی کے پلاٹ میں ہونی چاہیے۔
اگرچہ اس داستان کی بنیاد مافوق الفطرت پر اُستوار ہے لیکن اس کے
باوجود یہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور اس میں بڑی دلکشی کا احساس ہوتا
ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان عناصر کے باوجود اس میں شروع سے
آخر تک انسانی رنگ و آہنگ کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں
میں بھی بڑی زندگی اور جولانی پیدا کی گئی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی
تفصیل و جزئیات کو بھی بڑے سلیقے سے اُبھارا گیا ہے اور فضا و ماحول
کی مصوری میں بھی بڑی چابک دستی دکھائی گئی ہے۔ اس کا اسلوب اور اندازِ
بیان کہیں کہیں مرصع ضرور ہے۔ کہیں کہیں اس میں رنگینی اور پُرکاری بھی اپنا

---

[۱] خلیل علی خاں اشک : گلزار چین، ص ۱۲۳۔

جلوہ ضرور دکھاتی ہے، لیکن ساتھ ہی سادگی اور جوانی کا حسن بھی نمایاں نظر آتا ہے — اور ان دونوں کے حسین اور متوازن امتزاج نے اس داستان کو فنّی اعتبار سے ایک شاہکار بنا دیا ہے۔

یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس کا صرف ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ہے۔ راقم نے اس کو مرتب کر لیا ہے اور یہ نئی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ جلد شائع ہونے والی ہے۔

انتخاب سلطانیہ بھی خلیل علی خاں اشک کی ایک اہم تالیف ہے۔ یہ کتاب سن ۱۲۱۹ ہجری میں مارونانٹ رکٹس کی فرمائش پر اُردو میں لکھی گئی۔ اس کا موضوع تاریخ ہے اور اس میں دلی کے بادشاہوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں ہے — محمد عتیق صدیقی صاحب نے اس نسخے کو دیکھا ہے، اور اس کا اقتباس اپنی کتاب گلکرسٹ اور اس کا عہد میں ضمیمے کے طور پر پیش کیا ہے۔

رُسالۂ کائنات، بھی خلیل علی خان اشک کی ایک اور اہم تالیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے، لیکن حکمت اور سائنس کے علمی موضوع پر پہلی کتاب ہے جو فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی ہے۔ اشک نے اس کتاب کو بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اُردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> بُعد لایزال اور نعت رسول بے مثال اس احقر العباد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے عصر میں شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے اور وقت میں امیر الامرا، زبدۂ نوئینان عظیم الشان

مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس
ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلق
کشور ہند کے یہ رسالہ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سے سترہ مطابق
اٹھارہ سو دو عیسوی کے زبان ریختے میں بموجب مسٹر جان گلکرائسٹ
صاحب دام دولتہٗ کی مصلحت کے، واسطے اُس نیسان سخا کے
کہ جس کے رشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے۔ یعنی گوہر یکتائے
دریائے امارت وشجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگٹن صاحب عالی
جاہ کہ ہر بلند اختر سے جس کا پائے قدر عالی و برتر ہے،
تصنیف کیا"۔[1]

یہ کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں کائنات، اس کی تخلیق اور اس کے مختلف عناصر، دوسری فصل میں ابر و باراں، تیسری فصل میں برف، ژالہ، میغ وشبنم وپشنگ، چوتھی فصل میں برق و رعد اور صاعقہ، پانچویں فصل میں ریاحات واعصار، چھٹی فصل میں قوس قزح اور ہالۂ ماہ دتفاوہ آفتاب، ساتویں فصل میں شہاب ثاقب و ذوات اذناب اور حریق، آٹھویں فصل میں زلزلے کی حالت، نویں فصل میں چشموں کی پیدائش اور دسویں فصل میں کرۂ زمین اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس میں جو اسلوب اور انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ صاف سادہ اور سلیس نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اردو میں علمی کتاب

---

[1] خلیل علی خاں اشک: رسالۂ کائنات (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ص ۴)۔

لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ خاص طور پر علمی اصطلاحات کا ذخیرہ تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل علی خان اشک کو اس سلسلے میں عربی اور فارسی کی طرف رجوع ہونا پڑا ہے اور اس صورت حال نے اس کے اسلوب میں عربی فارسی کے اثرات کو ذرا نمایاں ضرور کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک مانوس سی فضا نظر آتی ہے اور مجموعی طور پر پختگی اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء

خلیل علی خاں اشک

گُلزارِ چین

خلیل علی خاں اشک کی یہ تالیف (گلزارِ چین) رضوان شاہ شہزادۂ چین اور روح افزا پریزاد بادشاہ جن کی بیٹی کا قصہ ہے جس میں ان دونوں کی عشقیہ داستان کو پیش کیا گیا ہے۔ اشک نے یہ قصہ ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں جاناتن ہنری لوٹ کی خاطر زبان اُردو میں لکھا۔ چنانچہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"وقت میں خدیو ملک شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ،

خورشید فلک حکومت کے، اور عصر میں صاحب عدل و داد،
آبادی ملک مُراد، عادل زماں، باذل جہاں، حاتم وقت،
امیرالامراء، زبدۂ نوئینان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیواں
بارگاہ انگلستان، اشرف الاشراف، مارکوئس ولزلی، گورنر
جنرل ممالک محروسۂ سرکار کمپنی انگریز، متعلقہ کشور ہند کے،
سن ہجری بارہ سو اُنیس اور اٹھارہ سو چار عیسوی میں اس
بے نام و نشان خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے،
اس قصّے کو اختر برج اقبال، گوہر درج جاہ و جلال، نیر اعظم،
سپہر کرم دریائے سخا، کان عطا، مطلع امارت، مقطع شجاعت،
نواب اعتماد الدولہ مشیر الملک جانا تن ہنری لوٹ نصرت
جنگ بہادر دام دولتہٗ کی خاطر، زبان میں اُردوئے معلیٰ
کی تیار کیا کہ اس کے مطالعہ فرمانے سے طبیعت کو فرحت
حاصل ہو۔ اور رشحۂ فیض اُس ابر اقبال کا اس تشنۂ زلال
کرم کو ہادی راہ ہو کر خضر وار منزل مقصود کو پہنچا وے۔"[۱]

یہ کتاب آج تک گوشۂ گمنامی میں رہی۔ اُردو نثر کے کسی مؤرخ کو
اس کا علم نہ ہو سکا۔ تقریباً تمام لکھنے والے آج تک یہی لکھتے رہے
کہ خلیل علی خان اشک صرف داستان امیر حمزہ کے مؤلف تھے۔ سب
سے پہلے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں صرف

---

[۱] خلیل علی خاں اشک: گلزار چین (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی
لندن)، ص ۱۔

اتنی معلومات اور فراہم کی کہ اشک نے سن ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامہ علامی ابوالفضل کو واقعات اکبر کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا۔[1]

محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین میں، سید محمد نے ارباب نثر اُردو میں اور حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں کم و بیش انہی خیالات کو دہرایا ہے۔

مجھے گلزار چین کا قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں ملا۔ یہ نسخہ خلیل علی خاں اشک نے مسٹر مار وانٹ رکٹس کے لئے ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں تیار کیا تھا چنانچہ اس قلمی نسخے کے شروع میں یہ عبارت ملتی ہے :۔

"گلزار چین، قصہ رضوان شاہ شہزادہ چین کا اور روح افزا پریزاد بادشاہ جن کی بیٹی کا۔ تصنیف خلیل علی خان اشک۔ اس جلد میں لکھا گیا ہے واسطے خداوند نعمت، جوہر شناس و قدر دان سخن داناں مسٹر مار وانٹ رکٹس صاحب عالی جاہ، والاحشمت کے، سن ہجری بارہ سو اُنیس میں مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی کے"۔[2]

یہ نسخہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خود مؤلف کا لکھا ہوا ہو۔ قیاس یہ کہتا

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: اہل یورپ نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی، رسالہ اُردو نمبر ۱۵، ص ۸۵

[2] خلیل علی خان اشک: قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، ص ۴۔

ہے کہ یہ نسخہ خلیل علی خاں اشک نے مارووانٹ رکٹس کو خود اپنے ہاتھ سے نہایت خوشخط لکھ کر پیش کیا۔ اور رکٹس نے اس کو اپنے قیام ہندوستان ہی کے زمانے میں، محفوظ کرنے کے خیال سے رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کو دے دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یہ قلمی نسخہ اس کتب خانے میں ایسی کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا کہ اس کا شائع ہونا تو درکنار، کسی کو اس کا علم تک نہ ہو سکا۔ اُردو نثر کے محقق اور مورّخ تک اس سے بے خبر رہے۔

اس لئے اَب اُردو نثر کی اس نادر و نایاب تصنیف کو، اُس کی اہمیت کے پیشِ نظر نئی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

شعبۂ اردو ثقافت ہند و پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۵ اپریل ۱۹۶۶ء

خلیل علی خاں اشک فورٹ ولیم کالج کے مشہور لکھنے والے تھے۔
وہ اپنی کتاب داستان امیر حمزہ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ کتاب اُنیسویں
صدی میں اتنی مقبول ہوئی کہ بار بار چھپی اور پڑھنے والوں نے اس کو
ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس مقبولیت کے باوجود
کتاب اور اس کے مصنف دونوں پر کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ بقول سید
محمد "فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مؤلف ہیں جن کی کتاب
تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اس کی بدولت مشہور ہونے کے
بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے۔"[1] ایک اور حیرت کی بات یہ بھی ہے
کہ اس کتاب کے علاوہ اُنھوں نے جو دوسری کتابیں لکھیں لیکن اُن کا کسی
کو علم تک نہ ہو سکا۔ حالانکہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج ہی کے دوران قیام
میں داستان امیر حمزہ کے علاوہ گلزار چین، واقعات اکبر، رسالہ کائنات اور
انتخاب سلطانیہ کی سی اہم کتابیں لکھیں۔ لیکن آج تک کسی نے اُن کا سُراغ

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اُردو، ص ۲۰۳۔

نہیں لگایا اور ان کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ایسے عالم کس مپرسی میں پڑے رہے کہ ان کا چھپ کر شائع ہونا تو درکنار، کسی کو اُن کا دیکھنا تک نصیب نہ ہو سکا۔

فورٹ ولیم کالج کے بعض دوسرے مصنفوں کی خلیل علی خاں اشک کے حالات بھی کہیں تفصیل سے نہیں ملتے ان کا تخلص اشک تھا اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے۔ لیکن اُردو شاعروں کے تذکرے اُن کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہاں تک کہ سید حیدر بخش حیدری کے تذکرے گلشن ہند، بینی نارائن جہاں کے تذکرے دیوان جہاں اور مرزا علی لطف کے تذکرے گلشن ہند، تک میں اُن کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ ان تذکروں کے لکھنے والے نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ فورٹ ولیم کالج میں اُن کے رفقائے کار بھی تھے۔

اُردو ادب کی تاریخوں میں اُن کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ادبی مؤرخوں نے بھی نہ تو اُن کی زندگی کے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ان کی کتابوں کا سراغ لگایا ہے۔ اس لئے ان ادبی تاریخوں سے صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے اور انہوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر امیر حمزہ کی داستان کو اُردو میں لکھا تھا۔ وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ اُن کی تعلیم و تربیت کہاں اور کس طرح ہوئی؟ وہ کہاں کہاں ملازم رہے؟ کب کلکتے پہنچے؟ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے؟ وہاں انہوں نے کیا کام کیا؟ وہ ملازمت سے کب سبکدوش ہوئے؟ کلکتہ میں وہ کب تک رہے اور کب اُن کا انتقال ہوا؟ ان تمام باتوں کی ان میں سے بعض پہلوؤں پر تو خود ان

کی تحریروں اور فورٹ ولیم کالج کی بعض قدیم دستاویزوں سے تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے، اور ان کو سامنے رکھ کر ذہن اُن کی زندگی کے حالات، شخصیت، ماحول اور ادبی کارناموں کی ایک دھندلی سی تصویر تیار کر لیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی کے بیشتر پہلو آج بھی تاریکی میں گم نظر آتے ہیں۔

محمد خلیل علی خاں اشک دلی کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے اُن کا نام خلیل خاں لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی اُن کتابوں میں جن کے قلمی نسخے نہایت اہتمام سے خود لکھ کر یا کسی اچھے خوش نویس سے لکھوا کر، اُس وقت کی بعض اہم شخصیتوں کو پیش کیے تھے، اُن میں واضح طور پر اپنا نام خلیل علی خاں ہی لکھا ہے۔ گلزارِ چین کے دیباچے میں، جس کا حوالہ اس پیش لفظ کے آغاز میں دیا جا چکا ہے، یہی نام درج ہے اور رسالۂ کائنات کے دیباچے میں اس طرح اس کی وضاحت کرتے ہیں:

> اُس احقر عباد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے
> عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے اور وقت میں امیر الامراز بدۂ
> نوئینان عظیم الشان مشیر خاص حضور شاہ کیواں بارگاہ انگلستاں
> اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ
> سرکار کمپنی انگریز متعلق کشور ہند کے یہ رسالہ کائنات جو کا سن
> ہجری بارہ سے سترہ میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے
> زبان ریختے میں بموجب مسٹر جان گلکرسٹ
> کی مصلحت کے واسطے اُس نیسان سخا کے کہ جس کے
> اشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے۔ یعنی گوہر یکتائے دریائے

امارت و شجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگٹن صاحب عالی جاہ
کہ ہر بلند اختر سے جس کا پایۂ قدر عالی و برتر ہے، تصنیف کیا۔"[1]
اشک کا وطن تو دلی تھا۔ اُن کی ولادت بھی وہیں ہوئی لیکن وہ بچپن
ہی میں دلی کو چھوڑ کر فیض آباد آ گئے اور وہیں اُن کی نشو و نما ہوئی۔ ظاہر
ہے کہ دلی کو چھوڑ کر فیض آباد ہونے کا سبب وہی سیاسی انتشار ہوا
جس سے دلی کی سرزمین اُس زمانے میں دوچار تھی۔ جس کے نتیجے میں
افراد پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا اور بے شمار خاندان اپنی آبرو کو
بچانے کے لئے اس سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اٹھارویں
صدی کے نصف آخر کا زمانہ دلی کے لئے نہایت منحوس ثابت ہوا۔ اس
زمانے میں اس سرزمین پر نادر و ابدالی کی تلواریں چمکیں، مرہٹوں اور
جاٹوں نے سلطنت، تہذیب اور معاشرت کی اینٹ سے اینٹ بجا
دی۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ خون کے دریا بہے۔ ادبار کا
طوفان اُمڈا اور اس میں اس وقت کی زندگی خس و خاشاک کی طرح
بہہ نکلی۔ اس طوفان نے بے شمار افراد کو تتر بتر کر دیا اور وہ کلیجے پر
پتھر رکھ کر اس سرزمین کو خیرباد کہنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اس وقت
پورب میں اودھ کی سلطنت ایک ایسی جگہ تھی جہاں ان بے خانماں
افراد کو پناہ مل جاتی تھی۔ خیال یہ ہے کہ اس طوفان میں خلیل علی خان
اشک کا خاندان بھی دلی سے باہر نکلا ہو گا اور اُسے فیض آباد میں پناہ

---

[1] خلیل علی خاں اشک: رسالہ کائنات (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی
لندن، ص ۴)۔

مل گئی ہوگی۔

خلیل علی خاں اشک کے خاندان اور اُن کے آباؤ اجداد کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا خاندان دلی سے آکر فیض آباد میں آباد ہوا اور وہ اسی سرزمین پر سن تمیز کو پہنچے۔ اُن کی تعلیم کے بارے میں بھی صحیح حالات کا علم نہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی ہی میں اُنھوں نے فیض آباد کی مجلسی زندگی میں اپنی جگہ بنالی تھی اور وہاں کے اُمرا و رؤسا کی صحبتوں میں ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔ اس کی وجہ اُن کی علمیت اور شعر شاعری سے دلچسپی ہی ہوسکتی ہے۔ وہ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) تک فیض آباد میں رہے اور یہاں مختلف شہزادوں کی صحبت میں عزت کی زندگی بسر کی۔ لیکن زیادہ وقت مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے ساتھ گزارا۔

جب فیض آباد کی یہ محفلیں برہم ہوئیں تو خلیل علی خاں اشک نے اس سرزمین کو بھی خیرباد کہا اور تلاش معاش کے سلسلے میں بنگال پہنچے۔ یہاں بھی اُنھوں نے اُس وقت کے مختلف اُمراء کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کی۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کلکتہ جانے سے قبل بنگال میں کہاں کہاں اور کن کن لوگوں کے ساتھ رہے۔ لیکن خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں ان کا قیام بیشتر مرشد آباد میں رہا ہوگا کیونکہ اُس وقت بنگال میں یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں علم و ادب سے دلچسپی لینے والوں کے لئے ماحول کسی حد تک سازگار تھا۔

خلیل علی خاں اشک ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں کلکتہ پہنچے۔ لیکن اس شہر میں معاش کی کوئی صورت نہ نکلی اس لئے بددل ہوکر زندگی سے

علیحدگی اختیار کی اور کچھ عرصے خانہ نشین رہے۔

اس زمانے میں اُنہیں یہ اطلاع ملی کہ لکھنؤ سے جن شاعروں کو بسلسلۂ ملازمت طلب کیا گیا ہے اور جو کلکتے میں آئے ہیں ان میں مرزا کاظم علی جوان بھی ہیں۔ جوان سے اُن کے اچھے تعلقات تھے اور انہوں نے شاعری کا فن بھی انہی سے حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اشک مرزا کاظم علی جوان سے ملے۔ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ کلکتے میں بعض ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو قصّہ گوئی کے فن میں مہارت رکھتے ہوں اور اس سلسلے میں یہاں سے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کو لکھا بھی گیا ہے۔ وہاں ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن کوئی کلکتے آنے کے لئے تیار نہیں ہوا اس لئے کاظم علی جوان نے خلیل علی خاں اشک کو یہ مشورہ دیا کہ انہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملنا چاہیئے۔

چنانچہ مرزا کاظم علی جوان خود خلیل خاں اشک کو ڈاکٹر گلکرسٹ کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ اشک کی گفتگو سے متاثر ہوئے اور انہوں نے امیر حمزہ کے قِصّے کو اُردو میں لکھنے کا کام اُن کے سپرد کیا۔ اشک اُن کی فرمائش پر اس کام میں مصروف ہوئے لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض ناسازگار حالات راستے کا روڑا بن گئے۔ اس لئے بددلی کے عالم میں اُنہیں پھر کچھ عرصے کے لئے گوشہ نشین ہونا پڑا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب مولوی سعید الدین نے اُن کی مدد کی اور انہیں ہربرٹ ہارنگٹن سے ملایا۔ ہارنگٹن نے اشک کی مدد کی۔ اُن کے لئے کونسل کو لکھا اور اُنہیں یقین دلایا کہ امیر حمزہ کی تمام جلدیں اُن سے لکھوائی جائیں گی۔

اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور خلیل علی خاں اشک ۹ اگست ۱۸۰۳ء کو بہ حیثیت منشی کے فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہوگئے۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی[1]۔

فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہونے کے بعد انہیں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں انہوں نے امیر حمزہ کی داستان مکمل کی۔ ایک مختصر سا رسالہ رسالۂ کائنات جو کے نام سے لکھا۔ انتخاب سلطانیہ کے نام سے مغل بادشاہوں کے حالات قلم بند کئے اور گلزارِ چین کے نام سے رضوان شاہ اور روح افزا کی دلچسپ داستان کو اُردو کے قالب میں ڈھالا۔

اس کا علم نہیں ہوتا کہ خلیل علی خاں اشک کب تک فورٹ ولیم کالج کے ساتھ منسلک رہے اور کس سنہ میں اُن کا انتقال ہوا۔

انتخاب سلطانیہ کے دیباچے میں اشک نے اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ نہایت مُفید اور دلچسپ ہے اس لئے اس کا نقل کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لکھتے ہیں :۔

"محمد خلیل علی خاں فیض آبادی اشک کہ تولد اُس کا شاہجہان آباد دلی ہے لیکن سن تمیز کو فیض آباد میں پہنچا۔ اکثر محفل میں شہزادوں کی معزز و ممتاز رہا۔ چنانچہ خدمت میر صاحب عالم مرزا جہاں

---

1. ROEBUCK : ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM.
محمد عتیق صدیقی : گل کرسٹ اور اُس کا عہد ص ۱۹۹ ۔

بخت جہاندار شاہ کی مدت باریاب رہا۔ اور انعامات سے
کامیاب۔
سنہ ہجری بارہ سو نو (مطابق ۱۷۹۴ء) میں آب و خور ملک میں
بنگالہ کے کھینچ لایا۔ یہاں بھی شرف اندوز خلوت میں اس ملک کے
ناظموں کی رہا۔ بعدہٗ چندے کے، سنہ ہجری بارہ سو پندرہ میں، مطابق
اٹھارہ سو ایک عیسوی کے شہر دارالخلافت کلکتے میں وارد ہوا۔ لیکن
احوال یہاں کا دیکھ کر اکثر لوگوں سے ترک ملاقات کر کے خانہ نشینی
اختیار کی۔
ایک دن مخدوم زادۂ والا شکوہ خلف الرشید قاضی القضات
قاضی محمد نجم الدین خاں صاحب، مولوی سعید الدین سلمہٗ کی زبانی دریافت
ہوا کہ صاحبان عالی شان نے لکھنؤ سے کئی شاعر بلوائے ہیں۔ چنانچہ
اُن میں مرزا کاظم علی صاحب کہ جوان تخلص کرتے ہیں، تشریف لائے ہیں۔
اس نوید بہجت اثر سے دل کو نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ احقر
نے انہی کے فیض کلام سے طریقہ شعر و شاعری کا اور فن سخن آوری کا حاصل
کیا تھا۔ اُسی وقت بے تامل اُن کی خدمت میں جا کر حاضر ہوا۔ اور
شرف اندوز ملازمت۔
ازبس کہ عنایت بے حد قدیم سے تھی۔ نہایت توجہ فرماتے ہوتے
اور ارشاد کیا کہ تعجب ہے کہ تم اس شہر میں رہو اور مسٹر گلکرسٹ صاحب
سے ملاقات نہ کرو کہ جوہر شناس گوہر لفظ و معنی ہیں اور فن نکتہ دانی
میں لاثانی۔ چنانچہ صاحب موصوف نے بموجب ارشاد صاحبان عظیم
الشان لکھنؤ میں اسکاٹ صاحب (رزیڈنٹ) کو لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی

اس فن کا کہ قصہ کہنے میں مہارت رکھتا ہو تو اُسے مقرر بھیجا چاہیئے۔ لیکن وہاں سے جواب آیا کہ کوئی شخص اس فن کا ادھر کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اب تم چلو اور صاحب موصوف سے ملاقات کرو۔

چنانچہ اپنے ہمراہ لے کر ملازمت کروائی۔ صاحب موصوف ملاقات کے وقت گفتگو سے اس احقر کی نہایت خوش ہوئے، اور ازراہ الطاف و بندہ نوازی کے فرمایا کہ "تم خاطر جمع رکھو۔ ہم تمہارے واسطے حتی المقدور سعی میں کوتاہی نہ کریں گے۔ ہمارے لئے قصہ امیر حمزہ کا زبان ریختہ میں تصنیف کرو۔"

یہ موجب فرمانے کے احقر اس کام میں مشغول ہوا۔ چند داستانیں لکھی تھیں کہ سبب سے زمانے کی ناتواں بینی کے طبیعت پر گرانی گذری۔ پھر آکر خانہ نشین ہوا، اور گوشۂ عافیت کو اختیار کیا۔

یہ احوال سن کر مولوی سیدالدین صاحب نے توجہ فرمائی۔ لے جا کر خداوند نعمت ہربرٹ ہارنگٹن صاحب عالی جاہ سے ملازمت کروائی۔

صاحب عالی ہمت نے فرمایا: "خاطر جمع رکھو۔ ہم تمہاری خاطر کونسل میں لکھیں گے۔ اور سب دفتر امیر حمزہ کے تصنیف کراویں گے"۔

چنانچہ اُنہیں کی شفقت بے پایاں سے سبب روزگار کا ہوا۔ اور مسٹر گلکرسٹ صاحب نے موصوف سے احقر کو مانگ لیا اور اُسی روز سے مقرر کیا کہ شب کو ہندی درس کے روز کالج میں بعد کھانے کے بندے کو لے کر اوپر کے مکان میں درمیان میں صاحب عالیشان کے بیٹھا کرتے۔ اور یہ احقر جو کچھ تقریر کرتا وہ صاحبان کو انگریزی میں

میں تفہیم کرتے۔ چنانچہ اکثر اس تقریر سے از راہ بندہ پروری فرماتے:
"کہ صاحبان کو تمہارے فیض صحبت سے اس زبان میں نہایت ترقی
ہوئی۔ سب صاحب تعریف تمہاری کرتے ہیں۔

بعد چندے کے جب صاحب موصوف نے کالج میں رات کو جانا
موقوف کیا، بندے کو بھی اس خدمت سے باز رکھا۔ اور منشیوں میں درجۂ
اول کے مقرر کر کے فرمایا: "ہمارا جی نہیں چاہتا کہ تم بیکار رہو۔ اب تو
اسے قبول کرو۔ بعد چندے کے تمہاری خاطر کوئی اور کام لائق تمہارے
تجویز ہوگا۔"

جب سے یہ کمترین فُرصت میں ہوا۔ اور بہ موجب صاحب موصوف
کے فرمانے کے اس عدم فرصت میں، اپنے صاحب کو پڑھانے اور سرکاری
فرمائشات بجالانے کے بعد راتوں کو محنت کر کے دو جلدیں امیر حمزہ کے
قصے کی کہیں۔ اور رسالۂ کائنات جو، کا، کہ فن حکمت سے تعلق رکھتا ہے،
تصنیف کر کے حضور عالی شان میں گذرانا۔ اور قصہ رضوان شاہ کا کہ بہ نگار
خانۂ چین موسوم ہے، واسطے صاحب عالی شان خداوند نعمت مسٹر
مار وانٹ رکٹس صاحب کے تصنیف کیا۔ اور احوال ان کتابوں کا ہر
خورد و کلاں پر ظاہر ہے۔

اُب سن ہجری بارہ سے اُنیس میں مطابق اٹھارہ سَو ۱۸۰۵ء
پانچ عیسوی کے فرمائش سے اُس منبع جود و سخا، یعنی جناب
مار وانٹ رکٹس صاحب بلند اختر کے واسطے مدرسۂ جدید
کے، اس تاریخ کو لکھا۔ چنانچہ صاحب عالی قدر کی فرمائش
یہ تھی کہ ابتدائے بنیاد دلی سے سنہ حال تک شاہ عالم کے،

شہر مذکور میں کتنے بادشاہ ہوئے، اس احوال کو لکھو۔ سو حقیر نے یہ کتاب اُسی طور پر لکھی، اور نام اس کا انتخاب سلطانیہ رکھا۔ کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی پائی“۔[1]

خلیل علی خاں اشک کی سب سے اہم تالیف اس میں شبہ نہیں کہ قصہ امیر حمزہ ہے۔ یہ کتاب اُنہوں نے ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اُردو میں لکھی۔ چنانچہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”بُنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے، اُنہوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں کہیں۔ واسطے بادشاہ کے سنانے کے۔ اس کے سننے سے آئین ہر طرح کی خلقت کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے منصوبے لڑائیوں کے، اور قلعہ گیری کے اور ملک گیری کے یاد آتے ہیں۔ اس خاطر ہر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کی مصلحت کا درماندہ نہ رہے۔ اور اب عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے، بہ موجب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے، واسطے نو

---

[1] خلیل علی خاں اشک: انتخاب (بحوالہ محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۱-۳۰۳)

آموزان زبان ہندی کے، اس قصے کو زبان میں اُردوئے معلی.
کی لکھا، کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"[1]
اور آخر میں اس داستان کے موضوع اور اس کی تالیف و ترتیب
کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آخر ہوئی جلد اوّل قصہ صاحب قراں امیر حمزہ نامدار عم رسول
آخر زماں کی۔ از بس کہ یہ احقر العباد قصد رکھتا تھا کہ بائیسوں
جلدوں کو تصنیف کرے۔ پر زمانے نے نہ چاہا جس پر بھی اس
اول میں اسی داستان مع منفرد و مرکب لکھی ہیں۔ مفرد داستان اور
مرکب ،بعض داستان اس میں دو داستان کی ہیں، اور بعض تین
کی ۔سب ملاکر اسی داستان ہوئی۔ یہ تصنیف ملا جلال بلخی کی
ہے ۔ اس جلد کو مولد قصہ کہتے ہیں یعنی بنیاد قصہ۔ اس چار
جلد تک قصہ خرد سال ہے، یعنی لڑکا۔ اور ہرمز نامہ کی جلدوں
کو نوجوانی قصہ کہتے ہیں ۔ اور کوچک باختر و بالا باختر عین جوانی
غروبیا اور شمالیہ و پائین باختر —— اور ایرج نامہ کی جلدوں
کو آخر جوانی مشہور کیا ہے ۔صندلی نامہ کی جلدوں کا نام شروع
پیری رکھا ہے ۔ اور نواج نامہ کو عین پیری۔ لعل نامہ میں قصہ
آخر ہوتا ہے ۔ ان نو دفتروں میں بائیس جلدیں مشہور کی ہیں۔
اس میں سب احوال صاحب قران کا ہے ۔ اور کوئی عیاری

---

[1] خلیل علی خاں اشک : قصہ امیر حمزہ (قلمی نسخہ برٹش میوزیم
لندن) ص ۴ - ۵ -

چہ تر یا حکایت زمانے میں ایسی نہ ہوگی جو اس قصے سے باہر
ہوگی۔ چنانچہ استادوں نے عجیب عجیب طرح کی لڑائیاں، خانہ
جنگیاں، قلعہ گیریاں شبخون، قزاقی، حصار بائیاں لکھی ہیں۔ اور
چوریاں، عیاریاں، مکاریاں، جہاں تک ہیں، سب اس میں
ہیں عشق اور طلسم اقسام کے۔ غرض کوئی افسانہ اس سے باہر
نہیں۔ سنہ بارہ سے سترہ مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے یہ
جلد دفترخانے میں مسٹر جان گلکرسٹ صاحب عالی جاہ والا
مناقب کے تیار ہوئی۔"[1]

یہ کتاب گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں بار بار چھپ کر شائع ہوئی
ہے۔ لیکن اس میں ترمیم و اضافہ بھی ہوتا رہا ہے۔ سید وقار عظیم صاحب
لکھتے ہیں:

"فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشک نے داستان امیر
حمزہ کو چار حصوں میں ترجمہ کرکے اسے ایک جلد کی شکل میں
ترتیب دیا۔ اس کا سنہ ترجمہ و تالیف ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ
ہے۔ اس کتاب میں محمد عبداللہ بلگرامی نے ۱۸۷۱ء میں نول
کشور والوں کے لئے نظر ثانی کی۔ اور پھر اس نظر ثانی کے بعد
۱۸۸۷ء میں نول کشور کے ایما پر شیخ تصدق حسین نے اس
پر مزید نظر ثانی کی۔ آج کل بازار میں داستان امیر حمزہ کے نام
سے جو کتاب عام طور پر بکتی ہے وہ یہی نول کشور والی شیخ

---

[1] خلیل علی خاں اشک: قصہ امیر حمزہ (قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)
ص ۱۸۰ - ۲۸۱ -

تصدق حسین کی نظر ثانی کی ہوئی کتاب ہے"۔[1]

داستان امیر حمزہ کے علاوہ اشک نے تین علمی کتابیں لکھیں۔ ان میں ایک تو رسالہ کائنات جو، ہے دوسری انتخاب سلطانیہ اور تیسری واقعات اکبر۔

رسالۂ کائنات جو خلیل علی خاں اشک کی ایک اہم تالیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن حکمت اور سائنس کے علمی موضوع پر پہلی کتاب ہے جو فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی۔ اشک نے اس کو بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"بعد حمد لایزال اور نعت رسول بے مثال اس احقر العباد خلیل علی خان اشک نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے عصر میں شاہ عالم بادشاہ خلداللہ ملکہ کے اور وقت میں امیرالامرا زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلق کشور ہند کے یہ رسالۂ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سے سترہ مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے زبان ریختے میں بہ موجب مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام دولتہ، کی مصلحت کے، واسطے اس نیسان سخا کے، کہ جس کے رشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے۔ یعنی گوہر یکتائے دریائے امارت و شجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگٹن صاحب

---

[1] سید وقار عظیم: ہماری داستانیں (پہلا اڈیشن لاہور) ص ۱۹۹۔

عالی جاہ کہ ہر بلند اختر سے جس کا پائے قدر عالی و برتر ہے تصنیف کیا"[1]

یہ کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں کائنات، اس کی تخلیق اور اس کے مختلف عناصر، دوسری فصل میں ابر و باراں تیسری فصل میں برف، ژالہ، میغ و شبنم و پشک چوتھی فصل میں برق و رعد اور صاعقہ پانچویں فصل میں ریاحات و اعصار، چھٹی فصل میں قوس قزح اور ہالۂ ماہ و تفاوۂ آفتاب، ساتویں فصل میں شہاب ثاقب و ذوات اذناب اور حریق، آٹھویں فصل میں زلزلے کی حالت نویں فصل میں چشموں کی پیدائش اور دسویں فصل میں کرۂ زمین اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس میں جو اسلوب اور انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ صاف سادہ اور سلیس نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُس وقت اردو میں علمی کتاب لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ خاص طور پر علمی اصطلاحات کا ذخیرہ تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل علی خان اشک کو اس سلسلے میں عربی اور فارسی کی طرف رجوع ہونا پڑا ہے۔ اور اس صورت حال نے اس کے اسلوب میں عربی فارسی کے اثرات کو ذرا نمایاں ضرور کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک مانوس سی فضا نظر آتی ہے اور مجموعی طور پر پختگی اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔

---

[1] خلیل علی خان اشک : رسالۂ کائنات جو (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۴۔

یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔ راقم کو اس کا ایک نسخہ رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لندن میں ملا ہے۔ اور اب یہ ایک نئی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ شائع ہونے والی ہے۔

انتخاب سلطانیہ اور واقعات اکبر تاریخی کتابیں ہیں۔ انتخاب سلطانیہ ۱۲۱۹ھ میں مار وانٹ رکٹس کی فرمائش پر اردو میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں اشک نے ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ واقعات اکبر ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے لکھی گئی۔ یہ کتاب ابوالفضل کی فارسی کتاب اکبر نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔ راقم کو ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ یہ کتابیں بھی جلد شائع ہوں گی۔

خلیل علی خاں اشک نے داستان امیر حمزہ کے علاوہ ایک اور داستان گلزار چین کے نام سے بھی لکھی تھی جو اس مقدمے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ نہایت دلچسپ داستان ہے۔ اس میں اُنہوں نے رضوان شاہ شہزادۂ چین اور روح افزا شاہ جن کی بیٹی کے عشقیہ قصے کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب اشک نے جانائن ہنری لوٹ کی خاطر ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں لکھی اور اس کا ایک نسخہ نہایت اہتمام سے تیار کر کے مار وانٹ رکٹس کو بھی پیش کیا۔ کتاب بہت پسند کی گئی۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"وقت میں خدیو ملک شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، خورشید فلک حکومت کے، اور عصر میں صاحب عدل و داد، آبادی ملک مراد، عادل زماں، باذل جہاں، حاتم وقت، امیر

الامرا، زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلقہ کشور ہند کے سن ہجری بارہ سو انیس (۱۲۱۹ھ) اور اٹھارہ سو چار عیسوی ۱۸۰۴ء میں اس بے نام و نشاں خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے اس قصے کو اس اختر برج اقبال، گوہر درج جاہ و جلال، نیر اعظم، سپہر کرم، دریائے سخا، کان عطا، مطلع امارت، مقطع شجاعت، نواب اعتماد الدولہ مشیر الملک جاناتن ہنری لوٹ نصرت جنگ بہادر دام دولتہٗ کی خاطر زباں میں اُردوئے معلیٰ کی تیار کیا، کہ اس کے مطالعہ فرمانے سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو۔ اور رشحہ فیض اس ابر اقبال کا اس تشنہ زلال کرم کو ہادی راہ ہو کر خضر وار منزل مقصود کو پہنچاوے۔ لیکن جب یہ رسالہ مانند درج جواہر لبریز ہوا اور اکثر گوہر مضامین اس کے گوش جان میں سامعان سخن سنج کے پہنچے گنج آفرین و تحسین سب نے اس کمترین کو عنایت فرمایا۔“ [۱]

اور اختتامیہ میں اپنے ممدوح کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

”اے ممدوح! تیری جناب وہ فیض بخش ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر تیرے مداح کا ہر بن مو بہ رنگ شمع ہزار زبان پیدا

---

[۱] خلیل علی خان اشک گلزار چین: (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) ص ۴۔

کرے پر ہرگز شکرانۂ احسان کو ادا نہ کر سکے۔ چنانچہ ایک پتھر
خلقت میں مشہور ہے جس کو لوگ پارس کہتے ہیں۔ اس میں
یہ خوبی ہے کہ لوہے کو سونا کرتا ہے۔ پر اگر وہ چاہے کہ تیرے
سنگ آستاں کی منزلت کو پہنچے سو کیا تاب؟ اس میں وہ
مقدور کب کہ جو پتھر اس کو آ کر لگے اسے وہ پارس کر دے۔
پس اس خاطر یہ نسخہ لکھ کر حضور اقدس میں گذرانا ہے کہ نظر
کیمیا اثر سے گذر کر سرکار عالی میں داخل ہو، کہ یہ بے نام و
نشان بھی اس کے سبب ناموری پیدا کرے، اور دعائے
عمر و دولت میں مشغول رہے۔" [1]

گلزار چین کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس کی نظم و ترتیب میں وہ
انفرادی شان ہے جو فنی اعتبار سے ایک اعلیٰ درجے کی کہانی کے پلاٹ
میں ہونی چاہیئے۔ اگرچہ اس داستان کی بنیاد مافوق الفطرت عناصر
پر استوار ہے لیکن اس کے باوجود یہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور اس
میں بڑی دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان عناصر
کے باوجود اس میں شروع سے آخر تک انسانی رنگ و آہنگ کو نمایاں
کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں میں بھی بڑی زندگی اور جولانی پیدا کی
گئی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات کو بھی بڑے
سلیقے سے اُبھارا گیا ہے۔ اور فضا و ماحول کی مصوری میں بھی بڑی

---

[1] خلیل علی خان اشک: گلزار چین (قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی
لندن) ص ۱۲۳۔

چابک دستی دکھائی گئی ہے۔ اس کا اسلوب اور اندازِ بیان کہیں کہیں مرصع ضرور ہے۔ کہیں کہیں اس میں رنگینی اور پرکاری بھی اپنا جلوہ ضرور دکھاتی ہے، لیکن ساتھ ہی سادگی اور روانی کا حسن بھی نمایاں نظر آتا ہے ـــــ اور ان دونوں کے حسین اور متوازن امتزاج نے اس داستان کو فنّی اعتبار سے ایک شاہکار بنا دیا ہے۔

عبادت بریلوی

۲۵ / اپریل ۱۹۶۶ء

جُرأت اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری میں ایک مخصُوص رنگ نکالا۔ اُس کو ایک نئے طرز سے آشنا کیا۔ اُس میں نئے انداز کے چراغ جلائے۔ نئی رنگ کی شمعیں فروزاں کیں۔ وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہ ذاتِ خود ایک دُنیا تھے۔ اس لئے انھوں نے شاعری میں بھی ایک نئی دُنیا پیدا کی — یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اُن کی شاعری کے ساتھ ذہنی مطابقت پیدا نہ کر سکے۔ میرؔ صاحب نے اُن کی شاعری کو "چُوما چاٹی" سے تعبیر کر کے اور شیفتہؔ نے اُن کے نغموں کو "خارج از آہنگ" کہہ کر شاعری اور تنقید دونوں پر بڑا ستم کیا ہے — اِس سے بھی بڑا ستم آزادؔ نے

کیا کہ بعض واقعات کو نقل کر کے اِس قسم کے خیالات کو تقویت پہنچائی نتیجہ یہ ہے کہ جُرأت کو ایک معاملہ بند اور فحش گو شاعر تصوّر کر لیا گیا اور ہمارے نقّاد تک صرف اسی لکیر کو پیٹتے رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں جو زندگی اور جولانی، جو شگفتگی اور شادابی، جو بانکپن اور طرحداری ہے، وہ اُردو شاعری میں کہیں اور ذرا مشکل ہی سے مِل سکتی ہے۔ میر حسن نے "بسیار درد مند و گداز" کہہ کر اُن کے کلام کی داد دی ہے لیکن یہ اُن کا خاص رنگ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے دیوان میں خاصی تعداد ایسے اشعار کی ملتی ہے جن میں درد و غم کا بیان ہے لیکن اُن میں دردمندی اور گداز کی خصوصیات ناپید ہیں۔ اُن کے ایسے اشعار جذبے سے خالی ہیں۔ اُن میں اخلاص مندی اور صداقت کا لہو نہیں ہے۔ اِسی لئے وُہ بے جان نظر آتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں تو زندگی کا احساس وہاں ہوتا ہے جہاں وُہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحوں کی لطیف ترین کیفیات کی مُصوّری کر کے رنگ و نُور کے دریا بہاتے ہیں۔

شیخ قلندر بخش جُرأتؔ دِلّی کے رہنے والے تھے۔ اُن کا نام یحییٰ امان تھا۔ اُن کے والد حافظ امان کے نام سے مشہور تھے۔ خاندان کا سلسلہ رائے امان سے مِلتا ہے جو عہدِ محمّد شاہی میں دربان تھے۔ جب نادر شاہ نے دِلّی پر حملہ کیا تو رائے امان بھی گرفتار ہُوئے، اور نادر شاہ کے جلّادوں نے اُنہیں قتل کر دیا۔ دِلّی کے چاندنی چوک میں رائے امان کا کُوچہ مشہُور ہے۔ یہ اُنہیں کے نام پر ہے۔ جُرأتؔ اِسی رائے امان کے کُوچے میں پیدا ہُوئے۔ اُن کی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس باب میں خاموش ہیں۔ اُن کے ہم عصروں تک نے اِس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔

مُصحفی نے صرف اتنا لکھا ہے۔

"جُرأت تخلّص یحییٰ امان است۔ قلندر بخش نام دارد۔ یحییٰ امان نامِ آبائی اوست۔ بدیں جہت کہ خود را از اولادِ بچے رائے امان می گوید۔ اُو شخصے گزشتہ کہ ہنوز در محلّہ کہ مُتّصل چاندنی چوک جائے بُود و باشِ اُو بُود بہ کوچہ رائے امان شہرت دارد۔ مُشارٌ الیہ از انقلاب زمانہ مع عشائر در صغرِ سِن بہ پُورب رسیدہ واہم ایں جا نشو و نما یافتہ و جوان گردیدہ۔ از ابتدائے موزونیٔ طبع مشقِ ریختہ پیش میاں جعفر علی حسرت کردہ کلامِ خود را بہ پایۂ پُختگی رسانیدہ۔ چُنانچہ الحال بقولِ جمہور از اُستادِ خویش پائے کمی نمی آرد۔ و در شعرِ خود تلاش ماتیانہ بسیار می کُند۔ و یاسِ تمام از کلامش تراود و مزاجش بہ طرف مسلسل گوئی و غزل در غزل گفتن بیشتر مائل است۔ شاگردانِ بسیار بہم رسانیدہ و معہذا در علمِ نجُوم ہندیاں دستار نوازی نیز مہارتے دارد حیف کہ چشمش در عین جوانی بہ یک ناگاہ نابینا شُد"۔[1]

اور میر حسنؔ نے صرف اتنی تفصیل پیش کی ہے:

"میاں قلندر بخش المتخلّص بہ جُرأت از شاگردان میاں حسرت جوانے ست، چیچک رُو، خوش خُلق و نیک خُو، کلامش نمکین و بیانش شیریں۔ دستگاہِ شعورشِ چوں دِل صاحب ہمّتاں فراخ و گلزارِ معانیش چُوں میوۂ آرزُو شاخ در شاخ۔ اصل از شاہجہان آباد، نشو و نما در فیض آباد یافتہ، شوقِ شعر از حد زیاد دارد۔ اگرچہ در علمِ

---

[1] مُصحفی: تذکرہ ہندی، ص ۶۲، ۶۳

موسیقی دستار نوازی نیز دستے بہم رسانیدہ لیکن آنچہ گویند دیوانہ فنِ شعر ست کہ گاہے بے فکر نمی ماند۔ بسیار درد مند وگداز است۔ مثنوی، ہجو برسات وکھٹمل نامہ ہم گفتہ۔ دریں نوجوانی بسیار بہ حلم وحیا بسر می بُرد۔ خداش سلامت دارد"۔ ؎۱

اور قُدرت اللہ قاسمؔ نے مجمُوعۂ نغز میں لکھا ہے:

عُزیزے است شیریں کلام قلندر بخش نام لُطفِ طبعش از اشعارِ آبدارش پیداست ومہارتِ دے دریں فن از کثرتِ مشقش ہویدا۔ در نجُوم وموسیقی اندکے دست دارد و ستار خُوب می نوازد۔ نیا گانش بہ دربانیٔ دربارِ دُربار سرِ افتخار بہ آسماں می سُودند۔ اصلش از حضرتِ دہلی است۔ اگرچہ از چندے بہ لکھنؤ رختِ اقامت افگندہ۔ افسوس کہ در عین عنفوانِ شباب چشمِ جہاں بینش از نُورِ بینائی بے آب گشتہ۔ مشقِ سخن در ابتدا از میاں جعفر علی حسرتؔ نمودہ وبنا بر کثرتِ توغُّل ومناسبتِ طبعِ رفتہ رفتہ گوُئے سبقت از شعرائے دیارِ مشرق ربُودہ و بہ سبب سیرِ مشقی حسبِ رواج آں دیار آنچناں اشعارِ ابدار از طبعِ گوہر بارش تراوش می کُند کہ مقدُور فصُحائے آں جانیست وجمِّ غفیرے از سکنۂ لکھنؤ نسبت تلمذُّ بہ وَے دارند وگروہے کثیر وَے را دریں فن شریف بے مثل وعدیل پندارند"۔ ؎۲

؎۱ میر حسن: تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۱۴۵

؎۲ میر قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، ص ۱۵۵

اور شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں اُن کے حالات کی صرف اتنی وضاحت کی ہے :

" جرأت تخلّص قلندر بخش نام۔ سلسلۂ نسبش بہ رائے مان محمّد شاہی کہ بہ دستِ جلّادانِ نادری گرفتار آمد و مردانہ جاں داد می رسد۔ در عملِ موسیقی لافِ نکتہ دانی میزد و می رسیدش۔ ستار نیکو نواختے و لختے از احکامِ سیر انجم نیز شناختے۔ نیک و بدِ زمانہ کمتر دیدہ چشم از نظّارہ بربست۔ رُوئے نیکواں بہ حسرت نتوانست دید۔ بہ صحبتِ مہ لقایاں و نغمہ سرایاں سرے داشت۔ روزگارے از خوانِ نوالِ مرزا سُلیمان شکوہ بہادر کامیاب و بہرہ مند بود۔ آں جا بہ انشاء و مُصحفی مطارحہ کردے و بیک ردیف و قوافی سُخن گُفتے۔ امروز مُردنش را زیادہ از بیست سال گزشتہ "[1]

اِن بیانات سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جرأت دِلّی میں پیدا ہُوئے۔ لیکن وہاں کی پریشانیوں سے تنگ آ کر بچپن ہی میں پُورب کی طرف چلے گئے پہلے فیض آباد میں رہے پھر لکھنؤ میں قیام رہا اور یہیں جوان ہُوئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد ہُوئے۔ فنِ شاعری کے علاوہ علمِ موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں بھی کمال حاصل کیا۔ علمِ نجُوم سے بھی دلچسپی لی اور اس میں بھی اُنہوں نے خاصی مُہارت حاصل کی۔ ایک زمانے تک مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت میں رہے اور وہاں انشاء اور مُصحفی کے ساتھ مل کر شاعری کا ماحول پیدا کیا۔ عینِ عنفوانِ

---

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: صہ۴۸

شباب میں نابینا ہوگئے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی بھر دیوانۂ فن شعر رہے۔ صحبتِ مہ لقایان ونغمہ سرایاں اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اُنھی صحبتوں کے اسرار و رُموز اور نشیب و فراز کو اُنھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن دردمندی اور گداز کی خصوصیات بھی اُن کی شاعری میں ملتی ہیں:

بہرحال جُرأت دِلّی میں پیدا ہُوئے لیکن بچپن ہی میں وہاں سے فیض آباد گئے اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اُن کی شخصیت اور شاعری کی نشوونما اُنھی مقامات پر ہُوئی۔ شاعری کا شوق تھا۔ میاں جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی اور اِس فن میں بڑا نام پیدا کیا۔ اُن کے تمام ہم عصروں نے اُن کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ حافظ رحمت خاں کے بیٹے نواب محبت خاں اور مرزا سلیمان شکوہ کے درباروں میں گزارا۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

جب میاں جُرأت کا باغ دہر سے ۔ گلشنِ فردوس کو جانا ہُوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا ۔ ہائے ہندوستان کا شاعر مُوا

جُرأت اپنے زمانے کی مشہور شاعرانہ شخصیت تھے۔ آزاد نے 'آبِ حیات' میں اُن کی شخصیّت کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے ؎

جُرأت میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فنِ شاعری کے نُجُوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا شوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار خُوب بجاتے تھے۔ اوّل نواب محبّت خاں خلف حافظ رحمت خاں نوابِ بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں اور اُن کی صُحبتیں بہت گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا ؎

بس کہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بُستاں کے
ہُوئے نوکر بھی تو نواب محبّت خاں کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں مُلازم ہوئے ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہُوئی۔ حُسنِ طلب میں غزل کا مقطع لکھا ہے

جُرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خُدا دیوے نہ جب تک تو سُلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے "تا خُدا نہ دہد سُلیماں کے دہد"۔ میاں جُرأت کے حال میں بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذُور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہُوا مگر اُستاد مرحُوم نے ایک دن فرمایا کہ بھئی زمانے کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے اُن کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنُما داغ اُن کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے۔ بعض ضرورتوں سے کہ شوخیٔ عُمر کا مقتضےٰ ہے خُود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہو گئے۔

"بزرگوں کا قول کہ شرافت اور نجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اُصول و آئین غریبوں ہی سے خُوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جُرأت کی خوش مزاجی لطیفہ گوئی مسخراپن کی حد سے گُذری ہوئی اور ہندوستان کے امیروں کو اس سے ضروری نہ کوئی کام نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سیّد انشاء کا اور اُن کا یہ حال

تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے آج ایک امیر کے ہاں ہیں۔
دُوسرے دن دُوسرے امیر آئے۔ سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔
چار پانچ دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے وہاں وُہ لے گئے۔
جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجُود
رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں اُن کے
چُٹکلے اور نقلیں سُنیں۔ بہت خوش ہُوئیں اور نواب صاحب سے
کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا
چلمنیں چھُٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھتیں، باہر یہ بیٹھتے۔ چند روز
کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہ گیا۔ باقی گھر
والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ
آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا، کوئی ماموں
چچا کہتا شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضُعفِ
بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذُور ہو گئیں۔ مطلب
یہ تھا کہ دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلُّف گھروں
میں جانے لگے۔ اب پردے کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے
کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اُس سے
جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سو کر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے
لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا — لونڈی نہ بولی۔
اُنہوں نے پھر پُکارا اُس نے کہا کہ بیوی جاضرور میں لے گئی
ہیں۔ اُن کے مُنہ سے نکل گیا کہ غیبانی دوانی ہُوئی ہے، سامنے
تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔

لونڈی گئی کہ دُوئی بیوی! یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے۔
یہ تو خاصا سُجھکھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزُری۔ اُس
وقت یہ راز کھُلا۔ مگر اس میں شُبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔[1]"

ہر چند کہ آزاد کی بنائی ہوئی جُرأت کی یہ تصویر بڑی حد تک خیالی ہے اور اس میں اُن کے ذہن و تخیّل کے رنگ بڑے گہرے ہیں۔ لیکن اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ میاں جُرأتؔ کی زندگی کا انداز کیا تھا؟ وہ کس ماحول کی پیداوار تھے؟ اور اس ماحول میں اُن کی کیا کیفیّت تھی؟ اس کیفیّت کی جھلک اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اُن کی شخصیت کا صحیح آئینہ ہے ــــ اپنی شاعری میں وہ حُسن کا بیان کرتے ہیں۔ اُس کے سراپا کی تصویریں کھینچتے ہیں اور اُس کے ہاتھوں جسم اور رُوح میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اُس کی مُصوّری کرتے ہیں۔ وہ انسان اور انسانی زندگی کے جسمانی اور جذباتی رشتوں کے شاعر ہیں ــــ ان رشتوں کے مختلف پہلوؤں کی ساری تفصیل و جُزئیات اُن کی شاعری میں پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔

جُرأت پُرگو شاعر تھے۔ اُنھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سُخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُنھوں نے غزلوں کا ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ مثنویاں، رُباعیاں، مخمّس، مسدس، ہفت بند، مرثیے اور سلام بھی لکھے ہیں۔ اُن کے کلام کا انتخاب تو کئی بار شائع ہُوا جس میں سب سے اہم وہ ہے جس کو مُختار الشعراء کے سلسلے میں سیّد حُسین بلگرامی نے ۱۸۹۷ء میں آگرے سے

---

[1] آزاد: آبِ حیات، ص ۲۳۸-۲۳۹

شائع کیا تھا۔ کلیاتِ جراَت صرف ایک بار ۱۸۸۳ء میں مطبع کارنامہ لکھنؤ میں بہ اہتمام محمد یعقوب چھپ کر شائع ہوا لیکن یہ اب بالکل نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف بھی ہیں۔ لیکن یہ بھی جراَت کا مکمل کلیات نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے مرتب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے سات نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کو مرتب کیا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

"کلامِ دلفریب عاشقانہ و نظمِ دل پسندِ شعرائے زمانہ، بلبلِ شیریں زباں، عندلیبِ سحر بیان، مملو بہ فصاحت و بلاغت یعنی کلیاتِ شیخ قلندر بخش جراَت شاگرد مرزا جعفر علی حسرت جس کا ایک عالم مشتاق نظر آتا تھا۔ متلاشی نایابی سے صدمۂ حرمان اٹھاتا تھا۔ ہیچمیرز نے بڑی تلاش سے سات نسخے بہم پہنچا کے مقابلہ کیا اور بعد تکمیل و ترتیب حلیۂ تصحیح سے آراستہ کر کے کاغذ فرنچ پر چھاپ دیا اور صفحے میں پچاس شعر لکھے تاکہ یہ دفترِ عظیم ضخامتِ قلیل قبول کر لے تاکہ ناظرین کو سیر کرنا شاق اور شائقین کو مول لینا دشوار نہ گزرے۔ چنانچہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو مطابق فروری ۱۸۸۳ء میں کلیات زیورِ طبع سے پیراستہ ہو کر مثلِ یوسفِ کنعان بازارِ مصر میں شائع ہوا۔"[1]

اس نسخے میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف بھی ہیں، لیکن جراَت کی چند طویل مثنویاں اور مراثی و سلام اس نسخے میں نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا

---

[1] کلیاتِ جراَت: مطبوعۂ کارنامہ لکھنؤ: ص ۲۷۲

ہے کہ اس کو مُرتّب کرنے والے نے جن قلمی نُسخوں کو اپنے سامنے رکھا اُن میں مثنویاں اور مراثی وسلام موجُود نہیں تھے۔

جُرأت کے کلام کے بے شمار قلمی نسخے ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے کُتب خانوں میں ملتے ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ اہم دو ہیں۔ ایک تو برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ـــــ برٹش میوزیم کا نسخہ نہایت خوبصورت نستعلیق میں اعلٰے درجے کے کاغذ پر لکھا ہُوا ہے۔ یہ نسخہ جُرأتؔ کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ اس میں ۴۲۸ ورق ہیں۔ پہلے ۳۰۲ صفحات میں غزلیں ہیں۔ اس کے بعد فردیات، رُباعیات، مُسدّس، مُخمّس، ہفت بند، ترجیع بند، مقطع، سلام، مرثیے اور مثنویاں ہیں۔ یہ نُسخہ محمدؐ خاں صاحب کے لئے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

تمام شُد کلیاتِ میاں جُرأتؔ از برائے خاطرداشت محمدؐ خاں سلّمہ اللہ تعالیٰ از دستِ احقر العباد محمدؐ امین بیگ ساکن دہلی غفر اللہ ذنبہٗ۔"[1]

اِس نُسخے میں ایک طویل غیر مطبُوعہ عشقیہ مثنوی بھی شامل ہے جس کا تاریخی نام "داستانِ حُسن و عشق" ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۹۱ھ میں لکھی گئی۔ اِس میں کوئی ۹۰۰ کے قریب اشعار ہیں۔

اِس تصنیف کا سبب جُرأتؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے ؎

مجھے مُدّت ہوئی یہ جستجو تھی   یہی خواہش تھی اور یہ آرزو تھی

---

[1] کلیاتِ جُرأت، قلمی نسخہ برٹش میوزیم: ص۴۲۸

کہ اِک قصّہ سُنا دے کوئی مغموم — تو اس کو کیجیے ہندی میں منظوم
ولے قصّہ وہ دردِ عشق کا ہو — کہ جُوں کوئی سُنے دیوے وہیں رو
سو کانوں بھی سُنا آنکھوں بھی دیکھا — رہا ہرگز نہ کچھ خطرہ بُرے کا
کیا مَیں من و عَن سب اُس کو تحریر — نہیں جھُوٹی سرِ مُو، میری تقریر
یہی ہے فرق افسانوں میں اِس میں — دروغ و راستی دیکھو ہو کس میں
سُنی کہتے ہیں سب دیکھی کہی مَیں — اُنہوں نے جھُوٹ اور سچّی کہی مَیں

یہی تاریخ اب اس کی عیاں ہے
یہ حُسن و عشق کی اک داستاں ہے

یہ مثنوی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے میں بھی موجود ہے۔ یہ نُسخہ بھی خاصا اہم ہے کیونکہ یہ بھی جُراَت کی زندگی ہی میں لِکھا گیا تھا۔ اُس کے آخر میں یہ عبارت مِلتی ہے:

"برائے جناب نواب محبّت خاں پسر نواب حافظ رحمت خاں صاحب نوشتہ، فقیر منہاس الدین لکھنوی، ۱۲ شعبان ۱۲۲۳ھ"[1]

برٹش میوزیم لندن اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اِن دونوں قلمی نسخوں میں ایک فرق یہ ہے کہ میوزیم کے نُسخے میں جُراَت کے کچھ مراثی اور سلام بھی شامل ہیں جو پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں نہیں ہیں۔ اسپرنگر نے اپنی اودھ کیٹلاگ میں کُلّیاتِ جُراَت کے ایک قلمی نُسخے کا ذکر کیا ہے جس میں جُراَت کے مراثی و سلام موجُود تھے۔ میں نے جب سے اسپرنگر کا یہ بیان پڑھا تھا، مجھے اِن مراثی و سلام کی تلاش تھی۔ اتفاق سے مجھے یہ مراثی و سلام برٹش میوزیم کے قلمی نُسخے میں مِل گئے۔ جُراَت کے کسی اور قلمی

---

[1] کلیاتِ جُراَت، قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

نسخے میں یہ مراثی و سلام موجود نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے ان کو مرتب کر کے شائع کرنا مناسب سمجھا۔

یہ مراثی و سلام اُردو مرثیے کی روایت میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے شاعر کی تخلیق ہیں جو زندگی بھر اپنی شاعری میں حُسن و عشق کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرتا رہا لیکن جس کا دل عشقِ رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کی محبت سے سرشار تھا۔ اسی لئے ان مراثی و سلام میں صداقت اور جذبۂ خلوص نے دردمندی اور گُداز کی وُہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس قسم کی شاعری کی جان ہے۔ یہ مراثی و سلام اُس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب اُردو شاعری میں اِس فن کی کوئی عظیم اور مستقل روایت قائم نہیں ہُوئی تھی۔ اِس لئے یہ کچھ اور بھی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی اِسی اہمیت کے پیشِ نظر ان کو شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

شعبۂ اُردو و ثقافتِ پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۵ جولائی ۱۹۶۶ء

(۱۸)

دیوانِ حیدری

یہ بات نواب تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ سید حیدر بخش حیدری دہلوی فورٹ ولیم کالج کے سب سے اہم مُصنّف تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں اردو نثر کی سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں بلکہ بعض نئی اصناف ادب کے تجربے بھی کیے ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کی مختصر کہانیاں غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

ان کہانیوں کو راقم نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے[۱] ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے لکھنے والوں کی طرح صرف مترجم ہی نہیں تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے تخلیقی فن کار تھے۔ ان کی تصانیف اس حقیقت کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ وہ اُردو کے ایک بلند پایہ نثر نگار اور ایک اعلیٰ درجے کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔

لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ انھوں نے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی تھی اور وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ لیکن ان کی نثر نگاری اور انشاء پردازی کو اتنی شہرت ہوئی کہ اس روشنی کے سامنے ان کی شاعری کے چراغ کی روشنی کچھ ماند سی پڑ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے فروغ نہ پانے کا ایک سبب ان کی نثر نگاری اور انشاء پردازی ضرور ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کا کلام ہمیشہ عالم گمنامی میں رہا اور اس تک کسی کی رسائی نہ ہو سکی۔

انگلستان کے دوران قیام میں مجھے سید حیدر بخش حیدری کے دیوان کے دو قلمی نسخے ملے۔ ایک تو برٹش میوزیم لندن کے شعبہ مشرقی کے کتب خانے میں اور دوسرا باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں۔

دیوان حیدری کے ان قلمی نسخوں کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حیدری شاعر کی حیثیت سے بھی ایک بلند مرتبہ شخصیت کے مالک

---

[۱] مختصر کہانیاں مصنفہ سید حیدر بخش حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی شائع کردہ اُردو دنیا کراچی ۱۹۶۴ء

تھے۔ ان کی غزلوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ان کا ایک ایک شعر مجھے تاثیر میں ڈوبا ہوا نظر آیا، اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان اشعار میں جو آواز گونج رہی ہے وہ کسی شخص کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ اس آواز میں بڑے ہی سوز و گداز، بڑی ہی شیرینی اور گھلاوٹ کی کیفیت تھی۔ میں اس سوز و گداز، شیرینی اور گھلاوٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور اپنے مزاج سے مجبور ہو کر اس حقیقت کو تلاش کرنے لگا کہ اس کا منبع کیا ہے۔ چنانچہ اس دیوان کے ایک قلمی نسخے میں مجھے حیدری کی دو ایسی تحریریں ملیں جن میں اس واقعے کا ذکر تھا جس سے متاثر ہو کر حیدری نے شاعری شروع کی اور ایسے ایسے شعر کہے کہ سوز و گداز کے دریا بہا دیئے۔

یہ واقعہ دراصل ان کے عشق کا واقعہ تھا۔ عُنفوان شباب ہی میں وہ ایک ماہ جبین عشوہ کار کے دامِ عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اسی عشق کے گہرے اثرات کے تحت انہوں نے شاعری شروع کی اور اس طرح اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کیا۔ اس واقعے کی تفصیل خود حیدری کی زبانی سُنیئے۔

ایک جگہ اُردو میں اس واقعے کو اس طرح لکھتے ہیں:

"یہ کئی سطریں اس فقرے کے عذر میں ہیں۔

موشگافان شاہد معانی اور غواصان بحر سخن دانی پر روشن ہو کہ یہ ضعیف و نحیف، ہیچ مدان، آمادۂ بے ھُنری، حیدر بخش متخلّص بہ حیدری ابتدائے جوانی سے ایک نازنین مہ جبین، دل آرام، نازک اندام، گلعذار، پری دیدار کے دام میں پھنسا۔ بیت:

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے
وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے

بیت :

اِک ناز جس سے دھر میں فتنے ہیں صد ہزار
اِک چشم جس سے شہر میں کٹتے ہیں بے شمار

"اسی حالت میں بلبل قفسی کی مانند نالہائے حزیں موزون کرنے لگا۔ آخر چند روز کے عرصے میں ایک مجموعہ اشعار کا بنا۔ تب چند فقرے نثر کے بھی بہ طور تالیف و تصنیف کے اس سے الحاق کر کے صاحبان عالی طبیعت کے آگے بہ طریق ہدایہ و نذر کے رکھ دیا۔ اُمیدوار اس بات کا ہے کہ اس کو چشم لطف سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اس کے رطب و یابس پر نہ جائیں۔ کیونکہ کلام کسی بشر کا بلندی و پستی سے خالی نہیں۔ پھر مجھ سے بشر کے سخن میں اگر عیب ہوں تو کیا تعجب ہے۔ میں نے تو شعر گوئی میں کچھ کمال نہیں پیدا کیا۔ بلکہ عروض اور قافیے کو بھی بخوبی نہیں دیکھا۔ مع ھذا کار انسان نسیان ہے، اور سہو اس کا عنوان۔ اب اہل انصاف اور صاحبان الطاف کی خدمت میں التماس کرتا ہے کہ جہاں اس میں حسن دیکھیں اس کی داد دیں، اور جس جگہ عیب نظر پڑے اسے دامن اصلاح سے چھپا دیں"۔[1]

اور فارسی میں اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

"بر ضمیر منیر مہر نظیر ناقلاں اسمار و طوطیان شکر شکن شیریں گفتار، محدثان حدیث و خوشہ چینان خرمن سخن صرافان دار لعیار معانی و دار الضرب نکتہ دانی و محققان شوق انگیز مہر اندوز و مدققان ذوق آمیز محبت آموز، و ھادیان رہ گم گشتگان بادیۂ نادانی و

---

[1] دیوان حیدری : قلمی نسخہ باڈلین آکسفورڈ۔ صفحہ ۲۸۲

رہ نمایان صراط المستقیم جا ودانی پوشیدہ ومخفی نماند کہ اضعف العباد، ہیچ مدان، فقیر حقیر سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری از عنفوان جوانی در تعشق وبلائے نازنین، صنمے، مہ جبینے، دل آرامے، نازک اندامے، گلعذارے، ماہ رخسارے، آھونگاہے، مژگان سیاہے، پستہ لبے، سیمیں غبغبے، مشکیں موئے، کمند گیسوئے، غنچہ دھنے، سیب ذقنے، شیریں زبانے، موئے میانے، سرو قدے، خورشید خدے سراپا نازے، عشوہ پردازے، مہرانگیزے، دلآویزے۔ بیت

نازے و ہزار فتنہ در دھر
چشمے و ہزار کشتہ در شہر

اسیر گشتہ۔ دران حالت دل این بیدل چون بلبل مقفوس نالہائے موزون مانند قمری مجبوس وآواز ہائے حزین آغاز کرد۔ آخر از خار خار جگرو خون خواری جگر مجموعۂ از گلہائے تازہ وبوستانے از سرو آزدہ یعنی اشعار چند آمادہ ساخت۔ بعدۂ فقرات چند نثر بہ طریق تالیف وتصنیف ملحق بہ آن نمودہ پیشِ نظر صاحبان عالی طبیعت بطور نذر وھدیہ گزرانید۔ امید آنست کہ این واماندۂ صحرائے نادانی را بہ خارستان حرف گیری نکشند۔ واگر سہوے وخطائے واقع شدہ باشد بہ ذیل کرم بہ پوشند وہر جا کہ آھو گیرند بگزلک اصلاح بتراشند۔ [1]

حیدری کی شاعری اسی واقعے کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس میں

---

[1] دیوان حیدری: قلمی نسخہ باڈلین آکسفورڈ ص ۱۴

شُبہ نہیں کہ وہ اس کاروبار شوق کی ایک بڑی ہی لذیذ اور دلآویز داستان ہے جس میں جگہ جگہ اس کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی مصوری بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے، اور اس صورت حال نے اس کو ایک اچھا خاصا نگارخانہ بنا دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں وسعت نہیں ہے۔ تنوع بھی اس میں کم ہے۔ گہرائی کا احساس بھی اس میں نہیں ہوتا۔ فن کی پختگی بھی اس میں ہر جگہ نظر نہیں آتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس میں احساس کی جو شدت اور جذبے کی جو اخلاص مندی ہے، اس نے اظہار و ابلاغ کی سادگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بڑے ہی دلکش روپ میں اپنے آپ کو رونما کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری کی روایت میں اس کا کوئی خاص مقام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ دلچسپ ہے اور ایک کرشمہ بن کر قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اُردو افسانے کے ایک اہم فنکار، ایک بہت بڑے نثر نگار اور ایک اعلیٰ درجے کے صاحب طرز انشاء پرداز کے جذباتی نشیب و فراز کی کہانی ہے، اور اس کہانی میں اس کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کو سمجھنے کا بڑا سامان ہے۔

میں نے اسی خیال سے حیدری کے اس کلام کو مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیوان حیدری کے جو قلمی نسخے مجھے دستیاب ہوئے ہیں ان میں غزلیں، ایک مخمس اور چند قطعات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے فی الحال ان کو شائع کیا جا رہا ہے۔ بعض قطعات اور مخمس وغیرہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس لئے میں نے ان کو اس مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس دیوان میں بعض قطعات مجھے ایسے ملے جن سے حیدری

کی شخصیت اور شاعری پر روشنی پڑتی ہے۔ میں نے ان سے اپنے مقدمے میں کام لیا ہے۔ چنانچہ بیشتر قطعات اس کتاب میں آگئے ہیں بعض ایسے قطعات جو فحش تھے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

دیوان حیدری اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوا۔ اب یہ پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۶ ار نومبر ۱۹۶۶ء

سید حیدر بخش حیدری دہلوی کی اہمیت کو بہت کم لوگوں نے جانا
اور ان کے ادبی مقام کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے
کہ ان کے بارے میں ہماری تحقیق اور تنقید دونوں لکیر کی فقیر رہی ہیں۔
ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ انہیں صرف توتا کہانی اور آرائش
محفل کے مؤلف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں کا ابھی تک
کسی کو علم بھی نہیں ہو سکا ہے۔ ان میں سے بیشتر یورپ کے مختلف کتب
خانوں میں ایک عالم کس مپرسی میں پڑی ہیں۔ اُن کتابوں کا شائع کرنا تو
درکنار ان میں سے بیشتر کا تو دیکھنا بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ انگلستان
کے دوران قیام میں مجھے خاصی تعداد میں ان کی ایسی کتابیں ملی ہیں جن کا اس
سے قبل بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ یہ کتابیں انہیں اپنے زمانے کا سب سے
اہم مصنف ثابت کرتی ہیں اور ان سے اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے
کہ وہ اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ انشاء پرداز اور ایک اعلیٰ درجے کے
تخلیقی فن کار تھے۔ یہ بات بھی ان تصانیف سے واضح ہوتی ہے کہ ان کا قلم

صرف ترجمے ہی تک محدود نہیں رہا، طبع زاد تخلیقات کے میدانوں میں بھی اس نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے ان کہ تصانیف کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ اس لئے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادیب اور فن کار کی حیثیت سے ایک پہلودار، وسیع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی داستان گوئی اور افسانہ نگاری، شاعری اور تذکرہ نویسی سب اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف مصنف ہونے کے باوجود ان پر جیسا کام ہونا چاہیئے تھا، وہ نہیں ہو سکا ہے۔ بہت کم لکھنے والوں نے ان کے حالات کا سراغ لگایا ہے اور ان کے ادبی مرتبے کی اندازہ دانی کی ہے۔ ان کے حالات کی تفصیل خود ان کے ہم عصروں کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ شاعر تھے اور انہوں نے عنفوان شباب ہی میں شاعری شروع کر دی تھی[1] لیکن ان کے زمانے کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نواب علی ابراہیم خلیل خاں خلیل ان کے محسن اور مربی تھے اور حیدری نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ لیکن تذکرۂ گلزار ابراہیم میں خلیل نے حیدری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مرزا علی لطف ان کے ہم عصر اور فورٹ ولیم کالج میں ان کے رفیق کار تھے لیکن لطف کا تذکرہ گلشن ہند بھی حیدری کے ذکر سے خالی ہے۔ اُردو شاعروں کے صرف تین تذکرے ایسے ہیں جن میں حیدری کا ذکر موجود ہے۔ ایک تو بینی نارائن جہاں کا تذکرہ دیوان جہاں، دوسرا عبدالغفور نساخ کا تذکرہ سخن شعراء اور تیسرا کریم الدین

---

[1] دیوان حیدری (غیر مطبوعہ) قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ

کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند۔ بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکرے میں ان کے متعلق صرف یہ لکھا ہے :۔

"حیدری تخلص : نام میر حیدر بخش، دلی کے رہنے والے، بالفعل مسند حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت مین بندگی ہے۔ اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں"[1]

اور عبدالغفور نساخ نے صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے :۔

"حیدری تخلص حیدر بخش دہلوی۔ ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی آرائش محفل یعنی ہفت سیر حاتم نظر سے گزری"[2]

کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند میں کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"منشی سید حیدر بخش حیدری تخلص، متاخرین میں سے ہے۔ وہ ایک متاخر مصنف ہے جس نے بہت سی کتابیں بنائی ہیں۔ طوطا کہانی کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ اوس نے علی ابراھیم خان سے جو ۱۸۰۱ء میں مرا تھا، تعلیم پائی۔ اور وہ مولوی غلام حسن غازی پوری کا بھی شاگرد تھا۔ بینی نارائن بیان کرتا ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء میں موجود تھا اور اس سے واقفیت رکھتا ہے۔ سوا اکثر نظم کے اس کی تصنیف سے یہ ہیں۔ ایک طوطا کہانی۔ یہ قصہ ایک مغلق عبارت میں ضیاء الدین نخشبی نے تصنیف کیا تھا مگر محمد قادری نے کچھ مختصر کر کے سہل عبارت میں تصنیف کیا۔ اور حیدری نے اس کتاب

---

[1] بینی نارائن جہاں : دیوان جہان قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن صفحہ ۵۰۔۵۱

[2] نساخ۔ سخن شعراء : مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۴۳

سے اپنا ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کا ترجمہ شائستہ نسبت اوس کے ہے اور اوس میں نظم اور نثر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے اصل اس کتاب کی ایک کتاب سنسکرت میں سکھا سینتی ہے۔ حیدری نے اس کتاب کو درمیان ۱۲۱۵ھ کے تصنیف کیا تھا۔ اور ایک ترجمہ اردو قصہ حاتم طائی کا نثر اور نظم آمیز اس کی تصنیف ہے۔ ایک ترجمہ اس کا ڈنکن فوبؔ[1] نے انگریزی ترجمہ تیار کیا ہے۔ اس ترجمے کا نام آرائش محفل ہے۔ یہ ترجمہ درمیان ۱۲۱۴ھ کے تیار ہوا تھا۔ مگر ہندوستانی اپنے خیالات درباب ترجمہ اتنے بھڑاتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ترجمہ نہیں رہتا بلکہ اس کی ایک علیحدہ تصنیف مثل اول کے تصوّر کرنا چاہیئے۔ تیسرے گل مغفرت اس میں ان شہدا کا بیان ہے جو پیغمبر خدا سے امام حسین علیہ السلام تک گزرے ہیں۔ یہ کتاب ایک ترجمہ روضۃ الشہداء کا ہے جس کو گلشن شہیدان بھی کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ میں تیار ہوا تھا۔ یہ کتاب بہ خواہش مولوی سید حسین جون پوری کے تصنیف کی تھی۔ چوتھی کتاب گلزارِ دانش۔ یہ ایک ترجمہ بہار دانش کا ہے جو فارسی میں محمد مہدی نے لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ سر ولیم جونس نے انگریزی میں تیار کیا ہے۔ چھٹا مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی حیدر بخش نے ایک مختصر شاہنامہ اردو میں لکھا ہے۔ ایک مثنوی بہ نام ہفت پیکر اوس کی تصنیف ہے۔ یہ ایک قصہ وہ ہے جس میں مضمون وہ ہی ہے جو نظامی کی کتاب ہفت پیکر میں۔ ایک قصہ دکنی زبان میں بھی ہے بہ نام قصہ بہرام و گل اندام وہ بھی اس طور کا ہے

---

[1] ڈنکن فوربس

جوکہ بدنصیب سلطان ابوالحسن آخری نواب گولکنڈہ کے، جس نے شکست کھاکر اورنگ زیب کی قید میں مقید ہوا تھا، درمیان ۱۶۸۷ء کے"۔[1]

جدید دور میں سیّد محمد نے ارباب نثر اردو میں، حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں اور محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کا عہد میں حیدری کے متعلق کچھ معلومات ضرور فراہم کی ہے لیکن ان کی زندگی، شخصیت، نثر نگاری اور شاعری کے کسی نئے گوشے کو دریافت نہیں کیا ہے۔ حیدری کی غیر مطبوعہ تحریروں میں جو نئی معلومات ملتی ہے، اس تک بھی ان لکھنے والوں کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لئے ان میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

حیدری کے صحیح حالات کو معلوم کرنے کے لئے ان کی بعض غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تحریریں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل یہ تحریریں حیدری کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ میں نے انگلستان کے دوران قیام میں حیدری کی بعض ایسی غیر مطبوعہ تحریروں کو دیکھا، اور ان سے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔ سب سے پہلے یہ تحریریں رسالہ ادب لطیف، لاہور کے جوبلی نمبر ۶۳ء میں حیدری کی دو غیر مطبوعہ کہانیوں کے پیش لفظ کے طور پر شائع ہوئیں۔ پھر میں نے ان سے حیدری کی "مختصر کہانیوں"[2] کے مقدمے میں بھی کام لیا اور ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ نئی معلومات فراہم کی۔ یہ تحریریں حیدری کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک بیش بہا

---

[1] کریم الدین: طبقات شعرائے ہند، ص ۲۷۰ - ۲۷۱

[2] مختصر کہانیاں: سید حیدر بخش حیدری۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی شائع کردہ اُردو دنیا۔ کراچی ۱۹۶۲ء

خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان سب کو یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گلدستۂ حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"احوال اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہجہان آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سید ابوالحسن والد اس فقیر نے دلی چھوڑی اور ہمراہی لالہ سکھ دیو رائے کی قبول کی تو بنارس میں تشریف لائے اور پیچھے دلی کے قصداً دل سے بھولائے (بھلائے)۔ اس وقت یہ ہیچ مدان نہایت خورد سال تھا لیکن زیر سایۂ دامن قبلہ وکعبہ کے آفات فلکی سے از بس کہ بے خطر تھا۔ اس سن میں بھی مشتاق اہل کمال تھا چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی۔ اور اس فقیر کی بھی حد بلوغیت کو پہنچی۔ اس عرصے میں امین الدولہ عزیز الملک نواب علی ابراھیم خان بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل اشٹیٹن صاحب بہادر جلالت جنگ کے حاکمی بنارس کی قبول کر کے، ساتھ عزو وقار کے مسند عدالت پر بیٹھے تو قبلہ گاہی نے اس قدر دان نجبا کی نوکری پر دل دیا۔ اور اس کمترین کو واسطے تربیت اور خوشہ چینی کے اس خرمن سخن کے سپرد کیا۔ چنانچہ اس فقیر کو خدمت گزاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب دام اقبالہ کی پسند آئی اور شاگردی قبلہ وکعبہ کونین مولوی غلام حسین کی بھائی۔ بیت

بہت سی میں نے کی یان جبہ سائی
جب ایسی گفتگو یہ مجھ کو آئی

اور صحبت سے نخل بند چمن دوستی سید جمعیت علی رضوی کی بھی اس عندلیب ہیچ مدان نے موافق اپنے فہم کے بہت سی کیفیت اٹھائی ہے۔ لیکن افسوس کہ گردش فلکی نے اس گلشن باغ مرتضوی سے نصیب کی جدائی ہے۔ حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفضلات سے صاحبان عالیشان والا خاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک صورت اطمینان کی ہے۔ اور مفارقت میں یاران قدیم اور دوستان صمیم کے اوقات یوہیں گزرتی ہے۔ اس واسطے چند قصے زبان ریختۂ ہندی میں موافق اُردوئے معلے کے نثر کئے گئے۔ جیسے قصہ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصہ لیلے مجنون کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے۔ اور چند اشعار پریشان اور کئی مخمس و چند قطعہ جو اس ہیچ مدان نے تصنیف کئے سوا حاطہ تحریر میں آئے۔ اور اس مجموعہ بے سر رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سر و پا نے جمع کیا ہے نام اس اوراق پریشان کا گلدستۂ حیدری[1] رکھا ہے۔ اُمیدوار لُطف سے باریک بینوں کی یہ ہے کہ اگر نکتہ سہو کا اس میں پاویں تو بہ موجب حدیث

---

[1] گلدستۂ حیدری (غیر مطبوعہ) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن: ص۔ ۷۔

شریف الانسان مرکب مع الخطا والنسیان کو جائز الخطا سمجھ کر اصلاح کریں۔
اور نکتہ گیریوں کو کام نہ فرماویں۔ بحق محمد والا الامجاد۔ قطعہ:

جو ہوں اہل معنے اے بادِ نسیم
یہ میری طرف سے انہیں تو سُنا
کرو سیر گلدستہ حیدری
اگرچی میں رکھتے ہو کچھ بھی ہوا
کہ فضل خدا نے کیا ہے اسے
گل نثر اور نظم سے لہلہا

مہر وماہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

حمد کرتا ہوں اس بادشاہ قادر بیچوں کی جس نے اپنی قدرت کبریائی سے سلطان مہر وماہ کو اوپر تخت فلک بے ستون کے ساتھ ندیمان سیاروں کے جلوہ گر کیا اور فیضان جمال بے مثال وحدانیت سے ہیژدہ ہزار عالم کو مخلوق کر کے اپنی عنایات صمدیت سے خصوصاً خلقت۔ انسان کو اشرف المخلوقات خطاب دیا۔ اور خلعت انواع انواع حسن وجمال کے دے کر سرفراز کیا۔ اور جا گیر اپنے عشق کی عطا کر کے عاشق ومعشوق نام رکھا کیا خدا ہے جل جلالہٗ وعم نوالہ —— اور نعت ہے اس رسول مقبول کی جس کو اس واحد ذوالجلال نے اپنے فضل وکرم سے افضل البشر خاتم الانبیاء کیا۔ اور اس کے واسطے زمین وآسمان کو پیدا کر کے لولاک لما خلقت الافلاک خطاب دیا صلواۃ اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اور مدح ہے اس حیدر شہ سوار لافتا ساقیٔ

حوض کوثر کی کہ جو حامیٔ روز جزا ہے اور داماد مصطفیٰ ہے۔ اور
مدح ہے ان گوہر دریائے رسالت کی کہ جو سرور سینۂ طہارت
اطہر ہیں اور شفیع روز محشر۔ صلوٰۃ اللہ وآلہ اجمعین۔

پس اس حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہان آبادی کو ۱۲۱۴ بارہ
سو چودہ، ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی اُردو معلےٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں۔
اور اہل سخن کو از راہ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں۔ خصوصاً صاحب
والا مناقب عالیٔ مقام صدر نشین محفل اہل کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب
بہادر دام اقبالہ کہ جو بحر سخن وری و سخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں۔
اور موجد قواعد کلام شیریں سخنی کے سرچشمہ سخن وران۔

به دل دریا به کف چون ابر نیسان
جہاں ہے فیض سے جس کے دُر افشاں
نہ ہوں اس کی شجاعت کے مقابل
اگر ہوں رستم و زال و نریمان
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف
وہیں ہو صفحہ کاغذ زر افشاں
ہے اس کا نام نامی گلکرسٹ اَب
جہاں ہے مہر جود اس کے سے تابان
دُعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دُنیا میں خوش یارب وہ ہر آن

اس واسطے یہ دل مضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت
سے تیار کرکے واسطے نظر حضور پرنور اس صاحب موصوف والا شان کے

لایا ہے۔ یقین ہے کہ منظور نظر ہووے۔ اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نا مربوطیٔ الفاظ دکھائی دیوے تو اس کی درستگی کے واسطے باغبان خامۂ دو زبان کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے۔ بحق محمد و آل محمد۔۔۔۔ قطعہ:

منصفو! منصفی کی جا ہے یہ — میری محنت کی داد ٹک دیجیو
قصۂ مہر و ماہ کو میں نے — نثر کیونکر کیا ہے دیکھو تو

لیلیٰ مجنوں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے تصنیف کی ہیں۔ اور ایک مثنوی میں احوال لیلے مجنوں کا جو لکھا ہے سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے۔ اور ہاتفی نے بھی اس قصے دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا۔ اور عبارت فصیح سے اس کے ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا۔ اور اس قصے کو خواجہ یاسین شاہجہان آبادی کہ شاعری میں یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسند حیات پر جلوہ گر ہیں۔ بموجب فرمائش اطہر علی خان مرحوم کہ مسٹر چیمبرز صاحب نے حکم موصوف سے درخواست اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی۔ خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ ہندی میں حقیقت اس کی سابق عہدِ سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ سنہ سینتالیسواں جلوس بادشاہ موصوف

سے ہے جناب صاحب عالیشان پشت پناہ دنیا وسخن سنجاں
بحر ہمت، گوہر مروت کوہ حشمت، مخزن سخاوت، اعلی دودمان،
جان گلگرسٹ صاحب بہادر زیادہ افضالہ، نے اس سید
حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چین خرمن علم
کونین مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی عدالت نواب علی
ابراہیم خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ تو اس قصہ پرسوز
نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اُردوئے معلّے کے ساتھ فصاحت
شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطۂ تحریر میں لا۔کیونکہ عبارت
سلیس مفید ہے ان صاحبوں کے جو بالفعل اس گفتگو سے
واقف نہیں۔ ان کی درستگیٔ زبان کے واسطے بہتر اس نثر
سلیس کے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی۔چنانچہ اس کمترین
ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اردوئے معلّے
کے قصۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔اور ہر ایک صاحب سخن سے
سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض اثر سے دیکھے۔
اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم ہے کہ وہ اپنی
دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحۂ غلط سے
اٹھائے۔اور اجر اس کو دونوں جہان میں خدا دے۔

کمیت خامہ کو میں نے اُٹھا کر
کیا ہے صفحۂ مضمون پہ جولان
لکھا ہے قصۂ لیلے و مجنوں
سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجان

حیدری کی ان غیر مطبوعہ تحریروں سے ان کی زندگی اور شخصیت کی ایک اچھی خاصی تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ تحریریں ان مآخذ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کو سامنے رکھے بغیر حیدری پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔

ان مآخذ کے ذریعے سے جو معلومات ہم تک پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ سیّد حیدر بخش حیدری دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگ نجف اشرف سے ترک وطن کر کے دلی میں آئے اور اسی سرزمین پر اقامت اختیار کر لی۔ حیدر بخش حیدری دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم کسی ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ دلی میں زیادہ عرصے تک نہ رہ سکے۔ حالات کی ناساز گار کیفیت نے ان کے والد سید ابوالحسن کو دلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس وقت حیدری کی عمر بہت کم تھی۔ اس کم عمری میں اپنے والد کے ساتھ دلی سے باہر نکلے، اور بنارس میں اقامت اختیار کی۔ ان کے والد کا دلی سے باہر نکل کر بنارس پہنچنے کا سبب لالہ سکھ دیو رائے کی ملازمت تھی۔ اس کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ یہ لالہ سکھ دیو رائے کون تھے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کے والد نے ان کی ملازمت اختیار کی، ان کی ہمراہی میں بنارس پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے حیدری اس وقت بہت کم سن تھے لیکن اس کے باوجود انہیں دلی چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔ اپنے والد کی طرح دلی کی دلچسپیوں کو انھوں نے بھی بھلانے کی کوشش کی اور بنارس میں اپنے دل کو لگایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس شہر سے انہیں جذباتی وابستگی پیدا ہو گئی۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک قطعے میں کیا ہے۔

بنارس شہر ہے آباد و خوشتر
چراغ دودمان ہفت کشور
شدہ سیارہ ہرجا ماہ روئے
تو گوئی خانہ ہا شد مہ بہ کوئے
جدھر دیکھو اُدھر ہے جبہ سائی
یہاں کے بت ہیں سب کرتے خدائی
اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است و ہمیں است
کہوں بازار کا کیا اس کے عالم
قلم جو کچھ لکھے سو اس سے ہے کم
رکھا میں مختصر اب اس کو یان سے
بیان ٹک گھاٹ کا سن لو زبان سے
لگا رسی سے برنا تک ہر ایک واں
نہ دیکھا کم کوئی از ماہ رویان
چنانچہ گھاٹ ہے ایک من کرن کا
بیان اس کا کروں میں تم سے کیا کیا
نشان حسن واں ہر ایک نے گاڑا
ہوا وہ گھاٹ اندر کا اکھاڑا

لہ رسی اور برنا بنارس کے دو گھاٹ ہیں۔ بہ حوالہ خلاصۃ التواریخ نسخۂ قلمی ورق ۲۶

لگا کر جم سیتی تا بیتی مادھو
پری بنتا ہے وان ہر ایک نہادھو
نہ بیچ گنگا میں یاں گر کوئی نہاوے
تو وہ بیکنٹھ وان کس طرح پاوے
کوئی کھینچے ہے قشقہ نازنین وال
کوئی دیتا ہے ٹیکا مہ جبین وال
کوئی گنگا میں جا غوطہ لگاوے
کوئی سیڑھی ہی پر دھوتی سکھاوے
برہمن بچے وان ہر سو پھریں ہیں
ہر ایک کو رام وہ اپنا کریں ہیں
مغرق تاش کی پہنے ہیں ساڑی
اور اس پر ہے ٹکی دوہری کناری
کب ان کے پاؤں میں دو دوکڑے ہیں
کہے تو حسن کے وہ پیکڑے ہیں
نہ رتبہ کس طرح وہ شہر پاوے
کہ شیو ترسول پر جس کو بساوے
بلند اس کی عمارت اس قدر ہے
کہ دھولا گیر جس کی یہ کمر ہے
کلاں وہ حیدری ایسا مکاں ہے
کہ جس کا کوچۂ خورد اصفہاں ہے[1]

---

[1] حیدری : دیوان حیدری : نسخہ باڈلین آکسفورڈ و برٹش میوزیم لندن۔

حیدری بنارس کی اس سرزمین پر سن شعور کو پہنچے۔ اور ان کی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نواب علی ابراہیم خاں خلیل صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیم بنارس میں ججی کے اعلےٰ عہدے پر فائز تھے۔ بنارس میں ان کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ چنانچہ حیدری کے والد سید ابوالحسن نواب علی ابراہیم خاں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس تک حیدری سن شعور کو پہنچ چکے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال ان کے والد سید ابوالحسن کے پیش نظر تھا۔ خلیل کی قربت نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ حیدری کے والد نے انھیں نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے سپرد کیا۔ اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا کام قاضی عبدالرشید خاں اور مولوی غلام حسین کو سونپا۔ ان کے علاوہ سید جمعیت علی رضوی سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ غرض ان کی ذہنی نشو و نما ان بزرگوں کے سائے میں ہوئی۔

حیدری نے اپنے دیوان میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل کی مدح میں ایک قطعہ درج کیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خلیل سے کس درجہ متاثر تھے۔ لکھتے ہیں۔

کرے ہے جب سے عدالت علی ابراہیم
ہوا ہے شہر بنارس مثال باغ نعیم
کروں میں اس کی سخاوت کا کیا بیان رقم
دو شالے اس کو دیئے، تھے نہ جس کے پاس گلیم
شگفتہ ہو نہ کوئی گل جوں غنچۂ تصویر
سحر کو فیض سے اس کے اگر چلے نہ نسیم

کرم ہے اس کا یوں روشن تمام عالم میں
کہ مہر و ماہ کے کانسے میں دے ہے یہ زر و سیم
عدو کے سر پہ جو شمشیر وہ رکھے ایک بار
اگر پہاڑ ہو ایک دم میں وہ ہو جائے دو نیم
بزور جنگ تیری دیکھ صولتِ شمشیر
غنم ہو جاوے ترے آگے گر ہو شیر، غنیم
کسی پہ گزرے کہیں زور کا تیرے جو خیال
تو مور کی طرح مل ڈالے گر ہو پیل جسیم
تو اپنے وقت کا نواب خان خاناں ہے
یہ چاہتا ہوں خدا سے۔ کہ میں تیرا ہوں فہیم
میں ہوں وہ شاعر خوش فکر حیدری تیرا
کہ جس کے سامنے لکنت کرے زبان کلیم[1]

اور قاضی عبدالرشید خاں کی مدح میں بھی چند اشعار کا قطعہ لکھا ہے جس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ قطعے کے اشعار یہ ہیں۔

ہم نے جو صاحب سخا دیکھے
در کے تیرے وہ سب گدا دیکھے
کون ہے جز ترے زمانے میں
جو کسی کا کوئی بھلا دیکھے
عدل اہل ستم کو باندھے ترا
گر کہیں جور کو کھلا دیکھے

---

[1] حیدری: دیوان: نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ

ہوئے تن سے جدا عدو کا سر
تیغ اودھر جو تو اُٹھا دیکھے
ترے بے حکم ، شمع محفل میں
ایک پروانے کو جلا دیکھے
شب سے تا صبح پھر وہ سر اپنا
ہر گھڑی تن ستی جُدا دیکھے
ٹھہرے مسکین بے پر اس جگہ
جس جگہ کچھ بھی آسرا دیکھے
مجھ کو دارُالشفا ہے در تیرا
میں بہت درد بے دوا دیکھے
حیدری دل سے اس کا ہے مداح
یا حضور اس کو یا قفا دیکھے
یعنی عبدالرشید خان صاحب
مخزن فیض و ہم سخا دیکھے[1]

سید حیدر بخش حیدری ۱۲۱۴ھ تک بنارس میں رہے۔ اس وقت تک انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا، بلکہ بنارس کے اَدبی حلقوں میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ چنانچہ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گلکرسٹ نے از دو کے جن لکھنے والوں کو وہاں جمع کیا ان میں سید حیدر بخش حیدری بھی تھے۔ اس بات کا علم نہیں ہو تا کہ وہ بنارس

---

[1] ی: دیوان: نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ

سے کب باہر نکلے، کب کلکتہ پہنچے، اور کس کے توسط سے ان کی رسائی ڈاکٹر گلکرسٹ تک ہوئی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کی اس سلسلے میں دستگیری کی اور حیدری اس کے لئے ہمیشہ ان کے احسان مند رہے۔ چنانچہ گلدستۂ حیدری، میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے اور یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلے ہیں :۔

"اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ دو جز حرف شین سے لے کر تا حرف ی خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف یا تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے —— اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامئ بے کسان ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اسے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد۔[1]

بہر حال میر بہادر علی حسینی کے توسط سے وہ فورٹ ولیم کالج میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ان کا تعارف ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں

---

[1] حیدری : گلدستۂ حیدری : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ ص۔ ۲۲۳

انہوں نے قصہ مہر و ماہ لکھ کر گلکرسٹ کو پیش کیا۔ انہوں نے کتاب کو پسند کیا اور حیدری ۴ مئی ۱۸۰۱ کو فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے باقاعدہ ملازم ہو گئے[۱] دو سو ۲۰۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی[۲] تصنیف و تالیف کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں حیدر بخش حیدری ڈاکٹر گلکرسٹ سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ دیوان میں ایک قطعہ ہے جس میں گلکرسٹ کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

گلکرسٹ صاحب وہ ہے عادل زماں
خوشہ چیں ہو اس کا اب نوشیرواں
کیوں نہ وہ حاکم ہو ہفت اقلیم کا
چاکری کرتا ہے جس کی آسماں
خامہ ہو جاوے وہیں زریں رقم
گر لکھوں اس کی سخاوت کا بیاں
زیر دست اس کے ہو انبار طلا
گر ہو اک ذرہ کسی پر مہرباں
کھل گئے اس کی نسیم خلق سے
غنچۂ امید دل ہائے جہاں

---

[۱] محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۔ ۱۹۸

[۲] محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۔ ۱۴۳

اک نگاہ لطف اس کی حیدری
تجھ کو مستغنی کرے گی بے گمان

حیدری کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز، اس میں شبہ نہیں، کہ فورٹ ولیم کالج سے ہوا، اور گلکرسٹ کی شخصیت نے انہیں اس کام کی طرف رغبت دلائی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا بیشتر ادبی کام گلکرسٹ کے ایما پر کیا۔ لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری کی طرف باقاعدہ متوجہ ہونے سے بہت پہلے شاعری شروع کر چکے تھے۔ اس کا سبب ان کے عشق کا واقعہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وہ عنفوانِ شباب میں ایک مہ جبین عشوہ کار کے عشق بلاخیز میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی واقعے کے زیر اثر انہوں نے شاعری شروع کی تھی اور ایک مختصر سا دیوان بھی جمع کیا تھا۔ دیوان کے آخر میں انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس عشق کے واقعے کو بیان کیا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اسی واقعے کے زیر اثر شاعری شروع کی اس سے قبل پیش لفظ میں یہ عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں۔ اس لئے ان کا یہاں پھر نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔

دیوان حیدری صرف غزلیات و قطعات کا مجموعہ ہی نہیں، ایک بڑی ہی دلچسپ دستاویز ہے۔ اس سے حیدری کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کا آج تک کسی کو علم نہیں تھا۔ ایک تو یہی ان کے عشق کا واقعہ ہے جس کا علم ان کے دیوان سے ہوتا ہے۔ پھر دیوان میں غزلوں کے علاوہ بعض قطعات بھی ایسے ہیں جن سے ان کے رومانی مزاج اور طبیعت کے عشقیہ رُجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ

بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی بعض طوائفوں سے ان کا تعلق تھا چنانچہ ایک طوائف بھجو کا تو ایک واقعہ بھی انہوں نے ایک جگہ اس دیوان میں بیان کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ غزل بھجو نے اس ہیچ میدان کے گھر آ کے سنی۔ مہایت خوش بلکہ دو چار روز یہیں رہی۔ اس بات کو سن کر اس کے چاہنے والوں میں سے ایک شخص طبع موزوں رکھتے تھے۔ نام لینا ان کا کچھ ضرور نہیں۔ انہوں نے یہ غزل اس کے کڑھانے کو لکھ بھیجی۔ وہ اس کے سنتے ہی غضب ناک ہوئی اور اس فقیر سے کہنے لگی کہ "تمہاری دوستی میں یہ نوبت پہنچی"۔

تب اس حقیر نے کہا "تم نہ آزردہ ہو۔ میں اسی ردیف و قافیہ میں ایک قطعہ لکھ بھیجتا ہوں کہ وہ اس کو سن کر شرمندہ ہوں۔ اور اپنی پوچ گوئی سے باز رہیں"۔

پہلی غزل اس کم گو کی اس کی تعریف میں۔ دوسری ان کی کہی ہوئی اس کی ہجو میں۔ تیسرا قطعہ اس کا ان کے جواب میں۔

موجزن کیوں نہ ترا حسن ہو بالا بھجو
بحر ہستی میں تو تو ہے درِ لالا بھجو
پڑ گئی رشک سے چہرے پہ قمر کے جھائیں
چشم بد دور یہ کیا حسن نکالا بھجو
ہے غلط جو کہے مکھڑے پہ ترے زلف اسکو
مخزن حسن پہ بیٹھا ہے یہ کالا بھجو
مہر ٹھہرے نہ شفق میں یہیں ہو جائے غروب
سرخ گر دیکھے ترے سر پہ دوشالا بھجو

دل عشاق وہیں ہوگئے سب حلقہ بگوش
بس تیرے دیکھتے ہی کان کا بالا بھجو
پھر کہاں بزم و کہاں مے و کہاں جام و سبو
اور اس دور میں ایک دے گی پیالا بھجو
زاہدہ، زینب و موتی، و امیرن، مدو
حیدری کیا کہوں ان سب سے ہے عالا بھجو

کیا ہوا بھول اپنی عمالہ بھجو
دوش پر آج رکھا کیونکہ دوشالا بھجو
تو تو کرتی تھی بہت لاف زنی عصمت پر
ہونے پایا نہ ترے بول کا بالا بھجو
شکر اللہ کہ دس بیس نے کل شارع عام
غیر کے ساتھ ترا پکڑا پچھنالا بھجو
کل کی یہ بات ہے کہ غول بیابانی نے
بیع کا تیری لکھا ہے گا قبالا بھجو
سوت کی طرح ہر ایک وقت پڑی بہتی ہے
تیری یا ہے کانشی کا نالہ بھجو
فرش مخمل پہ رکھا کل نہ نزاکت سے قدم
دوش پر آج رکھا کیونکہ دوشالا بھجو
جس نے دیکھا تجھے وہ تیرے قدم پر لوٹا
اس میں لگتا نہیں کچھ تجھ کو پچھنالا بھجو

گر تجھے دیکھے زلیخا تو کنیزی پہ تو کیا
کردے یوسف کا لگے ہاتھ قبالا بھیجو
چشمہ فیض وہ ہے تیرے میاں ——
اس کو کس منہ سے کہے کاشی کا نالہ بھیجو[1]

اسی طرح ملائی کے بارے میں بھی ایک دلچسپ غزل ہے۔ اس کو نقل کرنے سے قبل انہوں نے کوئی واقعہ تو بیان نہیں کیا لیکن غزل کے اشعار خود مجموعی طور پر بعض واقعات کو ظاہر کرتے ہیں۔
غزل یہ ہے :۔

گلشن میں اگر سیر کو ٹک جائے ملائی
گل جھک پڑے وو ہیں بہ سرپائے ملائی
گل چاک گریباں ہوا گر دیکھے ٹک اس کو
سنبل کو پریشاں کرے سودائے ملائی
ہر لحظہ مرے بوئے حنا آتی ہے لب سے
جس دن سے میں چومی ہے کف پائے ملائی
کیا تاب جو پھر شمس و قمر ہاتھ ملاویں
گر دیکھی کسی دن جو یہ سیمائے ملائی
اے حیدری سر میں تو تہہ تیغ جھکا دوں
گر ہوئے مرے قتل پہ ایمائے ملائی[2]

---

[1] حیدری، دیوان حیدری : نسخہ باڈلین آکسفورڈ
[2] ایضاً

غرض حیدری کے دیوان سے ان کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری اور شاعرانہ فن کاری کے لحاظ سے بھی وہ دلچسپ ہے۔ اس اعتبار سے بھی وہ اہمیت رکھتا ہے کہ حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ دیوان کبھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ "دیوان حیدری" حیدری کا کوئی بہت بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہے۔ ان کا ادبی کارنامہ تو نثر کی وہ کتابیں ہیں جن میں سے بیشتر انہوں نے فورٹ ولیم کے دوران قیام میں لکھیں۔ ان کتابوں میں مہر وماہ، لیلیٰ مجنون، توتا کہانی، آرائش محفل، تاریخ نادری، گل مغفرت، گلزار دانش، تذکرہ ہندی اور مختصر کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قصہ مہر وماہ، غالباً حیدری کی سب سے پہلی کتاب نثر ہے۔ یہ کتاب "انہوں نے اوائل ۱۲۱۴ھ میں لکھی اور اس کو پیش کر کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں باریاب ہوئے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔" [1] حیدری خود بھی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> پس اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبان عالیشان گفتگوئے اُردوئے معلےٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں اور اہل سخن کو از راہ قدردانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں ——

---

[1] سید محمد۔ ارباب نثر اردو: صفحہ ۱۷ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء)

خصوصاً صاحب والا مناقب عالی مقام، صدر نشین محفل اہل کلام مسٹر جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کہ جو بحر سخن وری و سخن رانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں۔ اور موجد قواعد کلام شیریں سخنی کے سرچشمۂ سخن وران۔

یہ دل دریا بہ کف چون ابر نیسان
جہاں ہے فیض سے جس کے درافشاں
نہ ہوں اس کے شجاعت کے مقابل
اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف
وہیں ہو صفحۂ کاغذ زر افشاں
ہے اس کا نام نامی گلکرست اب
جہاں ہے مہر جود اس کے سے تاباں
دُعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دُنیا میں خوش یارب وہ ہر آن

اس واسطے یہ دل مضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر پرنور اس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے۔ یقین ہے کہ منظور نظر ہووے۔ اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نامربوطیٔ الفاظ دکھلائی دیوے تو اس کی درستگی کے واسطے باغبان خامہ دو زبان کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے۔" [1]

---

[1] حیدری: دیباچہ قصہ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لنڈن)۔ صفحہ ۱۴۶

غرض یہ کتاب لکھ کر انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی۔ اس کا انداز و اسلوب بڑی حد تک مرصع اور مسجع ہے۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس پر فورٹ ولیم کالج کے ماحول کا اثر نہیں ہے۔ اسی لئے اس میں آسان اور سادہ نثر کا وہ انداز نہیں ہے جو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس کتاب کا انداز مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

"سنا ہے کہ کسی شہر میں آفتاب نام بادشاہ تھا کہ وہ نہایت صاحب حشم و عالی جاہ۔ فوج و خزانہ کی طرف سے خوش و خنداں، اور آل واولاد کے سبب سے چشم گریاں۔ ہمیشہ از دست روزگار ناہنجار رہا کرتا۔ اور حساب اس کی افواج کا ذہن رسا میں نہیں آسکتا۔ اور شمار اس کے خزانے کا خزانہ دل میں نہیں سما سکتا۔ جہاں تک شاہ و گدا امیر و وزیر و امراء نواب خاں تھے سو وہ سب اس کے زیر حکم و تابع فرمان۔ جہاں تک کہ تھے سرکش اطراف کے وہ رہتے تھے اس شہ کے قدموں لگے۔"[1]

حیدری کی یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے لیکن ناقص ہے۔ اگر ایک نسخہ اور مل گیا تو اس کو جلد شائع کر دیا جائے گا۔

سید حیدر بخش حیدری کی دوسری تالیف قصہ لیلےٰ مجنون ہے۔ یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ غالباً فورٹ

---

[1] حیدری: دیباچہ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن)، صفحہ ۱۴۶۔

ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد یہ حیدری کی پہلی تالیف تھی۔ فارسی میں اس قصہ کو مختلف لکھنے والوں نے نظم میں لکھا ہے۔ حیدری نے سب سے پہلے اس کو اردو کی آسان اور سادہ نثر کے قالب میں ڈھالا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا، کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے تصنیف کی ہیں۔ اور ایک مثنوی میں احوال لیلےٰ مجنوں کا جو لکھا ہے سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے۔ اور ہاتفی نے بھی اس قصے دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا اور عبارت فصیح سے اس کے ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا۔ اور اس قصے کو خواجہ یاسین شاہ جہاں آبادی کہ شاعری میں یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسند حیات پر جلوہ گر ہیں۔ بموجب فرمائش اطہر علی خاں مرحوم کہ جیمیرز صاحب نے حکیم موصوف سے درخواست اس قصّے کی نظم ہندی میں کی تھی خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ ہندی میں حقیقت اس کی سابق عہد سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ سنہ تینتالیس واں جلوس بادشاہ موصوف سے ہے، جناب صاحب عالیشان پشت و پناہ سخن سنجاں، بحر ہمت، گو ہر مروّت، کوہ حشمت، مخزن سخاوت، اعلیٰ دودمان، جان گل کرسٹ صاحب بہادر زیادہ

افضالہ نے اس سیدّ حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دہلوی
خوشہ چین خرمن علم کونین مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی
عدالت نواب علی ابراھیم خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا
کہ تو اس قصہ پر سوز نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اردوئے معلے
کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطہ تحریر میں لا۔
کیونکہ عبارت سلیس مفید ہے ان صاحبوں کو جو بالفعل اس
گفتگو سے واقف نہیں۔ ان کی درستگی زبان کے واسطے بہتر
اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس
کمترین ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اُردوئے
معلے کے قصہ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔ اور ہر ایک صاحب سخن
سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض اثر سے
دیکھے۔ اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم ہے کہ
وہ اپنی دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحہ
غلط سے اٹھالے۔ اور اجر اس کا اس کو دونوں جہاں میں
خدا دے۔

کمیت خامہ کو میں نے اُٹھا کر
کیا ہے صفحۂ مضمون پہ جولان
لکھا ہے قصہ لیلے و مجنون
سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجان [۱]

---

[۱] حیدری دیباچہ قصہ لیلے مجنون رگلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم
لندن۔ ص۔ ۱۴۸

حیدری کی یہ کتاب بھی کبھی شائع نہیں ہوئی۔

توتا کہانی سیّد حیدر بخش حیدری کی تیسری کتاب ہے جو کہانی اور پلاٹ، اسلوب اور انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما پر ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں :۔

چل بھائی ! بس، بتاریخ بست و ششم شہر ذی قعدہ سنہ مذکور اور پنج شنبہ بوقت شام بخوبی تمام فضل خدا سے یہ قصۂ شیریں کلام انجام کو پہنچا۔ اور توتا کہانی اس کا نام رکھا۔

کہانی ہوئی ختم جب حیدری
تو ہاتف نے نام اس کا سن کر کہا
سر راہ کو کھینچ کر تو نے خوب
رکھا نام توتا کہانی بجا [۱]

اس کا ماخذ فارسی کی کتاب محمد قادری کا طوطی نامہ ہے۔ فارسی میں اس کو ضیاء الدین نخشبی نے بھی لکھا ہے لیکن یہ کہانیاں سنسکرت کی کتاب شکا سپتتی سے ماخوذ ہیں۔ سنسکرت کی کتاب میں ۷۰ کہانیاں تھیں نخشبی نے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ محمد قادری نے اپنے ترجمے کے لئے صرف ۳۵ کہانیوں کو انتخاب کیا۔ حیدری نے بھی صرف ۳۵ کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محمد قادری کی لکھی ہوئی کہانیاں ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ دیباچے میں خود بھی لکھتے ہیں :۔

---

[۱] حیدری : توتا کہانی : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص ۹۹۔ ۱۰۰

"یہ سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہ جہان آبادی، تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم، شاگرد مولوی غلام حسین غازی پوری، دست گرفتہ صاحب عالی جناب، سخن دان، آبرو بخش سخن وراں، معدن مروت و چشم فتوت، دریائے جود و کرم، منبع علم و حلم، خداوند خدائیگان، والا شان جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے۔ لیکن بہ موجب فرمائش صاحب موصوف کے بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں سرگروہ امیران جہان، حامیٔ غریباں و بیکساں، زبدۂ نوآیئناں عظیم الشاں، مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان، مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے، محمد قادری کے طوطی نامے کا، جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے، زبان ہندی میں موافق محاورے اُردوئے معلّے کے نثر میں عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا۔ اور نام اس کا توتا کہانی رکھا۔ تاکہ صاحبان نوآموز کی فہم مین جلد آوے۔ اور یہ ہیچ مدان ہر ایک اہل سخن سے اُمید رکھتا ہے کہ جو کوئی چشم غور سے اس ترجمے کو ملاحظہ کرے۔ اور غلطی معنی یا نامربوطی الفاظ اس کی، اس کے نظر پڑے تو وہ شمشیر قلم سے مانند سر دشمن کے اس صفحہ ہستی سے اسے اُڑا دے۔

جو بہر اصلاح اس پہ رکھے قلم
الٰہی نہ دینا کبھی اس کو غم
الٰہی بحق امام انام
یہ جلدی ہو مجھ سے کہانی تمام[1]

یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی آسان اور سادہ نثر کی روایت کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں آنے کے بعد، وہاں کے مخصوص ماحول کے زیر اثر، اپنے اندر خاصی تبدیلی پیدا کی تھی۔

توتا کہانی کا سب سے اہم قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی[2]۔ اس ایڈیشن میں اُردو کے سرورق پر ۱۸۰۳ء، ۱۲۱۸ھ تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ لیکن انگریزی کے سرورق پر ۱۸۰۴ء درج ہے۔ ہو سکتا ہے ۱۸۰۳ میں اس کی طباعت کا کام شروع ہوا ہو اور ۱۸۰۴ میں مکمل ہوا ہو۔ دونوں سرورقوں کی عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"توتا کہانی ترجمہ محمد قادری کے طوطی نامہ کا۔ مدرسے کے لئے عہد میں زبدۂ نوائینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی، گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے کیا ہوا منشی سید حیدر بخش حیدری کا حکم سے خداوند نعمت جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام

---

[1] حیدری: توتا کہانی: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن
[2] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص۔ ۱۹۲

اقبالہ کے

در سخن کو تو غواص بحر معنی پائے
وگرنہ کیسی ہے کوئی شناوری جانے
سنہ ۱۸۰۳ عیسوی
مطابق ۱۲۱۸ ہجری
ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا گیا ہوا۔
منشی تبتو رام کا لہ

TOTA KUHANEE

A TRANSLATION

into the Hindoostani Tongue

of the Popular Persian Tales

entitled

Tootee Namu

by

Sueyud Huedur Bukhshi Hueduree

under the superintendence of

John Gilchrist

For the use of the students

in the

College of Fort William

Calcutta

Printed at the Hindoostani Press, [2]

1804.

لہ حیدری: توتا کہانی: پہلا ایڈیشن (ہندوستانی پریس کلکتہ) ص۔ا

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے ایڈیشن کے علاوہ اس کا ایک ایڈیشن ۱۸۲۵ء میں ڈاکٹر ڈنکن فوربس نے لندن سے شائع کیا۔ لندن ہی سے ایک اور ایڈیشن ۱۸۳۵ء میں چھپا۔ ۱۸۷۲ء میں اس کا ایک ایڈیشن مطبع انوار محمدی لکھنو سے شائع ہوا۔ اس کے بعد نول کشور نے ۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۲ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع کئے۔ اس کے علاوہ دہلی کان پور اور لاہور سے بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے[1] اس کتاب کے تقریباً تمام ایڈیشن برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ اس کا تازہ ترین ایڈیشن لاہور کی مجلس ترقی ادب نے شائع کیا ہے۔ بنگلہ، ہندی، انگریزی اور روسی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے اور ان کو اہتمام سے شائع کیا گیا۔ بنگلہ میں طوطا اتیہاس کے نام سے چندی چرن سبرام پوری نے اس کا ترجمہ کیا اور ۱۸۰۲ء میں شائع کیا۔ انگریزی میں جارج اسمال نے اس کا ترجمہ کیا اور لندن سے ۱۸۷۵ء میں شائع کیا۔ ہندی میں تسک بہتری کے نام سے نول کشور نے اس کا ترجمہ ۱۸۸۶ء میں شائع کیا[2]

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو کس قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔

[1] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور ص۔۔۴
[2] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور ص۔۔۴

یہ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"اگلے دولت مندوں میں سے احمد سلطان نام ایک شخص بڑا مال دار اور صاحب فوج تھا۔ لاکھ گھوڑے پندرہ زنجیر فیل اور نوسو قطار بار برداری کے اونٹوں کی اس کے در دولت پر حاضر رہتی تھی۔ پر اس کے لڑکا بالا کوئی نہ تھا کہ گھر اپنے باپ کا روشن کرتا۔

اسی بات کا اس کے دل پہ تھا داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

اسی واسطے صبح شام خدمت میں خدا پرستوں کی جاتا، اور ان سے درخواست دعا کی کرتا۔

غرض تھوڑے دنوں کے بعد خالق زمین و آسمان نے ایک بیٹا خوبصورت، مہر چہرہ، ماہ جبین اسے بخشا۔ احمد سلطان اس خوشی سے گل کی مانند کھلا، اور نام اس کا میمون رکھا۔ کئی ہزار روپے فقیروں کو بخش کر سجدہ شکر کا بجا لایا اور یہ بیت پڑھنے لگا۔

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار[1]

حیدری کی یہ کتاب توتا کہانی اپنے انداز بیان اور موضوع دونوں اعتبار سے مقبول ہوئی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہے

---

[1] حیدری: توتا کہانی: (مجلس ترقی ادب لاہور)
۱۹۶۳ء ص-۳

اس کا انداز بیان اور اسلوب سیدھا سادہ لیکن دلکش ہے۔ موضوع میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں لیکن اس سے اس وقت کے مشرقی مزاج اور اس علاقے کی روایات سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔

توتا کہانی کے پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ایک مختصر سا دیباچہ انگریزی میں لکھا ہے۔ چند سطروں میں انہوں نے اس کتاب کی بنیادی خصوصیات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اصل عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"These popular tales have long been read and admired in the original Persian, in which language they were composed by Zia-Oodeenin Nukhshibee. They are now translated into Hindoostanee by Sueyud Huedur Bukhsh Hueduree of Shahjehanabad from an abridgment of the original made in the Persian tongue by Moohammud Qadiree.

The easy familiar style in which they are now translated, renders this work a desirable acquisition to the Hindoostanee Scholar, both for improving himself, in the idiom of the Rekhta, and giving him considerable information of the popular manners of Asia, of which these tales afford a correct and pleasing picture." [1]

حیدری کی ایک اور کتاب آرائش محفل ہے۔ یہ کتاب بھی حیدری نے فورٹ ولیم کے دوران قیام میں لکھی۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ ہے۔ اور یہ بھی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انہوں نے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں تاکہ کہانی طولانی ہو جائے۔ اور پڑھنے والے اس سے محظوظ ہوں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

---

[1] حیدری : توتا کہانی (فورٹ ولیم) ص۔۳

الٰہی دے مجھے روشن بیانی
کہ تا اول پر کھلے راز نہانی
زبان کو مخزن تقریر کر دے
دھن کو گوہر معنی سے بھر دے
کُمیت خامہ کو میرے لگا پر
یم معنی میں مجھ کو آشنا کر
پلا دے مجھ کو جام ارغوانی
کہ جس سے طے ہو حاتم کی کہانی
کہیں سن کر اسے ارباب اُردو
کہ ہے یہ گوہر نایاب اُردو

یہ قصہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سے حیدر بخش تخلص بہ حیدری، دہلی کے رہنے والے نے، امیر والا تدبیر، پشت پناہ ہر پیر و جواں، دست گیر درماندگان و بیکساں، نوشیروان وقت، ہمایوں بخت، زبدۂ نوآیئنان، عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی، گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی حکومت میں، اور خداوند خدایگان والا شان، عالی خاندان جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ کے حکم سے سنہ بارہ سو سولہ، ہجری اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے موافق اور سنہ جلوس تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق، زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی، ترجمہ نثر میں کیا، اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں اپنی طبیعت سے، جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں زیادتیاں

کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے، اور سُننے والوں کو خوش آئے"۔[۱]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آرائش محفل ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوئی لیکن خدا جانے کیوں سید محمدؔ نے ارباب نثر اردو میں اور مولانا حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء لکھ دیا ہے۔ سیّد محمدؔ لکھتے ہیں:۔

حیدری کی دوسری مقبول اور مشہور کتاب آرائش محفل ہے۔ عبدالغفور نساخ نے سخن شعراء میں اس کا نام ہفت سیر حاتم بھی لکھا ہے۔ اس میں حاتم طائی سے متعلق قصص کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی سات سیرین بیان ہوئی ہیں، نساخ کا بتایا ہوا دوسرا نام بھی موافق موضوع ہے۔ یہ قصہ ابتداً فارسی نثر میں تھا۔ اس کو حیدری نے اوائل ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔[۲] اور مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"آرائش محفل حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے۔ اس لئے عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرۂ سخن شعراء میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش کے مطابق فارسی کی داستان کو اردو میں لکھا۔[۳]

---

[۱] حیدری: آرائش محفل (مطبوعہ مطبع شعلہ طور کانپور) ص۔ ۲

[۲] سیّد محمدؔ: ارباب نثر اردو (لاہور ۱۹۵۰) ص۔ ۷۶

[۳] حامد حسن قادری۔ داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص۔ ۹۹

اس کتاب پر حیدری کو چار سو روپے کا انعام ملا تھا[1] گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ میری نظر سے صرف وہ ایڈیشن گزرا ہے جو عرصہ ہوا، مطبع شعلہ طور بلدۂ کان پور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ اسی نسخے سے یہ عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے :۔

"لکھنے والے نے یہ لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں طے نام یمن کا بادشاہ نہایت صاحب حشم، عالی جاہ، فوج کی طرف سے فرخندہ حال، زر و جواہر سے مالا مال، اس کی رعیت ھیزدہ ہزار اور سپاہ بے شمار۔ القصہ اپنے چچا کی بیٹی کو نکاح میں لا کر ثمر جاودانی کا اُمیدوار ہوا۔ بارے خدا کے فضل سے کتنے دنوں میں اوسی بیگم سے ایک لڑکا مہر لقا پیدا ہوا۔ یہ خبر فرحت اثر سن کر اوس نے حکیموں، منجموں، رمالوں، پنڈتوں کو بلوا کر کہا کہ تم اپنی عقل کی رسائی اور پوتھی قرعہ کی رو سے دریافت کرو اور بچارو دیکھو تو اس لڑکے کے نصیب کیسے ہیں؟ اُنھوں نے جو دریافت کیا تو ہر طرح سے اوس شہزادے کو صاحب اقبال پایا۔ عرض کی کہ خداوند! ہم کو تو اپنے علم سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب زادہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوگا اور تمام عمر برائے خدا کام کیا کرے گا۔ اور اس کا نام مہر سپہر

---

[1] محمد عتیق صدیقی۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ) ص۔ ۱۷۲

کی طرح قیامت تک دنیا میں جلوہ گر رہے گا۔"[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی سادہ سلیس، رواں اور مجموعی طور پر دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بھی حیدری کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔

حیدری کی ایک اور اہم کتاب گلزار دانش ہے۔ یہ کتاب عنایت اللہ کی فارسی کتاب بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ سید محمدؔ لکھتے ہیں :-

"ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اور نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ حیدری نے یہ ترجمہ کس سنہ میں تمام کیا۔ عنایت اللہ کی بہار دانش کئی سو صفحات کا ایک نیم تاریخی قصہّ ہے۔ اور اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ بانو کے معاشقے اور جہاندار شاہ کی مہموں اور مبارز طلبیوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۱ھ ہے۔ اور مولف نے دیباچے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ قصہّ اس کی اپنی ایجاد یا اختراع پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نے کسی نوجوان برہمن کی زبانی یہ حسن و عشق کی کہانی سنی تھی جس کو اس نے فارسی میں تالیف کر دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل فارسی تالیف کا ایک قلمی نسخہ ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے حاصل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ حیدری کا ترجمہ نہیں ملا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ طبع

---

[1] حیدری۔ آرائش محفل (مطبع شعلۂ طور، ن پور) ص ۔ ۲۔ ۳

نہیں ہوا۔ حیدری کے بعض دوسرے کارناموں کی طرح اس کو
کچھ زیادہ شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ کے مشہور مشرقی
کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں"۔ [۱]

اور مولانا حامد حسن قادری اس کے بارے میں ان خیالات کا اظہار
کرتے ہیں :۔

"گلزار دانش، شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہار دانش
کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف
۱۶۵۱ء مطابق ۱۰۶۱ھ میں ہوئی ہے۔ جہاندار شاہ اور بہرہ
ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ
یہ قصہ فرضی نہیں۔ سچا واقعہ ہے۔ بہر حال حیدری کی گلزار
دانش بھی اب گم ہے"۔ [۲]

انگلستان کے دوران قیام میں مجھے حیدری کی گلزار دانش کا قلمی نسخہ
ملا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ۵۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی
جلد میں ۲۵۲ صفحات ہیں۔ دوسری جلد میں ۲۸۵ صفحات۔ حیدری
اس کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں :۔

"بعد اس کلام متبرک کے صاحب دانش و بینش پر ظاہر
ہو کہ کتاب بہار دانش کو شیخ عنایت اللہ طوطیٔ سخن نے ایک
برہمن بچہ حسین و مہ جبین کے کہنے سے تصنیف کیا تھا اور

---

[۱] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۸۴-۸۵
[۲] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص-۹۶

محمد صالح جو اس والا جوہر سے نسبت ہم گوہری و شاگردی کی
رکھتا تھا، اس نے بھی ایک دیباچہ اپنی موزونی طبع کے ساتھ
عبارت رنگین و خوب و بندش الفاظ دلچسپ و مرغوب کے تصنیف
کرکے اس کتاب میں داخل کیا تھا۔ اب اس ذرۂ بے مقدار،
خاک پائے آل احمد مختار صلوات اللہ علیہ و آلہ اجمعین سید حیدر
بخش آمادہ بے ہنری متخلص حیدری ساکن دلی خلف سیّد
ابوالحسن نجفی نے عہد میں ظل سبحانی ابن عالمگیر ثانی شاہ عالم
بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے دور حکومت میں افتخار بصیرت
جہان و استظہار سخنوران دوران، معدن عدل و انصاف،
اشرف الاشراف زبدۂ نوآئینان عظیم الشان، مشیر خاص شاعر
کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام
افضالہ کی سنہ بارہ سو اٹھارہ ہجری مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی
کے، فرمانے سے صاحب والا شان ارسطوئے زمان و فلاطون
حشم، مخزن لطف و کرم جناب مسٹر ولیم ہنٹر دام اقبالہ کے، موافق
اپنی طبع کے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا اور نام اس کا گلزار دانش
رکھ کر اہل دانش و بینش کی نذر گزرانا۔ دقیقہ سنجان قضا و قدر
و عقدکشایان ارباب فضل و ہنر پر مخفی و پوشیدہ نہ رہے
اگرچہ زعم میں اس ذرہ بے مقدار فرومایہ کے یہ بات سمائی
ہے کہ عبارت کی بندش و معنی کے حاصل ہونے میں نقص نہیں
تو بھی انسان مرکب من الخطا و نسیان جان کر عرض کرتا ہے کہ اگر
کہیں اس میں غلطیٔ معنی یا نامربوطی الفاظ رہ گئی ہو ــــ اور

سیر کرنے کے وقت نظر فیض اثر سے گزرے تو قلم عطارد رقم
سے اصلاح کریں اور دامن کرم سے چھپا دیں۔ یقیں ہے جو
کوئی چشم انصاف سے ملاحظہ کرے گا سقم کم پاوے گا اور
جو دیدہ خوردبین سے نظر کرے گا خدا جانے کیا کیا دیکھے گا۔
قطعہ:

الٰہی تا ابد اس داستاں کو
چُھپانا دشمنوں کی چشم بد سے
کہیں اس کو سدا دے، اہل دانش
رکھیں محفوظ جو نت رد و کد سے"[1]

اس کتاب کا انداز مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:
"جب اس کے گھوڑے نے خانہ زین کو اپنے خاوند کے
نہ ہونے سے خراب و ویران دیکھا۔ خانہ بدوشوں کی طرح
کیدھر اودھر پھرنے لگا اور ہر ہر قدم ٹھوکر کھائے۔ بہرام
اپنے دشمن کا کام تمام کر کے زہرہ کی طرف گھوڑا کڑکا کے
اڑ لاگا۔ لیکن اس مقام میں کہ پیر چرخ اپنے پردۂ نیلگوں سے
ہر گھڑی ایک نیا شعبدہ دکھلاتا ہے اور ہر آن اس تخت دُنیا
پر ایک آفت ڈالتا ہے ایک اور ہی نیا ستم ایجاد کیا۔

اس روزگار شعبدہ پرداز نے نہ پوچھ
اس خانۂ طلسم سے ایسے الم اُٹھائے

---

[1] حیدری: گلزار دانش عکس قلمی نسخہ مملوکہ راقم: ص۔۲۔۳

ایک اور اس کے سر پہ ستم کا گرا پہاڑ
یعنی شب فراق منہ اپنا اسے دکھائے
لیکن وہ غم نہیں جو رہے تا بہ زندگی
نہ شب ہے وہ کہ جس پہ تنزل کبھی نہ آئے"[1]

یہ ضخیم کتاب ترتیب و تدوین کی منزلوں سے گزر رہی ہے اور انشاءاللہ جلد شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کی جائے گی۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد جب حیدری کو ذرا اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے اپنی بعض بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کیا، اور اس کا نام "گلدستۂ حیدری" رکھا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں کی اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ھ میں عنایات و تفضلات سے صاحبان عالیشان والا خاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کی ایک صورت اطمینان کی ہے۔ اور مفارقت میں یاران قدیم دوستان صمیم کی اوقات یونہی گزرتی ہے۔ اس واسطے چند قصے زبان ریختہ ہندی میں موافق اردوئے معلے کے نثر کئے گئے۔ جیسے قصۂ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصۂ لیلٰے مجنون کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین

---

[1] حیدری: گلزار دانش عکس قلمی نسخہ مملوکہ راقم ص۔ ۲۔ ۳

اولیا نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے۔ اور چند اشعار پریشان
اور کئی مخمس و چند قطعہ جو اس ہیچ مدان نے تصنیف کئے، سو
احاطہ تحریر میں آئے۔ اور اس مجموعہ بے سر رشتہ و بے محاورہ
کو جو اس بے سر و پا نے جمع کیا ہے، نام اس اوراق پریشان
کا گلدستہ حیدری رکھا ہے"۔ [1]

اس قلمی نسخے میں حیدری کی کئی اہم تصانیف شامل ہیں۔ سب سے
پہلے تو اس میں کچھ قصے ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان دونوں اعتبار
سے دلچسپ ہیں۔ میں نے ان قصوں کو مرتب کر کے "مختصر کہانیاں" کے نام
سے شائع کر دیا ہے۔ یہ کہانیاں "نہ صرف اردو کی ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں
بلکہ مختصر افسانے کی فنّی روایت میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان
میں مختصر افسانے کے فن کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے موضوعات
زندگی کے عام معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی بنیادی
خیال کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں سے اکثر میں وحدت تاثر کا پہلو بھی اپنی
جھلک دکھاتا ہے۔ تہہ داری اور رمز و ایما کی خصوصیت بھی ان میں سے
اکثر میں موجود ہے۔ ان کا مواد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے حاصل
کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان میں زندگی کے جذباتی اور ذہنی، معاشرتی اور
تہذیبی مسائل فن کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور یہی ان
کی سب سے بڑی خوبی ہے"۔ [2]

---

[1] حیدری: گلدستہ حیدری: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص۔۱

[2] ڈاکٹر عبادت بریلوی: مقدمہ مختصر کہانیاں۔ اُردو دنیا کراچی (۱۹۶۳)
ص ۶۰- ۶۵

ایک کہانی یہاں نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہے۔

"سنا ہے کہ ایک سوداگر بچہ نوجوان عالی خاندان بیس اکیس برس کا سن وسال، دنیا کی دولت سے مالامال، فارغ البال ہمیشہ اپنے شہر میں رہا کرتا۔

ایک دن اس کی جورو نے کہا "میاں! تم مرد ہو۔ تمہارا اس صورت سے گھر میں بے حس وحرکت بیٹھ رہنا اچھا نہیں کیونکہ آدمی کو بے رنج راحت نہیں اور زر کو برکت بے تجارت۔ اسی طرح سے اگر گزران کروگے تو قارون کے خزانے سے بھی عہدا برآنہ ہوسکوگے۔ جس سے بہتر یہی ہے کہ سفر کرو۔ کچھ دنیا کے کاروبار سے بھی واقف ہو۔" اس واسطے کہ وہ گھر سے نکلے تو وہ اپنے یار سے چین کرنے لگے۔

غرض بہ ہزار خرابی اس نے اسے گھر سے نکالا۔

جب وہ پردیس چلا ہر ایک عورت نے اپنے حوصلے کے موافق سوغات کو کہہ دیا اور اس کی جورو نے بھی کہا کہ "صاحب میرے واسطے، اگر ہاتھ لگے، تو ایک سیر بھر چرتر لانا۔" آخر کار وہ ایک جہاز پر سوار ہوا اور کسی شہر کا رستہ پکڑا۔ بعد دو چار مہینے کے ایک ملک میں جا پہنچا اور خرید و فروخت کرنے لگا۔ جب اپنا مال بیچا تب سوغات کی جنس اپنے لوگوں کی خاطر ڈھونڈنے لگا۔ جس جس چیز کو کہا تھا سو سب میسر آئی مگر چرتر کی جنس کہیں نہ پائی، لاچار ہو کر اپنے جہاز کی طرف پھرا۔ اتفاقاً راہ میں ایک بڑھیا ملی اور اسے متفکر دیکھ کر کہنے

لگی کہ "واری گئی تو کس واسطے حیران ہے"؟

اس نے کہا کہ "ماما! میں نے بہت سا اسباب واسطے سوغات کے لیا ہے مگر چرتر کی جنس نہیں ملتی۔ اس لئے غمگین ہوں کہ بی بی کو کیا جواب دوں گا۔"

اس نے کہا "لڑکے! اگر چھ مہینے میرے پاس رہنا قبول کرے تو وہ چرتر کون چیز ہے، میں خرید دوں گی۔"

اس نے یہ بات مانی اور صحبت بڑھیا کی غنیمت جانی۔

حاصل کلام اس نے اس کے سر کے بال کئی مہینے میں بڑھائے اور عروسانہ کپڑے پہنائے۔ دلہنوں کی سی صورت بنا کر بادشاہ کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "جہاں پناہ! اس عورت کا خاوند سپاہی ہے۔ وہ زبردستی اس کو میرے پاس چھوڑ گیا۔ میں رنڈیا دکھیا اس جوان جہان جی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں کیونکر رکھوں؟ آپ جہان پرور ہیں اس کو محل مبارک میں داخل کریں۔ جب وہ نگوڑا آوے گا تب سمجھا جاوے گا۔"

بادشاہ نے یہ بات بڑھیا کی پسند کی اور وزیر سے کہا کہ "بیٹا تیرا پردیس گیا ہے۔ اس کی بی بی اکیلی رہتی ہوگی۔ جس سے بہتر یہی ہے کہ اس عورت کو اپنے گھر لے جا اور بہو سے ملا دے۔ یہ دونوں آپس میں خوش رہیں گی اور باتیں پیار کی کریں گی۔"

وزیر نے یہ حکم بادشاہی قبول کیا۔ اس عورت کو اپنے گھر لے گیا اور کہنے لگا کہ "بابا! جب تک تمہارا خاوند سفر سے پھرے تب تک اس کو اپنے ساتھ رکھو! میری بھی اس میں خوشی ہے اور بادشاہ کی بھی مرضی یہی ہے۔"

غرض اس عورت کو وزیر کی بہو نے اپنے ساتھ رکھا اور ربط دوستی

نہایت بہم پہنچایا۔ ایک دن وہ دونوں کوٹھے پر کھڑیاں تھیں اور دور دور نظریں دوڑاتیاں تھیں کہ اتنے میں اَبر گھر آیا، مینہ برسنے لگا۔ ہوا ٹھنڈی چلی۔ ان کو بے کلی ہوئی۔ جوانی نے ستایا۔ سبزہ لہکا۔ دل بوس و کنار کو چلا۔ وزیر کی بہو نے بے قرار ہو کر اس کو سنایا کہ "بی بی! اگر ہم میں سے اس وقت ایک مرد ہو تو کیا خوب ہو۔ بے کھٹکے رہیں اور عیش و عشرت کریں"۔

اس نے اپنی دانائی سے معلوم کیا کہ اس وقت اس کا جی ایک مرد کی خواہش رکھتا ہے۔ حقیقت میں تو مرد تھا ہی۔ اس کو بھی ایک جوانی کی ترنگ آئی اور حرص دنیوی غالب ہوئی۔ بہ طور لگاوٹ کے بات اس نے کہی کہ "بی بی! اس وقت ہم تم نماز پڑھیں اور دعائیں مانگیں۔ خدا کریم کارساز ہے شاید ہم میں سے ایک کو مرد کر دے"۔

یہ سخن دونوں نے ٹھہرایا اور دعا کی خاطر ہاتھ پھیلایا۔

بعد ایک ساعت کے وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ "میری دعا تو جناب الٰہی میں مستجاب ہوئی اس نے اپنے کرم سے مجھے علامت مرد بخشی۔ اب آپ اِدھر تشریف لائیں۔ کچھ ہم سے مل کر حظ دنیوی اٹھائیں"۔

یہ بات سن کر وہ خوش ہوئی اور دوڑ کر اس کے گلے لپٹ گئی۔ پھر تو وہ دونوں بخوبی اختلاطین کرتے تھے اور چین اُٹھاتے تھے۔

بعد کئی مہینے کے اس کا شوہر آیا۔ وزیر نے اپنی بہو سے کہا کہ "بابا! تمہارا خاوند آیا ہے۔ اب اس عورت کو نیچے کے مکان میں جگہ دو اور تم اپنے دولہا سمیت اوپر کے مکان میں رہو۔

یہ بات اس نے اپنے سسر کی طوعاً و کرہاً قبول کی اور خاوند کے ساتھ رہنے لگی۔ بعد دو چار دن کے آدھی رات کو ایک خنجر تیز سے اپنے خاوند کو ذبح

کیا اور لاش اس کی مع سر دریا میں بہا دی۔ تعشق سے بھری اس کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ "میں نے تیرے واسطے اپنا خاوند مارا۔ اگر مجھ کو اب لے آؤ بھرتا ہے تو لے۔ اور ایسا وقت پھر نہ پائے گا۔ مثل مشہور ہے شب حاملہ فردا چہ زاید۔"

وہ یہ سخن سنتے ہی کہنے لگا کہ "بی بی! میں احمق نہیں کہ تجھ سی قصابن کو ساتھ رکھوں کہ وقت بے وقت اپنے تئیں بھی ذبح کرواؤں۔"

یہ کہہ کر بھاگا اور بڑھیا کے گھر کا رستہ پکڑا۔

جب اس نے دیکھا کہ خصم کا خصم موا اور یار کا یار جدا ہوا تب لاچار ہو کر وہاں سے پھری اور اپنے بچھونے پر جا کر سو رہی۔

صبح کو سسر نے آکر پوچھا کہ "بنو! تمہارا خاوند کیا ہوا؟"

اس نے کہا کہ "بابا جان! پچھلے پہر وہ میرے پاس سے اٹھ اور اس سپاہی کی جورو کو اپنے ساتھ لے کر خدا جانے کہاں چلے گئے۔"

"یہ سن کر وزیر کو دو غم ہوئے۔ ایک تو بیٹے کا چھٹنا۔ دوسرے امانت میں خیانت کا پڑنا۔ لاچار کیا کرتا۔ ہاتھ سے بازی جا چکی تھی۔ چپ ہو رہا۔

اور وہ اسی زنانے لباس سے بڑھیا کے پاس گیا اور احوال گزشتہ کہنے لگا۔

یہ بات سن کر وہ خوش ہوئی اور بولی کہ "واری گئی اگر عقل رکھتا ہو گا تو احوال چرتر کا معلوم کرے گا۔"

غرض صبح کو اس کا سر منڈا، مردانے کپڑے پہنا، سپاہیوں کی صورت بنا بادشاہ کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "یہ وہی سپاہی جاہل ہے کہ جس کی عورت محل میں داخل ہے۔ اب یہ حضور میں آیا ہے۔ اس کی امانت

اسے ملے۔"

بادشاہ اس کی شیریں سخنی سے خوش ہوا۔ وزیر سے کہنے لگا کہ "اے خیراندیش و نیک نظر! اس کی عورت کو اس کے حوالے کر"!

وزیر یہ سخن سن کر متفکر ہوا اور اپنے جی میں ارادہ کرنے لگا کہ وہ تو اس کی جورو لے گیا ہے، تو اس کی بیوی اس کے حوالے کر کیونکہ تو بھی سرخرو پیش شاہ بحر و بر ہو اور جبر و نقصان برابر ہو۔

یہ بات ٹھرائی اور اس سپاہی کو اپنے گھر لا کر اپنی بہو بہ منت اس کے حوالے کی۔

وہ اس عورت کو لئے ہوئے پھر بڑھیا کے پاس گیا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ہنسی اور کہنے لگی کہ "مبارک، کل اپنے جہاز یہاں سے کھلوایئے اور بھرے پرے اپنے شہر تشریف لے چلیئے کچھ بٹے بازی یہاں دکھلائی ہے اور کچھ کارستانی وہاں دکھلاؤں گی۔"

غرض اس عورت اور اس سوداگر بچے کو، بعد کئی مہینے کے، اس کے شہر میں لائی اور کہنے لگی کہ "تو اپنے گھر کہلا بھیج کہ میں خدا کے فضل سے آج اس شہر میں داخل ہوا لیکن تاریخ منحوس کے باعث گھر میں نہیں آسکتا، انشاء اللہ تعالےٰ تڑکے آؤں گا۔

یہ خبر سنتے ہی اس کی جورو ظاہر تو خوش ہوئی پر باطن میں مر ہی گئی۔ وہ چار گھڑی رات گئے اپنے یار کو بلوا کر کہنے لگی کہ "صاحب وہ کمبخت تو آپہنچا۔ بہتر یہی ہے کہ آج ہم تم دل کھول کر عیش و عشرت کریں۔ کل خدا جانے کیا ہو۔ مثل مشہور ہے۔ بیت

یہ دو دل کو ایک جا بٹھاتا نہیں
کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

یہ کہہ کر شرابیں منگوائیں اور بد مستیاں شروع کیں۔ گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹے اور بہ فراغت تمام سو رہے۔

جب آدھی رات کا عمل ہوا تب وہ بڑھیا ایک خنجر اپنی کمر سے لگا کر جہاز سے اتری اور اس سوداگر بچے کے گھر کسی سبب سے گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ سوداگر بچے کی جورو اور ایک مرد نوجوان آپس میں لب سے لب ملائے اور چھاتی سے چھاتی بھڑائے عالم عیش میں بستر راحت پر پڑے ہیں۔

یہ تماشا دیکھتے ہی اس نے خنجر کمر سے نکالا اور اس مرد کا سر کاٹ ڈالا۔ دھڑ تو وہیں چھوڑا۔ سر رومال میں باندھ کر وہاں سے لے اڑی اور سوداگر بچے کے پاس آ کر کہنے لگی کہ "صبح کو دو چار گھڑی دن چڑھے اس سر کو مع اسباب سوغات اپنے گھر لے جا۔ جس وقت وہ لوگ تجھے دیکھیں اور اپنی اپنی سوغات طلب کریں، اسی وقت ہر ایک کی امانت ہر ایک کے حوالے کرنا اور اپنی بی بی سے کہنا کہ "صاحب! آپ بھی اِدھر آئیں اور اپنی سوغات لیں۔ آپ نے تو سیر بھر چرتر منگوایا تھا، میں سوا سیر لایا۔ اس کو لو اور میری محنت کی داد دو"! یہ کہہ کر وزیر کی بہو کو سامنے کر دینا اور اس سر کو اس گود میں دھر دینا"۔

غرض صبح کو وہ سوداگر بچہ ان دونوں کو لے کر اپنے گھر گیا اور اس بڑھیا کے کہنے کے بموجب اپنے عمل میں لایا۔ چنانچہ ہر ایک کی سوغات دے کر وزیر کی بہو کو اپنی بی بی کے سامنے کھڑا کیا۔ اور اس سر کو اپنی گود میں دھر کر کہنے لگا کہ "بی بی! تم نے سیر بھر کہا تھا، میں سوا سیر لایا ہوں۔ دیکھو! سیر بھر تو یہ عورت ہے کہ جس نے میرے واسطے اپنے شوہر کو مارا اور پاؤ سیر یہ ہے کہ جس کا سر تمہاری گود میں کٹا۔ اپنے دل کی ترازو میں تول لو اور سچے من سے جواب دو! دیکھو تو کچھ تمہارے چرتر سے میزان بنتی ہے یا نہیں؟

سچ کہو!"

جونہی اس نے وہ سر دیکھا وہیں شرمندہ ہوئی اور چاہتی تھی کہ گردن نیچی کرے کہ اتنے میں اس نے تلوار کمر سے لی۔ پہلے تو وزیر کی بہو کا سر کاٹا پھر اپنی بی بی کا کام تمام کیا۔ جب تک جیا پھر رنڈی کا نام نہ لیا"۔[1]

گلدستۂ حیدری میں حیدری کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس کا نام گلشن ہند یا گلشن ہندی ہے۔ یہ تذکرہ انہوں نے ۱۲۱۴ھ میں لکھا۔ جیسا کہ اس قطعہ سے ظاہر ہے۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں
زروئے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب
اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند[2]

بُعد اس کے صاحبان طبیعت پر معلوم ہو کہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلف سید ابوالحسن نجفی ساکن دلی، شاگرد قبلہ کونین مولوی غلام حسین غازی پوری، تعلیم یافتۂ مجلس نواب[3] ابراہیم علی خان بہادر مرحوم سنہ بارہ سو چودہ، ہجری میں اکیسویں رجب کو تری کی راہ میں بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ بعد قطع منزل غازی پور کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی: مختصر کہانیاں۔ حیدری: اردو دنیا کراچی ص ۶۰۔ ۶۵
[2] حیدری: تذکرہ گلشن ہندی (گلدستۂ حیدری: نسخہ آکسفورڈ)
[3] اصل متن میں نواب ابراہیم علی خان ہے۔ علی ابراہیم خان ہونا چاہیئے۔ حیدری سے سہو ہوا ہے۔

محمد علی مرزا محمد فاضل کے بیٹے، دلی کے رہنے والے سے، کہ وہ بھی ایک کشتی میں سوار ہوئے، اسی سمت کو آتے تھے، ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جاکر بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی مہربانی فرماتے تھے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے اسی سبب سے ذکر شعر و سخن بہم ہوا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگے کہ میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں، ان کی سیر کرو اور اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کر کے ترتیب دو، جو تمہاری یادگاری رہے۔

اگرچہ طبیعت فقیر کی صعوبات سفر اور تکالیف زمانے سے ہر آن مشوش رہتی تھی لیکن ان کی خاطر از بس کہ عزیز تھی، وے دیوان دیکھے۔ موافق اپنے حوصلے کے اشعار چنے۔ اور نام ان کے مصنفوں کے بہ قدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لاکر اس تذکرے کا نام گلشن ہندی رکھا۔[1]

حیدری کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ اس میں شاعروں کے حالات بھی کم ہیں، اور انتخاب کلام بھی بہت معمولی سا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے:۔

> "آفتاب تخلص مہر سپہر جہانبانی، شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی کہ بیالیس برس سے تا حال سنہ بارہ سو چودہ ہجری، اورنگ سریر سلطنت کے مانند مہر سپہر کے جلوہ گر ہیں۔ اور آفتاب تخلص رکھتے ہیں۔ یہ تصنیف خاص ہے۔

---

[1] حیدر بخش حیدری: تذکرہ گلشن ہند قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ)

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ مرحوم، ابن نواب شجاع الدولہ مغفور بن نواب ابو المنصور خان صفدر جنگ مبرور۔۔۔ جود و سخا میں یکتائے دہر تھے۔ اور آصف تخلص رکھتے تھے۔ یہ تصنیف خاص ہے۔

دل ہمارا خانۂ اللہ کو مشہور تھا
سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بت خانہ ہوا
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے
آب سے آتش ہوئی کیونکہ ہم کیا جانیے
پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یارو
میں ہوں اور رات ہے اور عالم تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زینہار
لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جاوے گا کچھ لئے[1]

یہ تذکرہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس کو مرتب کر کے پریس میں دے دیا ہے۔ انشاء اللہ جلد شائع ہو کر سامنے جائے گا۔

---

[1] حیدری: تذکرۂ گلشن ہندی۔ (گلدستہ حیدری) قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ۔

گلدستۂ حیدری میں حیدری کا وہ دیوان بھی شامل ہے جو اس وقت شائع کیا جا رہا ہے۔ اس دیوان کی تفصیل اس سے قبل اسی مقدمے میں پیش کی جا چکی ہے۔

حیدری کی یہ کتاب گلدستۂ حیدری اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج نے منظور کر لی تھی۔ تین سو صفحات تھے اور اس پر انہیں دو سو روپے کا انعام ملا تھا[۱] لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔

ہفت پیکر، بھی حیدری کی اہم تالیف ہے۔ یہ ایک منظوم مثنوی ہے جو ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ "جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" نکالی تھی۔ اس کا ایک نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانے میں تھا لیکن یہ کبھی شائع نہیں ہوئی[۲]۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ مجھے انگلستان میں بھی دستیاب نہیں ہوا۔

حیدری نے تاریخ نادری کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب محمد مہدی ابن محمد نصیر استرآبادی نے تاریخ جہاں کشائے نادری کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ یہ نادر شاہ کے ہم عصر تھے۔

اس کتاب میں نادر شاہ کے مفصل حالات ہیں۔ حیدری نے اس کتاب کا ترجمہ ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں کیا۔ یہ کتاب نایاب ہے۔[۳] انگلستان کے دوران قیام میں باوجود کوشش کے مجھے اس کا کوئی نسخہ دستیاب

---

[۱] محمد عتیق صدیقی گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص۔ ۱۷۰

[۲] سید محمد: ارباب نثر اردو مطبوعہ لاہور۔ ص۔ ۷۹

[۳] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص۔ ۱۵۱

نہ ہو سکا۔

بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ حیدری نے جامع القوانین کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے دو سو صفحات تھے اور اس پر انہیں سو روپے کا انعام ملا تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے گل کرسٹ اور اس کا عہد، میں چند ایسی کتابوں کی فہرست دی ہے جو فورٹ ولیم کالج میں طباعت کے لئے تیار کی جارہی تھیں۔ ان میں اس کتاب کا نام بھی ہے[1] سید محمد اور حامد حسن قادری کو اس کتاب کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ مجھے انگلستان کے دوران قیام میں، باوجود کوشش کے اس کا بھی کوئی نسخہ نہیں ملا۔

حیدری کی آخری تالیف 'گل مغفرت' ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں لکھی۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا سے ماخوذ ہے۔ پہلے حیدری۔ اس کتاب کو 'گلشن شہیدان' کے نام سے اردو میں منتقل کیا تھا پھر شہدائے کربلا کے حالات اس میں سے نکال کر ایک کتاب مرتب کی اور اس کا نام 'گل مغفرت' رکھا۔ اور یہ سب کچھ ایک دوست کے کہنے پر کیا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

> بعد اس کلام متبرک کے صاحبان درد وغم و مبتلایان رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری نے کتاب گلشن شہیدان سے، جس کو پہلے کتاب روضۃ الشہداء سے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں

---

[1] محمد عتیق صدیقی۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص - ۱۷۵

تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل و گلزار معانی، شمع بزم نکتہ دانی، گوہر بحر سیادت و امامت، سرو جوئبار گلشن شرافت و نجابت مولوی سید حسین علی صاحب جون پوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے، جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مدان کو ایک رسوخ ادبی و نیاز باطنی ہے، اس نسخہ کو انتخاب کیا، اور نام اس کا گل مغفرت رکھا۔ اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے۔ مقبول خاطر عاطر ہووے"۔ ؎۱

گل مغفرت ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۷ھ میں کلکتہ کے ہندوستانی چھاپے خانے میں چھپی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"نسخہ گل مغفرت، لکھا ہوا سید حیدر بخش حیدری کا، عہد حکومت میں زبدۂ نوئینان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان نواب مستطاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وافضالہ کے سنہ بارہ سو چھبیس ہجری مطابق اٹھارہ سو بارہ عیسوی کے دارالامارت کلکتہ کے ہندوستانی چھاپے خانے خاص و عام کے فائدے کی خاطر چھپوایا گیا"۔ ؎۲

اب اس کو مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی شائع کر دیا ہے۔

گل مغفرت کا اندازہ یہ ہے :-

؎۱ حیدری : گل مغفرت : (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۱۲ء) ص ۔ ۷ ۔ ۸

؎۲ ایضاً۔ ص۔ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پہلی مجلس حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی

جو اشک گرے بہر جگر گوشۂ زہرہ
ہے لاکھ عبادات سے بہتر یہ عبادت
اے حیدری آنسو نہ سمجھ اس کو سنا ہے
کہتے ہیں اسے اہل نظر بحر شفاعت

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی محفل عزا میں بیٹھو۔ اپنی صدف چشم سے گوہر سرشک بہاؤ۔" [۱] ص۔۲۰۸

دوسری مجلس جناب سیدۃ النسا فاطمہ زہرا بنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کی۔

خوشا وہ چشم جو ہو نم حسین کی خاطر
خوشا وہ دل جو کرے غم حسین کی خاطر
زہے وہ محفل شادی زہے وہ بزم سرور
کہ جس میں کیجیے ماتم حسین کی خاطر

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت فاطمۃ زہرا علیہا السلام نے لباس حیات اپنے جسم مطہر سے اتارا اور سفر آخرت کے اسباب کا تہیہ کیا۔ [۲] ص۔۲۸۔۲۹

---

[۱] حیدری: گل مغفرت: (مطبوعہ کلکتہ۔۱۸۱۲ء) ص۔۸۔۹
[۲] حیدری: گل مغفرت (کلکتہ) ص۔۲۸

تیسری مجلس حضرت مرتضیٰ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے شہید ہونے کی۔

اے محبو! بیٹھے کیا ہو گریہ و زاری کرو
جانشین مصطفیٰ پر آج خونباری کرو
حیدری، ہو واسطے حیدر کے سرکو پیٹ پیٹ
اس ولی اللہ کی دل سے عزاداری کرو

اے مومنو! آلِ عبا کے عزادارو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں جناب مرتضیٰ علی علیہ السلام کی بعضی بعضی فضیلت اور شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سنو اور چشمۂ چشم سے دریائے سرشک بہاؤ۔[1] ص۔ ۷۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

چوتھی مجلس حضرت امام حسین علیہ السلام کے شہید ہونے اور اس دنیائے دون سے سفر کرنے کی۔

اے چشم اشک بار نہ رونے میں کر کمی
جوں مردمک لباس کر اپنا تو ماتمی
اس بزم میں دے بہر خدا خون دل بہا
ٹک دیکھ یاں ہے فاطمہ اہل عزا بنی

اے یارو! آلِ عبا کی بزم کے بیٹھنے والو! وائے جناب حسینؑ کی محفل عزا کے سنوازنے ہارو۔

---

[1] حیدری: گل مغفرت (کلکتہ) ص۔ ۷۴

یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت امام حسین علیہ
السلام کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ روؤ، اور لخت جگر چشم
تر سے بہاؤ۔" لہ ص۔ ۶۵
پانچویں مجلس حضرت مسلم ابن عقیل علیہ السلام کے شہید ہونے کی۔

دریائے خون اے مومنو آنکھوں سے دو بہا
بہر حسین تشنہ لب و شاہ کربلا
ہے سرخروئی تم کو اسی سے بہ روز حشر
پیش رسول و فاطمہ و پیش مرتضےٰ

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت مسلم
ابن عقیل کے شہید ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی بے کسی
اور تنہائی پر روؤ۔ چشمۂ چشم سے خون دل بہاؤ۔" لہ ص۔ ۸۵
چھٹی مجلس حضرت مسلم ابن عقیل علیہ السلام کے صاحبزادوں بیکسوں
کے شہید ہونے کی۔

کیوں نہ ہوں اس غم میں آنسو اپنی آنکھوں سے رواں
غم الم کو دیکھ کر روتا ہے ہر شب آسماں
ہے غضب وہ حضرت مسلم کے دونوں نورعین
تشنہ لب دریا کنارے قتل ہوں اے مومناں

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت مسلم

لہ حیدری: گل مغفرت (کلکتہ) ص۔ ۶۵
لہ ایضاً: ص۔ ۸۵

ابن عقیل علیہ السلام کے صاحب زادوں کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ [۱]

سید حیدر بخش حیدری کے حالات و تصانیف کی اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے سب سے اہم مصنف تھے۔ انہوں نے اچھی خاصی تعداد میں نثر کی کتابیں لکھیں اور آسان اور سادہ نثر کا وہ اسلوب بھی پیدا کیا، جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے صرف ترجمے ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا، طبع زاد ادبی تخلیقات کو پیش کرنے میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کی پرواز صرف روایتی انداز کی داستانوں ہی تک محدود نہیں رہی، انہوں نے بعض نئی اصناف ادب کا تجربہ بھی کیا۔ انہوں نے صرف آسان اور سادہ نثر کی طرف توجہ ہی نہیں کی، ایک بڑے ہی دلکش اور دلآویز اسلوب کی طرح ڈالی —— اور اس اعتبار سے وہ اردو نثر کے ایک اہم صاحب طرز انشاء پرداز اور ایک منفرد تخلیقی فنکار نظر آتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کا میدان نثر ہے، اور اسی میدان میں انہوں نے اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے بھی وہ کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں۔ ان کا کلام زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ حقیقت اور واقعیت سے لبریز نظر آتا ہے اور اس میں شروع سے آخر تک سوز وگداز کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

---

[۱] حیدری : گل مغفرت : (کلکتہ) ص۔ ۱۰۰

دیوان حیدری ان خصوصیات کی صحیح آئینہ داری کرتا ہے، اور وہ حیدری کے شاعرانہ اور فن کارانہ مزاج کا ایک نہایت ہی حسین مرقع ہے۔

عبادت

۱۹ تذکرۂ حیدری

سیّد حیدر بخش حیدری دہلوی کا یہ تذکرہ (گلشن ہند یا گلشن ہندی) شعرائے اُردو کے مختصر حالات اور انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ حیدری نے اس تذکرے کو ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں مُرتب کرنا شروع کیا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> بعد اس کے صاحبانِ طبیعت پر معلوم ہو کہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلفِ سیّد ابوالحسن نجفی ساکنِ دلّی، شاگردِ قبلۂ کونین مولوی غلام حسین غازی پوری تعلیم یافتہ مجلس نواب

ابراہیم علی خاں بہادر[۱] مرحوم سنہ بارہ سو چودہ ہجری میں اکیسویں رجب کو تری کی راہ بنارس سے مُرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ بعد قطع منزل غازی پور کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا محمدؐ علی، مرزا محمدؐ فاضل کے بیٹے، دلّی کے رہنے والے سے، کہ وہ بھی ایک کشتی میں سوار ہوتے، اسی سمت کو آتے تھے، مُلاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی مہربانی فرماتے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے۔ اسی سبب سے ذکر شعر و سخن بہم ہوا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگے کہ "میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں۔ ان کی سیر کرو اور اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کر کے ترتیب دو جو تمہاری یادگاری رہے۔"

اگرچہ طبیعت فقیر کی صعوباتِ سفر اور تکالیف زمانے سے ہر آن مُشوّش رہتی تھی لیکن ان کی خاطر از بس کہ عزیز تھی، وے دیوان دیکھے۔ موافق اپنے حوصلے کے اشعار چنے اور نام ان کے مصنّفوں کے بہ قدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لا کر اس تذکرے کا نام گلشن ہندی رکھا۔[۲]"

اور چھ سات برس میں اس کو مکمل کیا۔

---

[۱] نواب علی ابراہیم خاں ہونا چاہیئے۔ حیدری سے سہو ہوا ہے۔
[۲] سید حیدر بخش حیدری: تذکرہ گلشن ہند قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ۔

یہ تذکرہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ بعض ادبی تاریخوں میں اس کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن کسی ادبی مؤرخ یا محقق نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ اسی لئے اس کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کے قلمی مخطوطات کی فہرست میں گلدستۂ حیدری کے قلمی نسخے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس تذکرے کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ :

"اس کا ایک مکمل نسخہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ کے کتب خانے میں ہے[1]۔"

میں نے تذکرۂ حیدری کے ان دونوں نسخوں کو دیکھا۔ برٹش میوزیم کا نسخہ ناقص ہے۔ اس میں مؤلف کا لکھا ہوا دیباچہ نہیں ہے۔ اس کا آغاز آفتاب شاہ عالم بادشاہ کے حالات اور انتخاب کلام سے ہوتا ہے اور میر سوز کے بیان پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حیدری نے احوال مؤلف کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہے۔

"اس احقر نے موافق اپنی محبت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جُز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ دو جُز حرف شین سے لے کر حرف ی خُدا جانے کیا ہوئے۔ اس لئے نوبت حرف یا تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے[2]۔"

---

[1] بلوم ہارٹ : فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ص۴۸

[2] حیدری : گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

لیکن انڈین انسٹی ٹیوٹ کے نسخے میں، جواب باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے، یہ تذکرہ مکمل صورت میں موجود ہے۔ اس میں سب سے پہلے مُولف کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد آفتاب شاہ عالم بادشاہ کے مُختصر حالات اور انتخاب کلام سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور حرف ی تک مختلف شاعروں کا ذکر اس میں ملتا ہے۔ آخر میں یہ قطعہ بھی حیدری نے درج کیا ہے جس سے اس تذکرے کی تاریخ نکلتی ہے ؎

مُرتب کر چکا جب تذکرہ میں — زروے حق یہ بولے شیخ اور زند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب — اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند[1]

۱۲۱۴ھ

یہ تذکرہ نہایت مُختصر ہے اور اس میں شاعروں کے حالات کی تفصیل تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے مُقابلے میں مرزا علی لُطف کا تذکرہ (جو اسی نام گلشن ہند سے فورٹ ولیم کالج میں لکھا گیا) نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں حالات کی تفصیل بھی زیادہ ہے اور کلام کا انتخاب بھی۔ لیکن حیدری کا تذکرہ اس اعتبار سے بہر صورت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار اور ایک صاحب طرز انشا پرداز کی تحریر ہے جس کو نہ صرف نثر نگاری بلکہ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اور اسی دلچسپی کے پیش نظر جس نے اس تذکرے میں کچھ نئی معلومات بھی فراہم کی ہے اور انتخاب کلام میں بھی اپنی خوش ذوقی کا اظہار کیا ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر اس غیر مطبوعہ تذکرے کو اب ایک نئی ترتیب

---

[1] حیدری: گلدستہ حیدری قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ۔

اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

اس تذکرے کا متن باڈلین لائبریری آکسفورڈ اور برٹش میوزیم لندن کے نسخوں کے سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ اختلافات کی وضاحت معاصر اور مابعد تذکروں مثلاً مجموعۂ نغز تذکرہ میر حسن، گلشن ہند (لطف) اور طبقات شعرائے ہند وغیرہ کے اندراجات سے کر دی گئی ہے۔

مجھے اس تذکرے کی ترتیب و تصحیح میں اپنے عزیز شاگرد، دوست اور رفیق کار ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی سے بڑی مدد ملی، اور میں اس کے لئے اُن کا بہت شکر گذار ہوں۔

عبادت

۲۵ر نومبر ۱۹۶۶ء

سیّد حیدر بخش حیدری کی اہمیت کو بہت کم لوگوں نے جانا اور ان کے
ادبی مقام کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے
بارے میں ہماری تحقیق اور تنقید دونوں لکیر کی فقیر رہی ہیں۔ ڈیڑھ سو سال گزر
جانے کے بعد بھی لوگ انہیں صرف توتا کہانی اور آرائش محفل کے مؤلف
کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں کا ابھی تک کسی کو علم بھی نہیں
ہو سکا۔ ان میں سے بیشتر یورپ کے مختلف کتب خانوں میں ایک عالم کس
میرسی میں پڑی ہیں۔ ان کتابوں کا شائع کرنا تو درکنار ان میں سے بیشتر کا تو
دیکھنا بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ انگلستان کے دوران قیام میں مجھے خاصی
تعداد میں ان کی ایسی کتابیں ملی ہیں جن کا اس سے قبل بہت کم لوگوں کو علم
تھا۔ یہ کتابیں انہیں اپنے زمانے کا سب سے اہم مصنّف ثابت کرتی ہیں۔
اور ان سے اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک
بلند پایہ انشا پرداز اور ایک اعلیٰ درجے کے تخلیقی فن کار تھے۔ یہ بات بھی
ان تصانیف سے واضح ہوتی ہے کہ ان کا قلم صرف ترجمے ہی تک محدود

نہیں رہا طبع زاد تخلیقات کے میدان میں بھی اس نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تصانیف کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ اس لئے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادیب اور فن کار کی حیثیت سے ایک پہلودار، وسیع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی داستان گوئی اور افسانہ نگاری، شاعری اور تذکرہ نویسی سب اس خیال پر صداقت کی مُہر لگاتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف مُصنّف ہونے کے باوجود ان پر جیسا کام ہونا چاہیئے تھا۔ وہ نہیں ہو سکا ہے۔ بہت کم لکھنے والوں نے ان کے حالات کا سُراغ لگایا ہے اور ان کے ادبی مرتبے کی اندازہ دانی کی ہے۔ ان کے حالات کی تفصیل خود ان کے ہم عصروں کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ شاعر تھے اور اُنہوں نے عنفوانِ شباب ہی میں شاعری شروع کر دی تھی[1]۔

لیکن ان کے زمانے بیشتر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل ان کے محسن اور مُربّی تھے اور حیدری نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا تھا' لیکن تذکرہ گلزار ابراہیم میں خلیل نے حیدری کا ذکر نہیں ہے۔ مرزا علی لُطف ان کے ہم عصر اور فورٹ ولیم کالج میں ان کے رفیق کار تھے لیکن لُطف کا تذکرہ گلشن ہند بھی حیدری کے ذکر سے خالی ہے اُردو شاعروں کے صرف تین تذکرے ایسے ہیں جن میں حیدری کا ذکر موجود ہے۔ ایک تو بینی نارائن جہاں کا تذکرہ دیوانِ جہاں، دوسرا عبد الغفور

---

[1] دیوان حیدری: غیر مطبوعہ قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ

نساخ کا تذکرہ سخنِ شعرا، اور تیسرا کریم الدین کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند،
بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکرے میں اُن کے متعلق صرف یہ لکھا ہے :
"حیدری تخلص، نام میر حیدر بخش دلی کے رہنے والے، بالفعل مسندِ حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی ہے۔ اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں[1]"
اور عبدالغفور نساخ[2] نے صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے :
"حیدری تخلص۔ حیدر بخش دہلوی۔ ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی آرائش محفل یعنی ہفت سیرِ حاتم نظر سے گزری[3]"
کریم الدین نے طبقاتِ شعرائے ہند میں کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں :
"منشی سید حیدر بخش حیدری تخلص متاخرین میں سے ہے۔ وہ ایک متاخر مصنف ہے جس نے بہت سی کتابیں بنائی ہیں۔ طوطا کہانی کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ اُس نے علی ابراہیم خاں سے جو ۱۸۰۱ء میں مرا تھا، تعلیم پائی اور وہ مولوی غلام حسین غازی پوری کا بھی شاگرد تھا۔ بینی نارائن بیان کرتا ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء میں موجود تھا اور اس سے واقفیت رکھتا ہے۔ سوا اکثر نظم سے اس کی تصنیف سے یہ ہیں۔ ایک طوطا کہانی۔ یہ قصہ ایک مُغلق عبارت میں ضیاء الدین نخشبی نے تصنیف کیا تھا مگر محمد قادری نے کچھ

---

[1] بینی نارائن جہاں : دیوان جہاں قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ۵۰-۵۱
[2] نساخ۔ سخن شعرا۔ مطبوعہ نولکشور ص۱۲۳
[3] نساخ : سخن شعرا مطبوعہ نولکشور ص۱۲۳

مختصر کر کے سہل عبارت میں تصنیف کیا اور حیدری نے اس کتاب سے اپنا ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کا ترجمہ شائستہ نسبت اوس کے ہے اور اوس میں نظم اور نثر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے اصل اس کتاب کی ایک کتاب سنسکرت میں سکھا سبتی[1] ہے۔ حیدری نے اس کتاب کو درمیان ۱۲۱۵ھ کے تصنیف کیا تھا اور ایک ترجمہ اردو قصہ حاتم طائی کا نثر اور نظم آمیز اس کی تصنیف ہے۔ ایک ترجمہ اس کا ڈنکن نوپ[2] نے انگریزی ترجمہ تیار کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نام آرائش محفل ہے۔ یہ ترجمہ درمیان ۱۲۱۴ھ کے تیار ہوا تھا۔ مگر ہندوستانی اپنے خیالات درباب ترجمہ اتنے بھڑاتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ترجمہ نہیں رہتا بلکہ اس کی ایک علیحدہ تصنیف مثل اوّل کے تصنیف کے تصوّر کرنا چاہیئے۔ تیسرے "گل مغفرت" اس میں ان شہداء کا بیان ہے جو پیغمبرؐ خدا سے امام حسین علیہ السلام تک گزرے ہیں۔ یہ کتاب ایک ترجمہ روضۃ الشہداء کا ہے جس کو گلشنِ شہیداں بھی کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ میں طیار ہوا تھا۔ یہ کتاب بخواہش مولوی سید حسین علی جونپوری کے تصنیف کی تھی۔ چوتھی کتاب گلزار دانش۔ یہ ایک ترجمہ بہار دانش کا ہے جو فارسی میں محمد مہدی نے لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ سر ولیم جونس نے انگریزی میں تیار کیا ہے۔ چھٹا مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی حیدر بخش نے ایک مختصر شاہنامہ اُردو میں لکھا ہے۔ ایک مثنوی ہفت پیکر اس

---

[1] شکا پستتی
[2] ڈنکن فاربس

تصنیف ہے۔ یہ ایک قصّہ وہ ہے جس میں مضمون وہ ہی ہے جو نظامی کی کتاب ہفت پیکر میں۔ ایک قصہ دکنی زبان میں بھی ہے بہ نام قصّہ بہرام و گل اندام وہ بھی اس طور کا ہے جو کہ بدنصیب سلطان ابوالحسن آخر نواب گولکنڈہ کے، جس نے شکست کھا کر اورنگ زیب کی قید میں مُقیّد ہوا تھا، درمیان ۱۶۸۷ء کے" لے

جدید دور میں سید محمدؔ نے ارباب نثر اُردو میں، حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں اور محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کا عہد میں حیدری کے متعلق کچھ معلومات ضرور فراہم کی ہے لیکن ان کی زندگی، شخصیت، نثر نگاری اور شاعری کے کسی نئے گوشے کو دریافت نہیں کیا ہے۔ حیدری کی غیر مطبوعہ تحریروں میں جو نئی معلومات ملتی ہے، اس تک بھی ان لکھنے والوں کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لئے ان میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

حیدری کے صحیح حالات کو معلوم کرنے کے لئے ان کی بعض غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تحریریں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل یہ تحریریں حیدری کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ میں نے انگلستان کے دوران قیام میں حیدری کی بعض ایسی غیر مطبوعہ تحریروں کو دیکھا، اور ان سے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔ سب سے پہلے یہ تحریریں رسالہ ادب لطیف۔ لاہور کے جوبلی نمبر ۶۳ئہ میں حیدری کی دو غیر مطبوعہ کہانیوں کے پیش لفظ کے طور پر شائع کیں۔ پھر میں نے ان سے حیدری کی

لے کریم الدین: طبقات شعرائے ہند ص ۲۷۰-۲۷۱

"مختصر کہانیاں[1]" کے مقدمے میں بھی کام لیا اور ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ نئی معلومات فراہم کی۔

یہ تحریریں حیدری کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان سب کو یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گلدستۂ حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

اعمال اس سیّد حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سیّد ابوالحسن والد اس فقیر نے دلّی چھوڑی اور ہمراہی لالہ سکھ دیو رائے کے قبول کی تو بنارس میں تشریف لائے اور پیچھے دلّی کے قصداً دل سے بھولائے (بھلائے) اس وقت یہ ہیچ مدان نہایت خورد سال تھا، لیکن زیر سایۂ دامن قبلہ وکعبہ کے آفات فلکی ازبس کہ بے خطر تھا، اس سن میں بھی مشتاق اہل کمال تھا، چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی اور (عمر) اس فقیر کی بھی حد بلوغیت کو پہنچی، اس عرصہ میں امین الدولہ عزیز الملک نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل اسٹیسن صاحب بہادر جلالت جنگ، حاکمی بنارس کی قبول کر کے ساتھ عزّ و وقار کے مسندِ عدالت پر بیٹھے تو قبلہ گاہی نے اس قدر دان نجیا۔ کی نوکری پر دل دیا اور اس کمترین کو واسطے تربیت اور خوشہ چینی کے اس خرمن سخن کے سپرد کیا۔ چنانچہ اس فقیر کو خدمت گزاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب دام اقبالہٗ کی پسند آئی اور شاگردی قبلہ وکعبۂ کونین مولوی غلام حسین کی بھائی۔ بیت ؎

---

[1] مختصر کہانیاں۔ از حیدری۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ شائع کردہ اُردو دنیا۔ کراچی

بہت سی میں نے کی یاں جبہ سائی جب ایسی گفتگو یہ مجھ کو آئی
اور صحبت سے نخل بند چمن دوستی سید جمیعت علی رضوی کی بھی اس عندلیب
ہیچ مدان نے موافق اپنے فہم کے بہت سی کیفیت اٹھائی ہے لیکن افسوس کہ
گردش فلکی نے اس گلشن باغ مرتضوی سے نصیب کی جدائی ہے، حاصل کلام
اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں اور فرمانبرداری سے دوستوں
کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا اب بارہ
سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفصیلات سے صاحبان عالی شان والاخاندان
مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی ایک صورت اطمینان کی ہے
اور مفارقت میں یاران قدیم اور دوستان صمیم کی اوقات یونہی گزرتی ہے
اس واسطے چند قصے زبان ریختہ ہندی میں موافق اردوئے معلیٰ کے نثر کئے
گئے، جیسے قصہ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصہ لیلیٰ
مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے
خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے اور چند اشعار پریشاں اور کئی مخمس و چند قطعہ جو
اس ہیچ مدان نے تصنیف کئے سو احاطۂ تحریر میں آئے اور اس مجموعۂ بے
سر رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سر و پا نے جمع کیا ہے، نام اس اوراقِ
پریشاں کا گلدستۂ حیدری رکھا ہے امیدوار لطف سے باریک بینوں کی یہ
ہے کہ اگر نکتہ سہو کا اس میں پاویں تو بموجب حدیث شریف الانسان مرکبٌ من
الخطاء والنسیان کو جائز الخطاء سمجھ کر اصلاح کریں اور نکتہ گیریوں کو کام نہ فرماویں
بحق محمدؐ و آلہ الامجاد۔ قطعہ

جو ہوں اہل معنی اے بادنسیم یہ میری طرف سے انہیں تو سنا
کرو سیر گلدستۂ حیدری اگر جی میں رکھتے ہو کچھ بھی ہوا

کہ فضل خدا نے کیا ہے اسے   گلِ نثر اور نظم سے لہلہا

مہر وماہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

حمد کرتا ہوں اس بادشاہِ قادر بیچوں کی جس نے اپنی قدرت کبریائی سے سلطان مہر و ماہ کو اور تختِ مملکت کے ستون کے ساتھ ندیمان سیاروں کے جلوہ گر کیا اور فیضان جمال بے مثال وحدانیت سے ہیژدہ ہزار عالم کو مخلوق کر کے اپنی عنایاتِ صمدیت سے خصوصاً خلقت انسان کو اشرف المخلوقات خطاب دیا اور خلقت انواع و انواع حسن و جمال کے دے کر سرفراز کیا، اور جا گیر اپنے عشق کی عطا کر کے عاشق و معشوق نام رکھا، کیا خدا ہے جل جلالہٗ وعم نوالہٗ ۔ اور نعت ہے اس رسول مقبول کی جس کو اس واحد ذوالجلال نے اپنے فضل و کرم سے افضل البشر و خاتم الانبیاء کیا اور اس کے واسطے زمین و آسمان کو پیدا کر کے لولاک لما خلقت الافلاک خطاب دیا، صلواۃ اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مدح ہے اس حیدر شہسوار لافتیٰ ساقی حوض کوثر کی کہ جو حامیٔ روز جزا ہے اور دامادِ مصطفےٰ ہے اور مدح ہے، ان گوہر دریائے رسالت کی کہ جو سرور سینۂ زہرائے اطہر ہیں اور شفیع روز محشر صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ اجمعین، پس اس سیّد حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ، ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبان عالی شان گفتگوئے اردوئے معلیٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں اور اہل سخن کو ازراہ قدردانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں۔ خصوصاً صاحب والامناقب عالی مقام صدر نشین محفل اہل کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر

دام اقبالہٗ کہ جو بحر سخن وری و سخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں اور
موجد قواعد کلام شیریں سخنی کے سرچشمۂ سخن وراں ہے

به دل دریا به کف چوں ابر نیساں   جہاں ہے فیض سے جس کے دُرافشاں
نہ ہوں اس کی شجاعت کے مقابل   اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف   وہیں ہو صفحۂ کاغذ زر افشاں
ہے اس کا نامِ نامی گلکرسٹ اب   جہاں ہے مہر جو اس کے سے تاباں
دُعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دنیا میں خوش یا ربّ وہ ہر آں

اس واسطے یہ دل مضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر (نذر) حضور پر نور اس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے، یقین ہے کہ منظورِ نظر ہووے اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نامربوطیٔ الفاظ دکھائی دیوے تو اس کی درستگی کے واسطے باغبانِ خامہ دو زباں کو چشم تعلیم سے اشارات کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصطلاح پاوے، بحق محمدؐ و آل محمدؐ۔ قطعہ ؎

منصفو! منصفی کی جا ہے یہ   میری محنت کی داد ٹک دیجیو
قصۂ مہر و ماہ کو میں نے   نثر کیوں کر کیا ہے دیکھو تو[1]

لیلیٰ مجنوں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلویؒ مرید حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے

---

[1] دیباچہ قصہ مہر و ماہ۔ برٹش میوزیم لندن ص ۱۴۴۔ ۱۴۶

تصنیف کی ہیں اور ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ مجنوں کا جو لکھا ہے
سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے
اور ہاتفی نے بھی اس قصہ دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم
کیا اور عبارت فصیح سے اس کی ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا
اور اس قصے کو خواجہ یٰسین شاہجہاں آبادی کہ شاعری میں یکتائے
عصر ہیں، بالفعل مسندِ حیات پر جلوہ گر ہیں بموجب فرمائش اطہر علی
خاں مرحوم کہ مسٹر چیمبرز صاحب نے حکیم موصوف سے درخواست
اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی، خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ
ہند میں حقیقت اس کی سابق عہد سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی
کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق
اٹھارہ سے ایک عیسوی کے کہ سنہ سینتالیسواں جلوس بادشاہ
موصوف سے ہے، جناب صاحب عالی شان پشت پناہ سخن
سنجان، بحر ہمت گوہر مروت گوہ حشمت، مخزن سخاوت، اعلیٰ
دودمان، جان گلکرسٹ صاحب بہادر زاد افضالہ نے اس سید
حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چیں خرمن علم
مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی عدالت نواب علی ابراہیم
خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ تو اس قصہ پر سوز نظم ہندی
کو بیچ زبان ریختہ اردوئے معلیٰ کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی
کے نثر کر اور احاطہ تحریر میں لا کیونکہ عبارت سلیس مفید ہے، ان
صاحبوں کے جو بالفعل اس گفتگو کے واقف نہیں، ان کی درستگی
زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس کے اور کوئی عبارت نظر نہیں

آتی، چنانچہ اس کمترین، ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے زبان
محاورہ اردوئے معلیٰ کے قصۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا اور ہر ایک
صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض
اثر سے دیکھے، اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم
ہے کہ وہ اپنی دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحۂ
غلط سے اٹھائے اور اجر اس کا اس کو دونوں جہاں میں خدا دے۔

کمیت خامہ کو میں نے اٹھا کر — کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصۂ لیلےٰ و مجنوں — سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں

حیدری کی ان غیر مطبوعہ تحریروں سے ان کی زندگی اور شخصیت کی ایک اچھی خاصی تصویر تیار ہو جاتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ تحریریں ان مآخذ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کو سامنے رکھے بغیر حیدری پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔

ان مآخذ کے ذریعہ سے جو معلومات ہم تک پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ سیّد حیدر بخش حیدری دلّی کے رہنے والے تھے، ان کے بزرگ نجف اشرف سے ترکِ وطن کر کے دلّی میں آئے اور اسی سرزمین پر اقامت اختیار کر لی، حیدر بخش حیدری دلی ہی میں پیدا ہوئے اور ان کی تاریخ ولادت کا کسی ذریعے نہیں ہوتا، وہ دلّی میں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے، حالات کی ناسازگار کیفیت نے ان کے والد سید ابوالحسن کو دلی چھوڑنے پر مجبور کیا اس وقت حیدری کی عمر بہت کم تھی، اس کم عمری میں اپنے والد سید ابوالحسن کے ساتھ دلّی سے باہر نکلے اور ان کے ساتھ بنارس میں اقامت اختیار کی، ان کے والد کا دلی سے باہر نکل کر بنارس پہنچنے کا سبب

لالہ سکھ دیو رائے کی ملازمت تھی، اس کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ یہ لالہ سکھ دیو رائے کون تھے، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کے والد سید ابوالحسن نے ان کی ملازمت اختیار کی ان کی ہمراہی میں بنارس پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، حیدری اس وقت بہت کمسن تھے لیکن اس کے باوجود انہیں دلّی چھوڑنے کا بہت غم ہوا اپنے والد کی طرح دلّی کی دلچسپیوں کو انہوں نے بھی بھلانے کی کوشش کی اور بنارس میں اپنے دل کو لگایا، وقت کے ساتھ ساتھ اس شہر سے انہیں جذباتی وابستگی پیدا ہو گئی، اس کا اظہار انہوں نے ایک قطعہ میں کیا ہے ؎

بنارس شہر ہے آباد و خوشتر چراغ دودمان ہفت کشور
شدہ سیارہ بر جا ماہ روئے تو گوئی خانہ باشد مہ بہ کوئے
جیدھر دیکھو ادھر ہے جبہ سائی یہاں کے بت ہیں سب کرتے خدائی
اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمیں است و ہمیں است
کہوں بازار کا کیا اس کے عالم قلم جو کچھ لکھے سو اس سے ہے کم
رکھا میں مختصر اب اس کو یاں سے بیاں ٹک گھاٹ کا سن لو زباں سے
لگا رسی سے برنّا مک ہر ایک داں نہ دیکھا کم کوئی از ماہ رو یاں
چنانچہ گھاٹ ہے اک من کرن کا بیاں اس کا کروں میں تم سے کیا کیا
نشان حسن داں ہر ایک نے گاڑا ہوا وہ گھاٹ اندر کا اکھاڑا
لگا کر جسم سیتی تا بینی مادھو پری بنتا ہے واں ہر ایک نہا دھو
نہ بیچ گنگا میں یہاں کوئی نہاوے تو وہ بیکنٹھ واں کس طرح پاوے
کوئی کھینچے ہے قشقہ نازنیں واں کوئی دیتا ہے ٹیکا مہ جبیں واں
کوئی گنگا میں جا غوطہ لگا دے کوئی سیڑھی ہی پر دھوتی سکھاوے

برہمن بچے واں ہر سو پھریں ہیں ہر ایک کو رام وہ اپنا کریں ہیں
مغرق تاش کی پہنے ہیں ساڑی اور اس پر ہے ٹکی دوہری کناری
کب ان کے پاؤں میں دو دو کڑے ہیں کہے تو حسن کے وہ پیکڑے ہیں
نہ رتبہ کس طرح وہ شہر پاوے کہ شیو تر سول پر جس کو لباوے
بلند اس کی عمارت اس قدر ہے کہ دھولا گیر جس کی یہ کمر ہے

کلاں وہ حیدریؔ ایسا مکاں ہے
کہ جس کوچۂ خورد اصفہاں ہے[1]

حیدری بنارس کی سرزمین پر سن شعور کو پہنچے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب نواب علی ابراہیم خاں خلیل صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم بنارس میں ججی کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، بنارس میں ان کے علم و فضل کا شہرہ تھا، چنانچہ حیدری کے والد سید ابوالحسن نواب علی ابراہیم خاں کے ساتھ منسلک ہو گئے اس وقت تک حیدری سن شعور کو پہنچ چکے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کا کام قاضی عبدالرشید خاں اور مولوی غلام حسین کو سونپا، ان کے علاوہ وہ سید جمعیت علی رضوی سے بھی انھوں نے استفادہ کیا، غرض ان کے ذہنی نشو و نما ان بزرگوں کے سامنے ہوئی۔

حیدری نے اپنے دیوان میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل کی مدح میں ایک قطعہ لکھ کر درج کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خلیل سے کس درجہ متاثر تھے، لکھتے ہیں ؎

کرے ہے جب سے عدالت علی ابراہیم ہوا ہے شہر بنارس مثال باغ نعیم

---

[1] حیدری : دیوان حیدری : نسخہ باڈلین آکسفورڈ برٹش میوزیم لندن)

کروں میں اس کی سخاوت کا کیا بیان رقم
دو شالے اس کو دیئے تھے نہ جسکے پاس گلیم
شگفتہ ہو نہ کوئی گل جوں غنچۂ تصویر
سحر کو فیض سے اس کے اگر چلے نہ نسیم
کرم ہے اس کا یوں روشن تمام عالم میں
کہ مہر و ماہ کے کاسے میں دے ہے یہ زرِ سیم
عدد کے سر پہ جو شمشیر وہ رکھے اک بار
اگر پہاڑ ہو اک دم میں وہ ہو جائے دو نیم
بروزِ جنگ تیری دیکھ صولت شمشیر
غنم ہو جاتے ترے آگے گر ہو شیر غنیم
کسی پہ گزرے کہیں زور کا تیرے جو خیال
تو مور کی طرح بل ڈالے گر ہو پیل جسیم
تو اپنے وقت کا نواب خان خانان ہے
یہ چاہتا ہوں خدا سے کہ میں تیرا ہوں فہیم

میں ہوں وہ شاعر خوش فکر حیدری تیرا
کہ جس کے سامنے لکنت کرے زبان کلیم[1]

اور قاضی عبدالرشید خاں کی مدح میں بھی چند اشعار کا قطعہ لکھا ہے جس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے، قطعے کے اشعار یہ ہیں ؎

ہم نے جو صاحب سخا دیکھے
در کے تیرے وہ سب گدا دیکھے
کون ہے جز ترے زمانے میں
جو کسی کا کوئی بھلا دیکھے
عدل اہل ستم کو باندھے ترا
گر کہیں جور کو کھلا دیکھے
ہوئے تن سے جدا عدو کا سر
تیغ ادھر جو تو اُٹھا دیکھے
تیرے بے حکم شمع محفل میں
ایک پروانے کو جلا دیکھے
شب سے تا صبح پھر دے سر اپنا
ہر گھڑی تن ستی جُدا دیکھے
ٹھہرے مسکین بے پر اس جا گہ
جس جگہ کچھ بھی آسرا دیکھے
مجھ کو دارُالشفا ہے در تیرا
میں بہت درد بے دوا دیکھے

---

[1] حیدری : دیوان : نسخہ برٹش میوزیم لندن : باڈلین آکسفورڈ

حیدری دل سے اس کا ہے مداح
یا حضور اس کو یا تفا دیجے
یعنی عبدالرشید خان صاحب
مخزنِ فیض و ہم سخا دیکھے[1]

سید حیدر بخش حیدری ۱۲۱۴ھ بنارس میں رہے، اس وقت تک انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا، بلکہ بنارس کے ادبی حلقوں میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی، چنانچہ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو کے جن لکھنے والوں کو وہاں جمع کیا ان میں سید حیدر بخش حیدری بھی تھے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ بنارس سے کب باہر نکلے، کب کلکتہ پہنچے اور کس کے توسط سے ان کی رسائی ڈاکٹر گلکرسٹ تک ہوئی، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ میں میر بہادر علی حسینی نے ان کی اس سلسلے میں دستگیری کی اور حیدری اس کے لئے ہمیشہ ان کے احسان مند رہے چنانچہ گلدستہ حیدری میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے اور یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلے ہیں:۔

اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے افسوس یہ ہے کہ دو جز حرف شین سے لے کر تا حرف ی خدا جانے کیا ہوئے، اس واسطے نوبت تحریر حرف یا تک نہ پہنچی، انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے — اور یہ جلد دو چار جز کی کلام واہیات سے تیاری ہوئی

---

[1] حیدری: دیوان: نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ

سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیری در ماندگان اور حاجت روائی بے کسان ہے، اللہ تعالےٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اسے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے، بحق محمدؐ و آلہ الامجاد[1]

بہرحال میر بہادر علی حسینی کے توسط سے وہ فورٹ ولیم کالج میں داخل ہوئے ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ان کا تعارف ہوا ۱۸۰۰ء میں انہوں نے قصہ مہر و ماہ لکھ کر گلکرسٹ کو پیش کیا، انہوں نے کہ ب کو پسند کیا اور حیدری ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے باقاعدہ ملازم ہو گئے[2] دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی[3]۔ تصنیف و تالیف کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں حیدر بخش حیدری ڈاکٹر گلکرسٹ سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ انہوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اس کا اعتراف کیا ہے، دیوان میں ایک قطعہ ہے، جس میں گلکرسٹ کی بہت تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:

گلکرسٹ صاحب وہ ہے عادل زماں — خوشہ چیں اس کا ہوا ب نوشیرواں
کیوں نہ وہ حاکم ہو ہفت اقلیم کا — چاکری کرتا جس کی آسماں
خامہ ہو جاوے وہیں زرّیں رقم — گر لکھوں اس کی سخاوت کا بیاں
زیر دست اس کے ہو انبار طلا — گر ہو اک ذرہ کسی پر مہرباں
کھل گئے اس کی نسیم خلق سے — غنچۂ اُمید دل ہائے جہاں

---

[1] حیدری: گلدستہ حیدری: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ ص ۲۲۳

[2] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۸

[3] ایضاً ص ۱۴۳

اک نگاہِ لُطف اس کی حیدری
تجھ کو مُستغنی کرے گی بے گماں[1]

حیدری کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز اس میں شبہ نہیں کہ فورٹ ولیم کالج سے ہوا، اور گلکرسٹ کی شخصیت نے انہیں اس کام کی طرف رغبت دلائی، چنانچہ انہوں نے اپنا بیشتر ادبی کام گلکرسٹ کے ایما پر کیا لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری کی طرف باقاعدہ متوجہ ہونے سے بہت پہلے شاعری شروع کر چکے تھے اس کا سبب ان کے عشق کا واقعہ تھا، جیساکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ عنفوان شباب ہی میں ایک مہ جبینِ عشوہ کار کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے اسی واقعہ کے زیرِ اثر انہوں نے شاعری شروع کی تھی اور ایک مختصر سا دیوان بھی جمع کیا تھا، دیوان کے آخر میں انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس عشق کے واقعے کو بیان کیا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اسی واقعے کے زیر اثر شاعری شروع کی۔ دونوں عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں :-

ایک جگہ اُردو میں اس واقعہ کو اس طرح لکھتے ہیں :-

یہ کئی سطریں اس فقیر کے عذر میں ہیں۔

موشگافاں شاہد معانی اور غواصان بحرِ سخن دانی پر روشن ہو کہ یہ ضعیف و نحیف، ہیچ مدان آمادۂ بے ہنری، حیدر بخش متخلص بہ حیدری ابتدائے جوانی سے ایک نازنین مہ جبین، دلآرام، نازک اندام، گلعذار، پری دیدار

---

[1] حیدری : دیوان حیدری : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

کے دام میں پھنسا۔ بیت :ــ

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے　　وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے

بیت :ــ

اِک ناز جس سے دہر میں فتنے ہیں صد ہزار　اِک چشم جس سے شہر میں کٹتے ہیں بے شمار

اسی حالت میں بلبل قفسی کی مانند نالہائے حزیں موزوں کرنے لگا، آخر چند روز کے عرصہ میں ایک مجموعۂ اشعار کا بنا، تب چند فقرے نثر کے بھی بہ طور تالیف و تصنیف کے اس سے الحاق کر کے صاحبان عالی طبیعت کے آگے بہ طریق ہدایہ و نذر کے رکھ دیا، امیدوار اس بات کا ہے کہ اس کو چشم لطیف سے ملاحظہ فرمائیں اور اس کے رطب و یابس پر نہ جائیں، کیونکہ نام کسی بشر کا بلندی و پستی سے خالی نہیں، پھر مجھ سے بشر کے سخن میں اگر عیب ہوں تو کیا تعجب ہے، میں نے تو شعر گوئی میں کمال نہیں پیدا کیا بلکہ عروض اور قافیے کو بھی بخوبی نہیں دیکھا، مع ہذا کار انسان نسیان ہے اور سہو اس کا عنوان ــــــ اب اہل انصاف اور صاحب الطاف کی خدمت میں التماس کرتا ہے کہ جہاں اس میں حسن دیکھیں اس کی داد دیں اور جس جگہ عیب نظر پڑے اسے دامن اصلاح سے چھپا دیں[1]"

اور فارسی میں اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بر ضمیر منیر مہر نظیر، ناقلان اسماء وطوطیان شکر شکن شیریں گفتار، محدثان حدیث وخوشہ چینان خرمن سخن وصرافان دار العیار معانی و دار الضرب نکتہ دانی ومحققان شوق انگیز مہر اندوز و مدققان ذوق آمیز محبت آموز ہادیان

---

[1] دیوان حیدری قلمی نسخہ باڈلین آکسفورڈ ص ۲۸۲

رہ گم گشتگان بادیہ نادانی ورہنمایان صراطِ مستقیم جاودانی پوشیدہ ومخفی نماند
کہ اضعف العباد ہیچ مدان، فقیر حقیر سید حید ربخش متخلص بہ حیدری از عنفوان
جوانی دردام تعشق وبلا نازنین صنمے، مہ جبینے، دلآرامے، نازک اندامے، گلعذارے
ماہ رخسارے، آہونگاہے، مژگاں سیاہے، پستہ لبے سیمیں غبغبے مشکین موئے،
کمند گیسوئے، غنچہ دہنے، سیب ذقنے، شیریں زبانے، سروقدے، خورشید خدے،
سراپا نازے، عشوہ پردازے، ہرانگیزے، دلآویزے۔ بیت ؎

نازے وہزار فتنہ درموہر چشمے وہزار کشتہ درشہر

اسیر گشتہ، دراں حالت دل ایں بے دل چوں، بلبل مقفوس نالہائے موزوں
مانند قمری محبوس وآوازہائے خریں آغاز کرد، آخر از خار خار فکر وخوں خواری
جگر مجموعہ از گلہائے تازہ بوستانے از سرو آزادہ یعنی اشعار چند آمادہ ساخت
بعدہ، فقرات چند نثر بہ طریق تالیف وتصنیف ملحق بہ آں نمودہ پیش نظر صاحبانِ
عالی طبیعت بطور نذر وہدیہ گذارند، امید آنست کہ ایں داماندۂ صحرائے نادانی
را بخارستان حرف گیری نکشند، واگر سہوئے وخطائے واقع شدہ باشد بہ ذیل
کرم بہ پوشند وہر جا کہ آہو گیرند بگزلک اصلاح بتراشند[1]

دیوان حیدری صرف غزلیات قطعات کا مجموعہ ہی نہیں ایک بڑی ہی
دلچسپ دستاویز ہے اس سے حیدری کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں پر
روشنی پڑتی ہے، جن کا آج تک کسی کو علم نہیں تھا، ایک تو یہی ان کے عشق کا
واقعہ ہے جس کا علم ان کے دیوان سے ہوتا ہے پھر دیوان میں غزلوں کے علاوہ
بعض قطعات بھی ایسے ہیں جن سے ان کے رومانی مزاج اور طبیعت کے

---

[1] دیوان حیدری: قلمی نسخہ باڈلین آکسفورڈ ص ۲۸۴

عشقیہ رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ دیوان حیدری کا کوئی بہت بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہے، ان کا ادبی کارنامہ تو نثر کی وہ کتابیں ہیں جن میں سے بیشتر انہوں نے فورٹ ولیم کے دوران قیام میں لکھیں ان کتابوں میں مہر و ماہ، لیلیٰ مجنوں، توتا کہانی، آرائش محفل، تاریخ نادری، گل مغفرت، گلزار دانش، تذکرہ گلشن ہند اور مختصر کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قصہ مہر و ماہ غالباً حیدری کی سب سے پہلی کتاب نثر ہے، یہ کتاب انہوں نے اوائل ۱۲۱۴ھ میں لکھی اور اس کو پیش کر کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں باریاب اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے[1] حیدری خود بھی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

پس اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبان عالی شان گفتگو اردوئے معلیٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں، اور اہل سخن کو از راہ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں ــــــ خصوصاً صاحب والا مناقب عالی مقام، صدر نشین محفل اہل کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کہ جو بحر سخن وری و سخن رانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں اور موجد قواعد کلام شیریں سخنی کے سرچشمہ سخن دراں۔

به دل دریا به کف چوں ابر نیساں　　جہاں ہے فیض سے جس کے دُرافشاں

نہ ہو اس کی شجاعت کے مقابل　　اگر ہوں رستم و زال و نریماں

---

[1] سید محمد۔ ارباب نثر اردو: صفحہ ۱۷ (مطبوعہ ۱۹۵۰ء) ص ۶۸

لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف   وہیں ہو صفحۂ کاغذ زرافشاں
ہے اس کا نام نامی گلدستہ اب   جہاں ہے مہر جود اس کے سے تاباں

دعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دنیا میں خوش یارب وہ ہر آں

اس واسطے یہ دلِ مضمحل اس قصۂ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے (نذر) حضور پر نور اس صاحب موصوف والاشان کے لایا ہے، یقین ہے کہ منظور نظر ہووے اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نامربوطیٔ الفاظ دکھلائی دیوے تو اس کی درستگی کے واسطے باغبان خامۂ دوزباں کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے۔[1]

غرض یہ کتاب لکھ کر انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی اس کا انداز و اسلوب بڑی حد تک مرصع و مسجع ہے، اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس پر فورٹ ولیم کالج کے ماحول کا اثر نہیں ہے، اسی لئے اس آسان اور سادہ نثر کا وہ انداز نہیں ہے جو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس کتاب کا انداز مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

"سنا ہے کہ کسی شہر میں آفتاب نام بادشاہ تھا کہ وہ نہایت صاحب حشم و عالی جاہ فوج و خزانہ کی طرف سے خوش و خنداں، اور آل و اولاد کے سبب سے چشم گیاں، ہمیشہ از دست روزگار ناہنجار رہا کرتا، اور حساب

---

[1] حیدری دیباچہ قصۂ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی برٹش میوزیم لندن) ص ۱۴۶

اس کی افواج کا ذہن رسا میں نہیں آسکتا اور شمار اس کے خزانہ کا خزانۂ دل میں نہیں سما سکتا، جہاں تک شاہ و گدا امیر و وزیر و امرا، نواب خان تھے سو وہ سب اس کے زیر حکم، تابع فرمان، جہاں تک کہ تھے سرکش اطراف کے وہ وہ رہتے تھے سو وہ سب اس کے زیر حکم، تابع فرمان، جہاں تک کہ تھے سرکش اطراف کے وہ رہتے تھے اس شہ کے قدموں میں لگے[1]

حیدری کی یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی، انگلستان میں اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے لیکن ناقص ہے، اگر ایک نسخہ مل گیا تو اس کو جلد شائع کر دیا جائے گا۔

سید حیدر بخش حیدری کی دوسری تالیف قصۂ لیلیٰ مجنوں ہے، یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی، غالباً فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد حیدری کی پہلی تالیف تھی، فارسی میں اس قصے کو مختلف لکھنے والوں نے نظم میں لکھا ہے حیدری نے سب سے پہلے اس کو اردو کی آسان اور سادہ نثر کے قالب میں ڈھالا، دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیاءؒ، کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے تصنیف کی ہیں اور ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ مجنوں کا جو لکھا ہے، سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے اور ہاتفی نے بھی اس قصے دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا اور عبارت فصیح سے اس کی ہر ایک بیتِ معشوقہ کو زیور معنی پہنایا اور اس قصے کو خواجہ یاسین شاہجہاں آبادی کہ شاعری میں کہ یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسندِ حیات پر جلوہ گر ہیں، بموجب فرمائش

---

[1] حیدری: دیباچہ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) ص ۱۴۶

اطہر علی خاں مرحوم کے جیمیز صاحب نے حکیم موصوف سے درخواست اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی، خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ ہندی میں حقیقت اس کی سابق عہد سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی، اب ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ سنہ تینتالیسواں جلوس بادشاہ موصوف سے ہے جناب صاحب عالیشان، پشت پناہ سخن سنجان، بحر ہمت، گوہر مروت، کوہ حشمت مخزن سخاوت، اعلیٰ دودمان، جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام افضالہٗ نے اس سیّد حیدر بخش حیدری دہلوی، خوشہ چیں خرمن علم کونین مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی عدالت نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ تو اس قصہ پر سوز نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اُردوئے معلیٰ کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطہ تحریر میں لا، کیونکہ عبارت سلیس مفید ہے، ان صاحبوں کو جو بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں ان کی درستگی زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی، چنانچہ اس کمترین ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اردوئے معلےٰ کے قصہ نظم کو ہندی میں نثر کیا اور ہر ایک صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض اثر سے دیکھے اور کچھ نامربوطیٔ الفاظ کی دکھلائی دے، تو لازم ہے کہ وہ اپنی دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحہ غلط سے اٹھالے اور اجر اس کا اس کو دونوں جہاں میں خدا دے:

کمیت خامہ کو میں نے اٹھا کر کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصہ لیلےٰ و مجنوں سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں[1]

---

[1] حیدری: دیباچہ قصہ لیلیٰ مجنوں (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) ص ۱۴۸

حیدری کی یہ کتاب بھی کبھی شائع نہیں ہوئی۔
توتا کہانی سید حیدر بخش حیدری کی تیسری کتاب جو کہانی اور اپنے اسلوب اور انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے، یہ کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں لکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

چل بھائی! بس، بتاریخ بست وششم شہر ذی قعدہ سنہ مذکور اور پنج شنبہ بوقت شام بخوبی تمام فضل خدا سے یہ قصہ شیریں کلام انجام کو پہنچا اور توتا کہانی اس کا نام رکھا۔

کہانی ہوئی ختم جب حیدری — تو ہاتف نے نام اس کا سن کر کہا
سر راہ کو کھینچ کر تو نے خوب — رکھا نام توتا کہانی بجا[لے]

اس کا ماخذ فارسی کی کتاب محمد قادری کا طوطی نامہ ہے فارسی میں اس کو ضیاء الدین بخشی نے بھی لکھا ہے، لیکن یہ کہانیاں سنسکرت کی کتاب شکا سپتتی سے ماخوذ ہیں، سنسکرت کی کتاب میں ۷۰ کہانیاں تھیں، بخشی نے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا، محمد قادری نے اپنے ترجمے کے لئے صرف ۳۵ کہانیوں کو انتخاب کیا، حیدری نے بھی صرف ۳۵ کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ محمد قادری کی لکھی ہوئی کہانیاں ان کے پیش نظر رہی ہیں، دیباچے میں خود بھی لکھتے ہیں:

یہ سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی، تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم، شاگرد مولوی غلام حسین غازی پوری، دست گرفتہ صاحب عالی جناب

لے توتا کہانی: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص ۹۹ - ۱۰۰

سخن داں، آبروبخش سخن دراں، معدن مروت و چشم فتوت، دریائے جود و کرم، منبع علم و حلم، خداوند خدایگان والاشان جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کا ہے، اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق حوصلے کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے، لیکن بہ موجب فرمائش صاحب موصوف کے بارہ سے پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں سرگروہ جہاں حامئ غریباں و بےکساں زبدۂ نوآئنان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے محمد قادری کے طوطی نامے کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے زبان ہندی میں، موافق محاورے اردو معلیٰ کے نثر میں عبارت سلیس و خوب الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اس کا توتا کہانی رکھا، تاکہ صاحبان نوآموز کی فہم میں جلد آوے اور یہ ہیچ مداں پر ہر ایک اہل سخن سے اُمید رکھتا ہے کہ جو کوئی چشم غور سے اس ترجمے کو ملاحظہ کرے اور غلطی معنی یا نامربوطیٔ الفاظ اس کی، اس کے نظر پڑے تو وہ شمشیر قلم سے مانند سر دشمن کے اس صفحہ ہستی سے اسے اُڑا دے۔

جو بہر اصلاح اس پہ رکھے قلم — الٰہی نہ دینا کبھی اس کو غم
الٰہی بحق امام انام — یہ جلدی ہو مجھ سے کہانی تمام

آمدم برسر مطلب، سنا چاہیئے کہ کیا کیا خون جگر کھایا ہے اور کیا کیا مضمون باندھا ہے۔[1]

---

[1] حیدری: توتا کہانی، قلمی نسخہ میوزیم لندن۔ ص۔ ۳۰

یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی آسان اور سادہ نثر کی روایت کا بہت اچھا نمونہ ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں آنے کے بعد وہاں کے مخصوص ماحول کے زیر اثر اپنے اندر خاصی تبدیلی پیدا کی تھی۔

توتا کہانی کا سب سے اہم قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ہے، پہلی بار یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں چھپی ہوئی ہے، لیکن انگریزی کے سرورق پر ۱۸۰۴ء درج ہے، ہوسکتا ہے ۱۸۰۳ء میں اس کی طباعت کا کام شروع ہوا ہو اور ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوا ہو۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، فورٹ ولیم کالج کے ایڈیشن کے علاوہ اس کا ایک ایڈیشن ۱۸۲۵ء میں ڈاکٹر ہانکن فوربس نے لندن سے شائع کیا، لندن سے ایک اور ایڈیشن ۱۸۳۵ء میں چھپا، ۱۸۷۳ء میں اس کا ایک ایڈیشن مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا، اس کے بعد نول کشور نے ۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۲ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع کئے، اس کے علاوہ دہلی، کانپور اور لاہور سے بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے[1]، اس کے تقریباً تمام ایڈیشن برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ اس کا تازہ ترین ایڈیشن لاہور کی مجلس ترقی ادب نے شائع کیا ہے۔ بنگلہ، ہندی، انگریزی اور روسی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے اور ان کو اہتمام سے شائع کیا گیا بنگلہ میں طوطا اتہاس کے نام سے چنڈی چرن سبرام پوری نے اس کا ترجمہ

---

[1] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور ص ۴۰

کیا اور ۱۸۰۲ء میں شائع کیا۔ انگریزی میں جارج اسمال نے اس کا ترجمہ کیا اور لندن سے ۱۸۷۵ء میں شائع کیا۔ ہندی میں شُک بہتری کے نام پر نول کشور نے اس کا ترجمہ ۱۸۸۶ء میں شائع کیا۔[1]

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو کس قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔

حیدری کی ایک اور اہم کتاب آرائش محفل ہے۔ یہ کتاب بھی حیدری نے فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں لکھی۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ ہے۔ یہ بھی ایک فارسی کی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انہوں نے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں تاکہ کہانی طولانی ہو جاتے۔ اور پڑھنے والے اس سے محظوظ ہوں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"الٰہی دے مجھے روشن بیانی — کہ تا دل پر کھُلے رازِ نہانی
زباں کو مخزنِ تقریر کر دے — دہن کو گوہرِ معنی سے بھر دے
کمیتِ خامہ کو میرے لگا پر — یم معنی میں مجھ کو آشنا کر
پلا دے مجھ کو جامِ ارغوانی — کہ جس سے طے ہو حاتم کی کہانی

کہیں سُن کر اسے اربابِ اُردو
کہ ہے یہ گوہرِ نایاب اُردو

یہ قِصّہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سے حیدر بخش متخلص بہ حیدری، دہلی کے رہنے والے نے، امیروالاتدبیر، پشت پناہ ہر پیروجواں، دست گیر درماندگاں و بے کساں،

---

[1] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور۔ ص ۴۰

نوشیرواں وقت، ہمایوں بخت، زبدۂ نوآشنان عظیم الشان، مشیرِ خاص
شاہ کیوان بارگاہ انگلستان، مارکوئیس ولزلی، گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ
کی حکومت میں اور خداوند خدایگان، والاشان، عالی خاندان جان گلکرسٹ
صاحب دام اقبالہٗ کے حکم سے سنہ بارہ سے سولہ ہجری اور اٹھارہ سوایک
عیسوی کے موافق اور سنہ جلوس تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق
زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر
میں کیا، اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں اپنی طبیعت سے
جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے،
اور سننے والوں کو خوش آئے"۔[1]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آرائش محفل ۱۸۰۱ء میں تالیف
ہوئی لیکن خدا جانے کیوں سید محمد نے ارباب نثر اردو میں اور مولانا حامد حسن
قادری نے اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء لکھ دیا ہے۔

حیدری کی دوسری مقبول اور مشہور کتاب آرائش محفل ہے۔ عبدالغفور
نساخ نے سخن شعرا میں اس کا نام "ہفت سیر حاتم بھی لکھا ہے۔ اس میں حاتم
طائی سے متعلق قصص کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی
سات سیریں بیان ہوئی ہیں۔ نساخ کا بتایا ہوا دوسرا نام بھی موافق موضوع
ہے۔ یہ قصہ ابتداء میں فارسی نثر میں تھا۔ اس کو حیدری نے اوائل ۱۲۱۶ھ
۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے اردو کا جامہ پہنایا ہے"۔[2]

---

[1] حیدری: آرائش محفل (مطبوعہ مطبع شعلۂ طور کانپور) ص ۲

[2] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور ۵۰) ص ۷۶

اور مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں :

آرائش محفل حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے۔ اس لئے عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ سخن شعراء میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۶ھ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش کے مطابق فارسی کی داستان کو اردو میں لکھا۔[1]

اس کتاب پر حیدری کو چار سو روپے کا انعام ملا تھا۔[2] گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

حیدری کی ایک اور اہم کتاب گلزار دانش ہے۔ یہ کتاب عنایت اللہ کی فارسی کتاب بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ سید محمدؐ لکھتے ہیں :

ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اور نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ حیدری نے یہ ترجمہ کس سنہ میں تمام کیا۔ عنایت اللہ کی بہار دانش کئی سو صفحات کا ایک نیم تاریخی قصہ ہے۔ اور اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقے اور جہاندار شاہ کی مہموں اور مبارز طلبیوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۱ھ ہے۔ اور مولف نے دیباچے میں اس کا اظہار کیا ہے کہ قصہ اس کی اپنی ایجاد یا اختراع پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس نے کسی نوجوان برہمن کی زبانی یہ حسن و عشق کی کہانی سنی تھی جس کو اس نے فارسی میں تالیف کر دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل فارسی تالیف کا ایک قلمی نسخہ ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا

---

[1] حامد حسن قادری : داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص ۹۹

[2] محمد عتیق صدیقی ، گلکرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ) ص ۱۷۲

ہے۔ اور یہ بھی مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے حاصل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ حیدری کا ترجمہ نہیں ملا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ طبع نہیں ہوا حیدری کے بعض دوسرے کارناموں کی طرح کو کچھ زیادہ شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں[1]

اور مولانا حامد حسن قادری اس کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

گلزار دانش، شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہار دانش کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۶۵۱ء میں ہوئی۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں۔ سچا واقعہ ہے۔ بہرحال حیدری کی گلزار دانش بھی اب گم ہے[2]"

انگلستان کے دوران قیام میں مجھے حیدری کی گلزار دانش کا قلمی نسخہ ملا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ۵۳۷ صفحات پر مُشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ۲۵۲ صفحات ہیں۔ دوسری جلد میں ۲۸۵ صفحات حیدری اس کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں۔

بعد اس کلام مُتبرک کے صاحب دانش بینش پر ظاہر ہو کہ کتاب بہار دانش کو شیخ عنایت اللہ طوطیٔ سخن نے ایک برہمن بچہ حسین و مہ جبین کے کہنے سے تصنیف کیا تھا اور محمد صالح جو اس والاجاہ عرصے سے نسبت ہم گوہری و شاگردی کی رکھتا تھا اس نے بھی ایک دیباچہ اپنی موزونی طبع کے ساتھ

---

[1] سید محمد ارباب نثر اُردو (لاہور) ص ۸۴-۸۵

[2] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص ۹۶

عبارت رنگین وخوب وبندش الفاظ دلچسپ و مرغوب کے تصنیف کر کے
اس کتاب میں داخل کیا تھا۔ اب اس ذرۂ بے مقدار خاکپائے آلِ احمد مختار
صلوٰت اللہ علیہ وآلہ واجمعین سید حیدر بخش آمادۂ بے ہُنری متخلص حیدری
ساکن دلی خلف سید ابوالحسن نجفی نے عہد میں ظل سبحانی ابن عالمگیر ثانی شاہ عالم
بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ کے دورِ حکومت میں افتخار بصیرت جہاں واستنظہار
سخنورانِ دوراں، معدن عدل وانصاف، اشرف الاشراف، زبدۂ نوآیئنان
عظیم الشان مشیر خاص شاعر کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی گورنر
جنرل بہادر دام افضالہٗ کی سنہ بارہ سو اٹھارہ ہجری مطابق اٹھارہ سو چار
عیسوی کے فرمانے سے صاحب الشان ارسطوئے زماں وفلاطونِ حشم
مخزنِ لطف وکرم جناب ولیم ہنٹر دام اقبالہٗ کے موافق اپنی طبع کے زبانِ ریختہ
میں ترجمہ کیا اور نام اس کا گلزار دانش رکھ کر —— اہل دانش وبینش کی نذر
گزرانا دقیقہ سنجانِ قضا وقدر، عقدکشایانِ ارباب فضل وہُنر پر مخفی وپوشیدہ
نہ رہے۔ اگرچہ زعم میں اس ذرۂ بے مقدار فرومایہ کے یہ بات سمائی ہے کہ
عبارت کی بندش ومعنی کے حاصل ہونے میں نقص نہیں تو بھی انسان مرکب
من الخطا ونسیان جان کر عرض کرتا ہے کہ اگر کہیں اس میں غلطی معنی ناتمام
مربوطیٔ الفاظ رہ گئی —— اور سیر کرنے کے وقت نظر فیض اثر سے گزرے
تو قلم عطار در قم سے اصلاح کریں۔ دامنِ کرم سے چھپا دیں۔ یقین ہے جو
کوئی چشم انصاف سے ملاحظہ کرے سقم کم پاوے گا اور جو دیدۂ خوردہ بیں سے
نظر کرے گا خدا جانے کیا کیا دیکھے گا۔ قطعہ

الٰہی تا ابد اس داستاں کو　　چھپانا دشمنوں کی چشم بد سے

اس کو سدا دے اہلِ دانش　　رکھیں محفوظ جوں نت زد و گدستے[1]"

یہ ضخیم کتاب ترتیب و تدوین کی منزلوں سے گزر رہی ہے اور انشاءاللہ جلد شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کی جائے گی۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد جب حیدری کو اطمینان نصیب ہوا انہوں نے اپنی بعض بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کیا اور اس کا نام گلدستۂ حیدری رکھا اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں کی اور فرمانبرداری سے دوستوں سے اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفضلات سے صاحبانِ عالیشان والاخاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی ایک صورت اطمینان کی ہے۔ اور مفارقت میں یارانِ قدیم دوستان صمیم کی اوقات یوں ہی گزرتی ہے۔ اس واسطے چند قصّے زبان ریختہ ہندی میں موافق اُردوئے معلےٰ کے نثر کیے گئے۔ جب قصہ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصہ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے اور چند اشعار پریشان اور کئی مخمس و چند قطعہ جو اس ہیچ مدان نے تصنیف کیے۔ سو احاطۂ تحریر میں آئے اور اس مجموعہ بے رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سروپا نے جمع کیا

---

[1] حیدری کا گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ص ۹

ہے نام اس اوراق پریشاں کا گلدستۂ حیدری رکھا ہے"[1]

اس قلمی نسخے میں حیدری کی کئی اہم تصانیف شامل ہیں۔ یہ سب سے پہلے تو اس میں کچھ قصے ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان دونوں اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ میں نے اِن قصوں کو مُرتّب کرکے "مختصر کہانیاں" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ کہانیاں نہ صرف اردو کی ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ مختصر افسانے کی فنّی روایت میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ان میں مختصر افسانے کے فن کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے موضوعات زندگی کے عام معاملات سے تعلق رکھتے ہیں یہ سب کسی نہ کسی بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں سے اکثر میں وحدت تاثر کا پہلو بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ تہہ داری اور رمز و ایما کی خصوصیت بھی ان میں سے اکثر میں موجود ہے۔ ان کا مواد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان میں زندگی کے جذباتی اور ذہنی اور تہذیبی مسائل فن کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے"[2]۔

گلدستۂ حیدری میں حیدری کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا وہ تذکرہ بھی شامل ہے جو اس وقت شائع کیا جا رہا ہے۔

گلدستۂ حیدری میں حیدری کا دیوان بھی شامل ہے۔ اس دیوان کو میں نے مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

---

[1] حیدری کا گلدستۂ حیدری۔ قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ص ۹

[2] ڈاکٹر عبادت بریلوی: مقدمہ مختصر کہانیاں۔ کراچی ۱۹۶۷ء

حیدری کی یہ کتاب گلدستۂ حیدری اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج نے منظور کر لی تھی اس کے تین سو صفحات تھے اور اس پر انہیں دو سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔[۱] لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔

ہفت پیکر بھی حیدری کی ایک اہم تالیف ہے۔ یہ ایک منظوم مثنوی ہے جو ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ "مبانِ تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" اس کا ایک نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں تھا۔ لیکن یہ کبھی شائع نہیں ہوئی[۲]۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ مجھے بھی دستیاب نہیں ہوا۔

حیدری نے تاریخ نادری کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب محمد مہدی ابن محمد نصیر استر آبادی نے "تاریخ جہاں کشائے نادری" کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ یہ نادر شاہ کے ہم عصر تھے۔ اس کتاب میں نادر شاہ کے مفصل حالات ہیں۔ حیدری نے اسی کتاب کا ترجمہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں کیا۔ یہ کتاب نایاب ہے[۳]۔ مجھے بھی انگلستان کے دوران قیام میں باوجود کوشش کے اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ حیدری نے جامع القوانین کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے دو سو صفحات تھے اور اس پر انہیں سو روپے کا انعام ملا تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کا عہد، میں چند ایسی کتابوں کی فہرست دی ہے جو فورٹ ولیم کالج میں طباعت کے لئے

---

[۱] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۷۰

[۲] سید محمد: ارباب نثر اردو مطبوعہ لاہور۔ ص ۷۹

[۳] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص ۹۵

تیار کی جا رہی تھیں۔ ان میں اس کتاب کا نام بھی ہے[۱]۔ سید محمد اور حامد حسن قادری کو اس کتاب کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ مجھے انگلستان کے دوران قیام میں باوجود کوشش اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

حیدری کی آخری تالیف گُلِ مغفرت ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۲۲۷ھ/۱۸۹۲ء میں لکھی۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء سے ماخوذ ہے۔ پہلے حیدری نے اس کتاب کو گلشنِ شہیداں، کے نام سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ پھر شہدائے کربلا کے حالات اس میں سے نکال کر ایک کتاب مرتب کی اور اس کا نام گلِ مغفرت رکھا۔ اور یہ سب کچھ ایک دوست کے کہنے پر کیا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

بعد اس کلام متبرک کے صاحبان درد وغم و مبتلایان رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری نے کتاب گلشنِ شہیداں، سے جس کو پہلے کتاب روضۃ الشہداء سے زبانِ ریختہ میں ترجمہ کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل و گلزارِ معانی، شمع بزم نکتہ دانی، گوہرِ بحرِ سیادت وامامت، سروِ جویبارِ گلشنِ شرافت و شجاعت مولوی سید حسین علی صاحب جون پوری زاد الطافہٗ کے ارشاد کرنے سے، جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مدان کو ایک رسوخ ادبی و نیاز باطنی ہے، اس نسخہ کو انتخاب کیا، اور نام اس کا گلِ مغفرت رکھا۔ اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر

---

[۱] محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۷۵

اشرف سے گزرے۔ مقبول خاطر ہووے[1]"

گل مغفرت ۱۸۱۲ء/۱۲۲۶ھ میں کلکتہ کے ہندوستانی چھاپے خانے میں چھپی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

"نسخہ گل مغفرت لکھا ہوا، سید حیدر بخش حیدری کا عہدِ حکومت میں زبدہ نوآیئنان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہِ انگلستان نواب مستطاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ وافضالہٗ کے ہندوستانی چھاپے خانے خاص وعام کے فائدے کی خاطر چھپوایا گیا[2]"

اب اس کو مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی شائع کر دیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سید حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے سب سے اہم مصنف تھے۔ انہوں نے اچھی خاصی تعداد میں نثر کی کتابیں لکھیں اور آسان و سادہ نثر کا ایک اسلوب بھی پیدا کیا، جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے صرف ترجمے ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا، طبع زاد ادبی تخلیقات کو پیش کرنے میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کی پرواز صرف روایتی انداز کی داستانوں ہی تک محدود نہیں رہی، انہوں نے بعض نئی اصناف ادب کا تجربہ بھی کیا۔ اُنہوں نے صرف آسان اور سادہ نثر کی طرف توجہ ہی نہیں کی، ایک بڑے دلکش اور دلآویز اسلوب کی طرح ڈالی ــــ اور اس اعتبار سے وہ اُردو نثر کے صاحبِ طرز انشا پرداز اور ایک منفرد تخلیقی

---

[1] حیدری: گل مغفرت (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۱۱ء) ص ۷۔۸

[2] حیدری: گل مغفرت: (مطبوعہ۔ ۱۸۱۲ء) ص ۱۔

فن کار نظر آتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کا میدان نثر ہے، اور اسی میدان میں انہوں نے اپنے جوہر دکھلائے ہیں لیکن ایک شاعر اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی وہ کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں۔

عبادت

۲۰

بینی نارائن جہاں

چار گلشن

بینی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے مُصنّفوں میں کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زیادہ مشہور نہ ہوتے۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ ان کی دلچسپ داستان چار گلشن کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اگر یہ کتاب، بعض دوسری کتابوں کی طرح، اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہو جاتی تو، اس میں شبہ نہیں، کہ وہ بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح اس وقت کے نامور مُصنِّف تصور کئے جاتے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس لئے ان کو کچھ زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک بلند مرتبہ لکھنے والے تھے اور ان کی داستان "چار گلشن" ایک اعلیٰ پائے کی ادبی تالیف تھی۔

یہ کتاب بینی نارائن جہاں نے ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۵ھ میں منشی امام بخش کی فرمائش پر اردو زبان میں لکھی اور اس کا مسودہ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی (اُردو) زبان کے پروفیسر کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا۔

دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اب یہ ذرۂ بے مقدار، عاصی، گنہگار، بندہ بینی نارائن ابن رائے رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ مہاراجہ لچھمی نارائن مرحوم قوم کھتری مہتہ، ساکن دار السلطنت لاہور، جو بیچ سال ۱۲۱۵ھ کے عہد میں نواب معلی القاب، مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ رائے کھیم نارائن صاحب دام اقبالہ کے، کہ یہ عہدۂ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی خاں بہادر دام اقبالہ کے، بیچ شہر لطافت بہر کلکتہ کے آئے تھے، وارد ہوا۔ اس کو دس برس کا عرصہ ہوا ہو گا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے۔ اور اب کہ سنہ ایک ہزار اور دو سو پچیس ہجری ہیں عہد دولت میں نواب مستطاب، گردوں رکاب، مہر سپہر دولت بختیاری ماہ تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز مشیر خاص الخاص، بادشاہ کیواں بارگاہ انگلستان، زبدۂ نوئینان

عظیم الشان گورنر جنرل، اشرف الامراء لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک دن اس کہانی کو، کہ بہت دنوں سے اس گناہ گار کو یاد تھی، بر سبیل مذکور کے، روبرو منشی صاحب مہربان، معدن لطف واحسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا۔

"منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بہ ضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا کہ اس قصۂ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لایئے اور زبان ہندی میں اوپر صفحہ کاغذ کے لکھئے۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقب یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہٗ کے گذاریئے کہ اگر ان کو جان سخن کہیئے تو بجا ہے۔ بلکہ جان سخن کہنا سزا ہے۔ اس کے سننے سے وہ جناب محظوظ ہو دیں۔ اور بہ سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے۔

سو اس عاصی نے بہ موجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو کہ عقل ناقص میں آیا قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا[1]"

کپتان ٹیلر کو یہ داستان پسند آئی اور انہوں نے اس کو انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ چنانچہ اس کا مسودہ کالج کے کتب خانے میں داخل کیا گیا اور بینی نارائن جہاں کو اس کا صلہ انعام کی صورت میں ملا[2] لیکن یہ کتاب اس وقت کالج کی طرف سے شائع نہ ہو سکی۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا

---

[1] بینی نارائن جہاں۔ دیباچہ چار گلشن قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ صفحہ ۱-۲

[2] ROEBUCK: ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM P. 339

کہ اس وقت کالج کے سامنے کتابوں کی اشاعت کے کوئی خاص منصوبے نہیں تھے۔ چنانچہ اس کا قلمی نسخہ کالج کے کتب خانے میں محفوظ رہا۔ اس کا ایک نسخہ کسی طرح ایک صاحب مسٹر ایچ ایچ ولسن (H. H. WILSON) کے ہاتھ بھی لگا اور ان کے ساتھ لندن پہنچا۔ برٹش میوزیم لندن نے اس کو مسٹر ولسن سے ۱۲ جنوری ۱۸۶۱ کو خریدا۔ چنانچہ اس نسخے پر انگریزی کی یہ عبارت ملتی ہے۔

PURCHASED OF MR. WILSON, 12 JANY. 1861

یہ نسخہ بڑے سائز کے ۹۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اور خط نستعلیق میں جلی لکھا ہوا ہے۔ صفحے کی لمبائی ۱۰ $\frac{۳}{۸}$ انچ اور چوڑائی سات انچ ہے۔ ہر صفحے میں گیارہ سطریں ہیں اور ہر سطر کی لمبائی پانچ انچ ہے۔ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے کی فہرست مخطوطات میں اس کا نمبر ADDITIONAL 24046 ہے۔[۱]

خیال یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اس دلچسپ داستان کا صرف یہی ایک قلمی نسخہ ہے۔ کریم الدین نے یہ معلومات ضرور فراہم کی ہے کہ اس کا قلمی نسخہ فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا[۲] لیکن اب یہ نسخہ نایاب ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کلکتہ میں رہ گیا ہو لیکن اب

۱؎ بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن

۲؎ کریم الدین : طبقات شعرائے ہند : ص ۳۱۱

یہ نسخہ ظاہر ہے کہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔

یہ داستان اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اور بہت کم لوگوں کو اس کے قلمی نسخے کا دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اس لئے اب اس کو مع ایک مفصل مقدمے کے شائع کیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج
۲۵۔ اپریل ۱۹۶۷ء

عبادت بریلوی

بینی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے ایک اہم لکھنے والے تھے۔ لیکن ان کی اہمیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ادبی مورخوں نے اپنی تاریخوں میں ان کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایک اعلےٰ درجے کے مصنف کا جس طرح جائزہ لینا چاہیئے، اس طرح ان کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ان کی ادبی تصانیف کو نہیں دیکھا ہے۔ اور ان تصانیف کو نہ دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ان کو اشاعت سے ہم کنار ہونا نصیب نہیں ہوا ہے۔ ان کے قلمی نسخے بھی سات سمندر پار انگلستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اور ان تک رسائی کوئی آسان بات نہیں ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بینی نارائن فورٹ ولیم کالج میں ملازم رہے۔ وہاں انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا لیکن ان کی تصانیف کالج کی طرف سے شائع نہیں کی گئیں۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات ایسی کچھ عجیب نظر نہیں آتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ بینی نارائن جہاں کو تاخیر سے فورٹ ولیم کالج کے ساتھ منسلک ہونے

کا موقع ملا۔جس وقت وہ کالج کے باقاعدہ ملازم ہوئے ہیں اس
وقت اس کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ پہلے دور کی سی بات اب
باقی نہیں رہی تھی۔ڈاکٹر گل کرسٹ ،عرصہ ہوا، ملازمت سے سبکدوش
ہو کر انگلستان جا چکے تھے ۔اور انہوں نے کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ
بنایا تھا، اس سے ارباب اختیار کو اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔
کالج میں لکھنے والے تو اب بھی موجود تھے۔ ان کے لکھنے کا سلسلہ بھی
جاری تھا۔لیکن ان کی کتابوں کی اشاعت بند ہو گئی تھی۔بینی نارائن
جہاں کو بھی ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔ اور ان کی کتابیں بھی شائع نہ
ہو سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ادبی کارنامے لوگوں کی نظروں سے
اوجھل رہے اور انہیں خاطر خواہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

بینی نارائن جہاں بنیادی طور پر ایک نثر نگار تھے۔ انہوں نے
ماحول کے اثر سے شاعری ضرور کی لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ ان کی شاعری نے اس زمانے میں کوئی خاص مقام پیدا نہیں کیا
تھا۔انہوں نے اپنے تذکرے دیوان جہان کے شروع میں اپنے
حالات نظم میں لکھے ہیں —— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر تھے۔
لیکن ان کا کلام کہیں اور نہیں ملتا۔ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے
اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سید حید بخش حیدری ان
کے محسن تھے لیکن ان کے تذکرے میں بینی نارائن جہاں کا ذکر نہیں ہے۔
مرزا علی لطف نے بھی اپنے تذکرے گلشن ہند میں ان کا ذکر نہیں کیا
ہے۔ نساخ کا تذکرہ سخن شعرا بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔ صرف
کریم الدین ایک ایسے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے تذکرے طبقات

شعرائے ہند میں بینی نارائن جہان کا ذکر کیا ہے، اور کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں ان کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ان کے حالات کی تفصیل ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کتاب میں پیش نہیں کی ہے۔ سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں، سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں اور حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں ان کے حالات سے متعلق معمولی سی معلومات فراہم کی ہے۔

سکسینہ نے صرف اتنا لکھا ہے :-

"بینی نارائن متخلص بہ جہان "دیوان جہان" کے مصنف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندوستانی شعراء کا بھی شامل ہے[1] جو کپتان روبک صاحب سیکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش پر ۱۸۱۲ء میں لکھا گیا۔ اور انہیں کے نام معنون بھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۱۱ء میں منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے اس کو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اس کی اصل کتب خانہ

---

[1] سکسینہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دیوان جہان کو انہوں نے بینی نارائن کا دیوان سمجھ لیا ہے اور یہ قیاس کیا ہے کہ اس دیوان میں شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے، حالانکہ دیوان جہان تذکرے کا نام ہے، "تاریخ ادب اُردو (حصہ نثر) ص ۱۴

کالج میں داخل کرادی۔ گارساں دی تاسی کی تحقیق ہے کہ انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نارائن مسلمان ہو گئے تھے، اور مولانا سید احمد صاحب سے بیعت بھی کر لی تھی۔" [۱]

سیّد محمد نے "ارباب نثر اردو" میں ان کے حالات کی صرف اتنی تفصیل بہم پہنچائی ہے:۔

"بینی نارائن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے۔ ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے کھیم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے۔ ان کا تخلص رند تھا۔ بینی نارائن نے اپنی کتابوں کے دیباچوں وغیرہ میں اپنا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے۔ ان کی پیدائش اور تعلیم لاہور ہی میں ہوئی۔ گردش زمانہ سے وہ بہت تباہ حال اور تنگ دست ہو گئے اور چند ہی روز میں آسمانی سلطانی آفتوں نے امارت و تمول سے محروم کر کے تلاش معاش کے لئے آوارہ وطن کر دیا۔ پے در پے پریشانیاں اُٹھا کر بالآخر وطن کو خدا حافظ کہا اور آب و دانہ کی تلاش میں کئی سال ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ جا پہنچے۔ ان کے کلکتہ آنے کا باعث فورٹ ولیم کالج کے قیام اور وہاں اہل قلم کی قدردانی و پرورش کی خبریں تھیں۔

---

[۱] رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو (نولکشور تیسرا اڈیشن) ص ۱۴۷

جس وقت یہ کلکتہ پہنچے فورٹ ولیم کالج کا دور اول گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو اس کالج کے روح رواں اور مؤلفوں کے بہت بڑے سرپرست تھے اس کی صدارت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کو واپس ہو چکے تھے۔ کمپنی کے ارباب حل وعقد نے کالج کے دائرہ عمل کو محدود کرنا شروع کر دیا تھا اور وہاں نئے اہل قلم کی سرپرستی واعانت کا کوئی سامان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن کلکتہ پہنچتے ہی کوئی عمدہ خدمت حاصل نہ کر سکے اور ان کو نو وارد سمجھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ غرض یہاں بھی بارہ برس کا زمانہ دراز عسرت وپریشانی میں بسر ہوا۔ اس عرصہ میں انہوں نے کالج کے مشہور ارباب قلم اور مولفین سے راہ ورسم پیدا کر لی اور خصوصاً سید حیدر بخش حیدری سے ان کا ربط ضبط بڑھ گیا۔ ان ہی کی سفارش سے بینی نارائن کو کپتان ٹامس روبک کے ہاں باریابی کا موقع ملا۔ کپتان مذکور نے ان کو کالج کے ارباب قلم میں ملازم رکھ لیا اور تصنیف وتالیف کا کام لینے لگے۔

کالج کی سلک ملازمت میں داخل ہو کر بینی نارائن نے دو کتابیں تالیف کی ہیں۔ (۱) "چار گلشن" اور (۲) "دیوان جہاں" گارساں دی تاسی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کی فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا بھی ۱۲۴۵ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے۔

گارساں دی تاسی ہی کا بیان ہے کہ بینی نارائن نے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور مشہور مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس بیان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ بینی نارائن کا ترجمہ تنبیہ الغافلین موجود ہے جس سے یہ بیان بالکل مصدقہ ہو

جاتاہے۔ ان کی تاریخ وفات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔ البتہ گارساں دی تاسی کے مذکورۂ بالا بیان کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ۱۲۴۵ھ کے بعد وفات پائی ہوگی"۔ [1]

اور مولانا حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے۔

"بینی نرائن جہان لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن بڑے رئیس تھے۔ ان کے بھائی رائے کھیم نرائن عالم وشاعر تھے۔ رند تخلص کرتے تھے۔ بینی نارائن روزگار سے تباہ ہو کر کلکتہ پہنچے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہو کر ولایت چلے گئے تھے۔ بینی نارائن ایک عرصے تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے۔ پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلے سے کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں (۱) چار گلشن (۲) دیوان جہان (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین۔ یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ان کے مسودے محفوظ ہیں۔ [2]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لکھنے والوں کی معلومات بینی نارائن جہان کے بارے میں محدود تھی۔ اور ان سب نے ان کے بارے میں کم و بیش ایک ہی قسم کا مواد فراہم کیا ہے بات یہ ہے کہ بہت سے ماخذ تک ان کی رسائی نہ ہوسکی۔ اسی لئے ان میں سے

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۴۹۔۲۵۱

[2] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اُردو (آگرہ ۱۹۴۱) ص ۱۳۴

کوئی ایک بھی اس سلسلے میں تحقیق کے ساتھ کوئی نئی بات نہ کہہ سکا۔
بینی نارائن جہان کے حالات پر جن مآخذ سے نئی روشنی پڑتی ہے
ان میں ایک تو خود ان کی تحریریں ہیں۔ دوسرے ان کے بڑے بھائی
کھیم نرائن رند کی غیر مطبوعہ داستان "قصہ جان و دل" کا وہ دیباچہ ہے جس
میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اس ماحول کی
تصویر بھی پیش کی ہے جس میں خود انہوں نے اور ان کے چھوٹے بھائی
بینی نرائن جہان نے زندگی کے دن گذارے تھے۔ اور تیسرے کریم الدین
کے تذکرے طبقات شعرائے ہند اور گارساں دی تاسی کی تاریخ ادب میں
لکھے ہوئے وہ حالات ہیں جو بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں، اور جن
سے بینی نارائن جہاں کی زندگی اور ادبی کارناموں کے بارے میں بعض
نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

چار گلشن کے شروع میں دیباچے کے طور پر بینی نارائن جہان نے
اپنے حالات بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"اب یہ ذرۂ بے مقدار عاصی، گنہگار، بندۂ بینی نارائن ابن رائے
شو درشٹ نارائن نبیرہ مہاراجہ لچھمی نارائن مرحوم، قوم کھتری مہتہ،
ساکن دارالسلطنت لاہور، جو بیچ سال بارہ سو پندرہ ہجری (۱۲۱۵)
کے عہد میں نواب معلی القاب مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ
رکاب برادر صاحب و قبلہ خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب
دام اقبالہٗ کے، کہ بہ عہد وکالت وزیر الملک ہندوستان نواب سعادت علی
خان بہادر دام اقبالہ کے، بیچ شہر لطافت بہر کلکتہ کے آتے تھے، وارد
ہوا۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا ہو گا کہ حالت بیکاری میں گرفتار

ہے اور اب کہ سنہ ایک ہزار اور دو سو پچیس (۱۲۲۵) ہجری، ہیں، عہد دولت میں نواب مستطاب، گردوں رکاب، مہر سپہر دولت و بختیاری، ماہ تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز، مشیر خاص الخاص، بادشاہ کیوان بارگاہ انگلستان، زبدۂ نوئینان عظیم الشان، گورنر جنرل اشرف الامرا۔ لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے ایک دن اس کہانی کو، کہ بہت دنوں سے اس گنہگار کو یاد تھی، بر سبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان، معدن لطف واحسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا۔

منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بہ ضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا کہ، اس قصۂ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لایئے۔ اور زبان ہندی میں اوپر صفحۂ کاغذ کے لکھئے۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقبت یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کے گذرانیئے کہ اگر ان کو جان سخن کہیئے تو بجا ہے۔ بلکہ جان سخن کہنا سزا ہے۔ اس کے سننے سے وہ جناب محظوظ ہوویں اور بہ سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی وردِ زبان رہے۔

سو اس عاصی نے بہ موجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو کہ عقل ناقص میں آیا، قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا۔ امید حضور فیض گنجور سے اس جناب کی کہ قدردان اہل سخن و فیض رسان زمین و زمن ہیں، یہ ہے کہ اس نذر حقیر کو نظر قبول سے سرفراز فرماویں۔ اور چشم داشت سامعان روزگار اور منشیان عالی وقار سے یہ ہے کہ جو کوئی سہو اور خطا، کیا عبارت میں اور کیا بیچ کتابت کے، اس کہانی کے

نظر آوے، از روئے اپنی بزرگی کے قلم اصلاح سے قصور نہ کریں۔ اور بہ سبب اس قصۂ رنگین کے اس مور ضعیف کو بھی یاد فرماویں"۔[1]

اور دیوان جہان کے شروع میں اپنے حالات اس طرح نظم کیے ہیں۔

کر آغاز سخن حمد خدا سے
پھر اس کے بعد نعت مصطفیٰ سے
خدا خالق ہے ہم ہیں آفریدہ
نبی جتنے ہیں سب ہیں برگزیدہ
محمدؐ پر ہوئی ختم رسالت
علی ہے مالک ملک ولایت
ہمیشہ یاد تو ان کی کیا کر
انہیں کا ساغر اُلفت پیا کر
الٰہی تیرے بندے جتنے ہیں خاص
جناب ان کی میں رکھتا ہوں میں اخلاص
مجھے تو اس وسیلے سے شب و روز
غموں پر رکھ مُظفر اور فیروز
فلک پر چمکے یوں میرا ستارا
کریں رنج و الم جس سے کنارا

---

[1] بینی نارائن جہاں۔ بہار گلشن (قلمی نسخۂ برٹش میوزیم لندن) ورق ۱-۲

سبب تالیف

کروں ہوں اب میں ظاہر اپنا احوال
مجھے غم نے کیا از بسکہ پامال
رہا ہندوستاں میں بادل شاد
بفضل حق تھا گھر میرا بھی آباد
کیا کرتا تھا میں نت سیر گلزار
نہ تھا غم سے کبھی مجھ کو سروکار
حسد پر چرخ جو آیا یکایک
تو جوں خورشید دل میرا گیا پک
جو گردش نے مجھے واں سے اُٹھایا
نصیبوں نے یہ کلکتہ دکھایا
چھٹا مجھ سے جو ہندوستاں کا گلشن
کیا میں ملک بنگالہ میں مسکن

جو میرے کیس میں تھا یہ چرخ دوّار
رہا بارہ برس میں یاں بھی بیکار
جو تھی آٹھوں پہر فکر خور و پوشش
ہمیشہ غم سے رہتا تھا ہم آغوشش۔
ہے حیدر بخش نام نامی جن کا
ہیں فنِّ شعر میں جوں در یکتا
انہوں نے میرے گھر تشریف لاکر
میری حالت کو دیکھ افسوس کھاکر
یہ فرمایا مجھے از رَاہ اُلفت
نکال اب دل سے تو اندوہ و کلفت
یہ کئی بیتیں جناب فیض مآب دستگیر بیکساں وحامی درماندگان
مسٹر ٹامس روبک صاحب بہادر دام اقبالہ کی تعریف میں۔
تو کیوں حاضر نہیں ہوتا ہے اس جا
کہ جس کے فیض کا ہے جگ میں شہرا
وہ ہے ٹامس ربک صاحب بہادر
ہے جس کے جود و بخشش سے جہان پر
جو کوئی التجا اس پاس لے جاتے
وہ اس کے فیض سے لعل و گہر پاتے
ہیں اس کے فیض سے سب جزو کل شاد
رکھے اس جگ میں حق نت اس کو آباد

پناہ بیکساں ہے ذات اس کی
سدا حق خوش رکھے اوقات اس کی
صفت اس کی کروں جو کچھ بجا ہے
خدا نے اس کو سب لائق کیا ہے
الٰہی ہو زیادہ اس کا اقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال
گیا میں سر قدم کر کے جو آس پاس
میرے دل گیا سب رنج و وسواس
ستایش کیا کروں اس کے مکاں کی
زباں کو اب نہیں طاقت بیاں کی
ہوا میں دیکھ اس کو بس کہ دل شاد
پڑا واں یاد مجھ کو شعر اُستاد
اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمین است و ہمین است و ہمین است
خداوند تو رکھ دل شاد اس کو
جہان میں روز و شب آباد اس کو
کیا ارشاد یوں اس نے کرم سے
تجھے جو لُطف کی ہے چشم ہم سے
تو کر شعر و غزل کتنے فراہم
کریں اس کے صلہ کا فکر تاہم

ہوا یہ بات سنتے ہی میں دل شاد
بجا لایا کیا تھا جو کچھ ارشاد
تلاش و سعی تب کر کے فراواں
جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں
انہوں کے جمع کر اشعار یکسر
سوا ان کے جو تھے نامی سخنور
انہوں کی بھی غزل اور شعر لکھے
بہ ترتیب و بہ آئیں جمع کر کے
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام
میں دیوان جہاں اس کا رکھا نام
کیا تھا چار گلشن پہلے تحریر
صلے سے اس کے پائی میں نے توقیر
یہ چند اشعار دیباچہ کے مانند
کئے ہیں اس مؤلّف نے قلم بند
دُعا پر ختم کر بینی نرائن
کہ مُستحسن سخنور کو ہے یہ فن
رہے جب تک کہ طرز نظم یارب
پسند اُس کو کریں اہل جہاں سب[1]

---

[1] بینی نارائن جہاں۔ دیوان جہاں قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۱۔۳

کھیم نارائن رند، بینی نارائن جہان کے بڑے بھائی تھے اور جہان کی پرورش انہی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تذکرے دیوان جہاں، میں رند کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ لکھا ہے۔

"رند تخلص، نام رائے کھیم نارائن، مہاراجہ لچھمی نارائن کے پوتے۔ عمدہ روزگار رہے۔ دلی کے رہنے والے۔ اور اب، ہگلی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور یہ خاکسار بھی چھوٹا بھائی انہیں کا ہے"۔

یہ رائے کھیم نارائن شاعر بھی تھے اور نثرنگار بھی۔ نثر میں انہوں نے قیام ہگلی کے زمانے میں ایک داستان قصۂ جان و دل کے نام سے لکھی تھی۔ یہ داستان کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۸۳۸ء کا لکھا ہوا کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے دیباچے میں رند نے اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ ان حالات سے بینی نارائن جہان کے خاندانی حالات اور ماحول کا علم بھی ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"سامعان انصاف پیشہ و منشیان فصاحت اندیشہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ رتبہ نام نامی واسم سامی کا میرے بزرگوں کے اگرچہ اس سے بلند ہے کہ محتاج اظہار کا ہو۔ اور گم نامی و ہیچ مدانی اس گنہگار کی بھی بایں درجہ واقع ہوئی ہے کہ اس کے بھی اظہار کی حاجت نہیں۔ مگر خود زبان کو صانع حقیقی نے واسطے بولنے پیدا کیا۔ پس لازم ہوا کہ بہ قدر اپنی عقل کچھ بولا چاہیئے۔ اسی سبب چند سطریں متضمن اپنی سرگذشت کے اور باعث تحریر اس کتاب کا لکھتا ہوں۔

واضح ہو جیو کہ لقب اسی عاصی کا کھیم نارائن اور تخلص رند ہے۔
اگرچہ وطن اصلی لاہور تھا مگر پانچ پشت سے رزاق مطلق نے بلاد خجستہ
بنیاد شاہ جہان آباد پر تنخواہ لکھا۔ چنانچہ جب کہ سلطان بحر و بر محمد فرخ
سیر صوبہ عظیم آباد سے نہضت کرکے معز الدین بادشاہ پر فتح یاب ہوا
اور دار الخلافت شاہ جہان آباد نے اوس کے قدم میمنت لزوم سے
رونق بہشت بریں پائی، جد پنجم اس خاکسار، کہ کہ دیوان آتما رام
جن کا نام تھا، بموجب حکم بادشاہ، واسطے نظم و نسق صوبہ اکبر آباد کے،
ہمراہ نواب گنج علی خاں سرفراز ہوئے۔ بعد چند روز شطرنج باز فلک
نے عجب بازی کھیلی کہ عبد اللہ خاں وزیر مانند فرزیں کج خرام ہوا۔ اور
حسین علی خاں میر بخشی نے سب سوار و پیادہ و اسپ و فیل اختیار
میں کرکے بادشاہ کی خدمت سے رخ پھیرا۔ تب بادشاہ بے گناہ دیواً
دار نہایت زچ ہو کر آخر وزیر کی کشت سے مات ہوا۔ بعد اس ہنگامہ
قیامت آشوب کے جب سوائے بادشاہ فرخ سیر اور چار شاہزادے
نے بھی سلطنت کی رسم سے بدنام ہو کر عبد اللہ خاں و حسین علی خاں کے
پھیر سے کہ فی الحقیقت میں اصل نتھی، پیالہ شراب مرگ کا پیا۔ دو ایک
مہینے میں مانند ماہ نو غرۂ اقبال اون کا سلخ کو پہنچا۔ تب اورنگ سلطنت
و افسر خلافت نے وجود باجود صاحب قرآن ثانی محمد شاہ بادشاہ غازی
سے رونق پائی اور چند روز میں عبد اللہ خاں و حسین علی خاں قصاص
کفران نعمت میں گرفتار ہوتے۔ بادشاہ فلک بارگاہ نے نواب سعادت
خاں بہادر کو کہ نیشاپور سے تازہ وارد ہندوستان ہو کر جنگ عبد اللہ خاں
میں مصدر کارہائے نمایاں ہوتے، بہ خطاب برہان الملک و خدمت

صوبہ داری اکبرآباد و صوبۂ اودھ سرفراز فرمایا۔ و دیوان آتما رام کو
از راہ نوازش بادشاہی ہمراہ نواب برہان الملک بہ علاقہ دیوانی صوبہ
جات مسطورہ رخصت کیا۔ راجہ لچھمی نارائن نبیرۂ دیوان آتما رام بعہدۂ
وکالت برہان الملک حضور اقدس میں حاضر رہے۔ اور نبض مزاج کو دستیاری
تدبیر سے ایسا ہاتھ میں لائے کہ رفتہ رفتہ خطاب مہاراجگی و جاگیر بست
و دو لکھ روپیہ سالیانہ و علم طوغ و نوبت و نقارہ پاکر امرائے ہفت
ہزاری کے ساتھ نوبت ہمسری کی بجائی غرض اُس عہد سے تا بوقت
خلافت شاہ عالم بادشاہ، اقتدار مہاراجہ موصوف کا ترقی میں رہا۔ اخیر
عمر شہر الہ آباد میں خدمت نیابت نواب شجاع الدولہ وزیر الممالک بہادر
کو بخوبی سرانجام کیا۔ اور بادشاہ نے بھی جو از راہ قدر شناسی اپنا وکیل
مطلق مہاراجہ مذکور کو مقرر فرمایا تھا، اس کام کو بھی بہ آئین شائستہ
حسن انجام دیا۔ چونکہ رسم زمانے کی یہ ہے کہ فلک کج خرام ہمیشہ
سنگ حوادث ہاتھ میں لئے، جہاں چندیں صاحبدل، آئینہ باطن یکجا
ہوتے ہیں۔ فی الفور چوٹ کرتا ہے۔ مہاراجہ لچھمی نارائن نے اس
خاکدان جہان فانی سے بہشت بریں میں منزل کی۔ اور مہاراجہ کشن
نرائن خلف الصدق مہاراجہ مرحوم بہ عطائے منصب و جاگیرات
جاگیر بدستور سرفراز ہوئے۔ وجب کہ شاہ عالم بادشاہ طرف شاہجہان آباد
راہی ہوئے۔ و بعد چند سال نواب شجاع الدولہ کے طائر روح نے قفس
سے پرواز کر کے شاخ سدرہ پر آشیاں کیا، تب نواب گردون جناب
وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر نے مہاراجہ کشن نارائن کو حضرت شاہ عالم
کے حضور کو رخصت فرمایا۔ بعد سختی کے فلک نیرنگ باز نے خاک سی،

راقم حروف کے سر پر ڈالی۔ یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ سودرشت نارائن جن کا نام تھا، گلگشت جنت کا عزم کیا۔ بعد اس سانحۂ ناگزیر کے جد بزرگوار نے تربیت میں اس ہیچ مداں کی نہایت شفقت و کوشش مبذول فرمائی۔ چنانچہ تھوڑے ایام میں مطالعہ کتب ضروری سے فراغت کر کے محسود اقران ہوا۔ طبیعت کو استادوں کے کلام کی سیر سے جب قوت پیدا ہوئی و صاحب سخنوں کی بزم محبت میں چرچا شعر و سخن کا رہنے لگا۔ اس ہیچ مداں کو بھی شوق شعر کہنے و نثر لکھنے کا گریبان گیر خاطر ہوا۔ صاحب سخن شہر کے جب غزل تازہ طرح کرتے تھے یہ عاصی بھی موافق عقل ناقص کچھ کہتا اور آفریں سنتا۔ جب کہ ساقیٔ اجل نے مولوی فخرالدین صاحب و مرزا جان جاناں و خواجہ میر درد صاحب علیہ الرحمۃ والغفران کو شربت مرگ سے سیراب کیا، جدائی سے اون بزرگوں کی اس سرمست نشۂ سخن کی شراب زندگی تلخ ہوئی۔ تب لاچار خدمت جد بزرگوار سے رخصت ہو کر عزم شہر لکھنؤ کا کیا و سولہ برس حضور نواب آصف الدولہ بہادر میں بہ عیش و عشرت بسر ہوئی۔ مرزا محمد رفیع تخلص سودا و میر محمد تقی صاحب کہ رفقائے قدیم جد مرحوم تھے۔ ہمیشہ اس خاکسار کے کلبۂ احزاں کو نور قدوم سے منور رکھتے اور بلبل زبان کو زمزمہ سنجی اشعار آبدار سے مترنم رکھ کر چمنستان سخن کو رشک گلزار بہشت کرتے تھے۔ ان دنوں اس عاصی کو شوق شعر فارسی کا گریبان گیر تھا۔ چنانچہ دو سال کے عرصے میں قصۂ چہار درویش، و افسانۂ حسن و عشق، عشق ہیر و رانجھا و ایک مثنوی مسمابہ باغ و بہار، اور دوسری گوہر شہوار و ایک دیوان متضمن ہر قسم کے شعر کا تصنیف کیا۔

و نثر میں بھی دو رسالہ معنی حسن آداب و اخلاق کے لکھے۔ گاہ گاہے مرزا
محمد رفیع و مخمس ؟ کذا کی بزبان ریختہ کر لیتے تو وہ بھی اتفاق کسی کا ہوتا تھا۔
جب کہ نواب آصف الدولہ بہادر نے بھی عزم گلگشت جنت کا فرمایا اور
چار مہینے میں وزیر علی خاں مانند حباب نگاہ حسرت آلود دریائے دولت پر
کھول کے گرداب ادبار میں گم ہو گیا، نواب یمین الدولہ ناظم الملک سعادت علی
خاں بہادر مبارز جنگ سفارش سے ان کی مسند نشین ایوان وزارت
ہوئے۔ جس وقت کہ نواب مستطاب معلیٰ القاب گورنر جنرل مارکویس
لارڈ مارنگٹن ولزلی صاحب بہادر نے شہر کلکتہ سے طرف لکھنؤ کے نہضت
فرمائی، نواب وزیر الممالک سعادت علی خاں بہادر نے بوقت رخصت
اس خاکسار کے حقوق قدامت کو منظور فرمایا کہ بہ عہدۂ سفارت حضور
گورنر بہادر میں مامور کیا۔ اگرچہ چار برس لوازم دولت خواہی میں کچھ
قصور نہ ہوا مگر بہ سبب نحوست گذر اوقات مشکل دیکھ کے نوکری سے
استعفیٰ دیا و باشندگی شہر کلکتہ کو اختیار کیا۔ چنانچہ تین سال گذرے کہ یہ
عاصی اس شہر لطافت بہر میں مقیم ہے اگر اس شہر کی رونق آبادی و لطافت
مکانات کے وصف کو معمار خرد چاہے کہ احاطۂ تحریر میں لاوے اندازہ
قیاس سے زیادہ ہے۔ مگر قطع نظر اور کیفیتوں کے جو امتحان جوہر قابلیت
اور چرچا شعر و سخن کا اس شہر میں ہے، بالفعل کسی دیار میں نہیں۔ حق
یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے صاحبان عالیشان انگریز بہادر کو جو ممالک وسیع
کا مالک کیا عین حکمت الٰہی ہے۔ کس واسطے کہ نوکر پروری و قدردانی
ارباب فضل و نثر دعدوتہ ؟ کذا مقرری کو بے منت دینا و لشکر کو آسودہ
و خوشدل رکھنا اور اس کے سوا بہت سی باتیں کہ لازمہ ریاست و ادارت

مملکت ستانی ہیں صاحبان عالیشان کی ذات مصدر حساب میں حقیقی اللہ
اپنے فضل وکرم سے جمع کئے ہیں۔ اگر نظر انصاف گزین سے دیکھئے تو علم و
ہُنر، کہ بہ اقتضائے زمانہ بالکل جہان سے منقود ہو گیا تھا، اس عہد
دولت ابد مدت میں از سر نو تازہ ہوا۔ علی الخصوص نواب مستطاب گورنر
جنرل اشرف الاشراف مارکوئس لارڈ مارنگیٹن ولزلی بہادر نے جب
سے مدرسۂ جدید کہ بہ اسم کالج مشہور ہے مقرر فرمایا فی الحقیقت گویا
علم مردہ کو جلایا۔ واحسان عظیم گردن پر ایک عالم کی ثابت کیا۔ کس واسطے
کہ صاحبان عالیشان کو تحصیل علم سے فوائد کثیر متصور ہیں۔ اور بہت سے
شرفا و نجبا علاقہ منشی گری و معلمی سے سرفراز ہو کہ وجہ قوت لا یموت
سے مطمئن رہے ہیں۔ اگرچہ راقم حروف کو کچھ علاقہ کالج سے نہیں مگر جب
دریافت ہوا کہ اس شہر میں ارباب سخن کے قدر دان ہیں اور صاحبان
قدر دان زر کامل نظم ونثر کو محک امتحان پر کھینچ کہ درج اعتبار میں
رکھتے ہیں، خصوصاً صاحب والامناقب کثیر المواہب عالی قدر والاھم
ڈاکٹر صاحب مسیحادم ڈاکٹر ہنٹر صاحب سلمہ اللہ الواہب کہ شخص سخن
کی نبض سبابۂ حکمت سے ملاحظہ فرما کہ اپنی دار الشفائی عقل کامل سے
نسخۂ صحت لکھ کے سقم کو مٹا دیتے یعنی بیماران خستہ جگر افلاس کو شربت
دینار سے صحت بخشتے ہیں اور جس سقیم الوجود زبوں کو کہ رنج افلاس
قابض روح ہو رہا ہے اپنی نوازش سے فلوس عطا کرتے ہیں۔ سوائے
اس کے حکمت الٰہی یہ ہے کہ جس طرح سے صاحبان عالیشان انگریز
بہادر خدمات عمدہ پر سرفراز ہیں اور بندوبست ضلعات ممالک محروسہ
سرکار کمپنی انگریز بہادر کا ہر ایک صاحب کی رائے صائب پر تفویض ہیں،

بالفعل حضور فیض معمور نواب گردوں جناب مشیر خاص بادشاہ کیوان بارگاہ انگلستان زبدۂ نوئینان عظیم الشان اشرف الاشراف سالارِ افواج کمپنی انگریز بہادر گورنر جنرل لارڈ منٹو صاحب دام اقبالہ نظم ونسق اقلیم سخن طرازی، کا کالج جس کا نام ہے ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذمّے ہے۔ ہر خورد نے اس بندۂ عاصی کو کہا کہ اس عہد میں کہ بازار سخن پردازی کو رونق تازہ ہے اور گلستان علم وہنر کو شگفتگی وطراوت بے اندازہ۔ خاموش بیٹھنا اور غنچۂ خاطر کو سموم غم سے پژمردہ رکھنا مناسب نہیں۔ نظم۔

زبان کو ذرا مثل طوطی کے کھول
ترا دل ہے آئینہ کچھ بات بول
سنا جب کہ میں نے یہ اوس کا کلام
بھرا بادۂ عیش سے دل کا جام
زبان کو مری تازہ طاقت ہوئی
تحیر کے غم سے افاقت ہوئی

تب سر زانوئے فکر پر رکھ کر دل میں سوچا کہ پیشتر چند رسالۂ نظم ونثر زبان فارسی میں تصنیف کر چکا ہوں۔ اور اس شہر میں بالفعل زبان اردو نہایت پسند طبائع ہے۔ کوئی حکایت رنگین زبان اردو میں لکھیے۔ جب یہ ارادہ مصمم ہوا تب افسانۂ جان ودل، کہ نہایت لطیف ودلچسپ تھا سنہ بارہ سو تئیس (۱۲۲۳) ہجری میں موافق سنہ اٹھارہ سو آٹھ عیسوی کے تحریر کیا۔"[1]

---

[1] کیم نرائن رند: قصۂ جان ودل قلمی نسخہ کیمبرج ورق ۴

کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقات شعرائے ہند میں بینی نرائن جہاں کا ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"راجہ لکشمی نرائن کا فرزند اور بھائی رائے کھیم نرائن رند کا۔ یہ شخص عالم آدمی تھا۔ درمیان لاہور کے رہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بنام دیوان جہاں کے تصنیف کی ہے جس میں اچھے اچھے شعر اکثر انتخاب اشعار شعراء اردو گو کے جن کے اس کو بہم آئے، لکھے ہیں۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف اس کتاب کا بیان کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں خوشی اور آرام سے رہتا تھا۔ جب تک کہ اس کی قسمت نے اس سے رشک کھا کر اس کی خوش حالی کو مبدل کیا۔ پھر وہ مجبور ہو کر کلکتہ کو گیا وہاں بھی اس کی قسمت بد نے اس کی سختی سے پیروی کی۔ وہ بارہ برس بے روزگار اور بہت تنگدستی میں رہا۔ آخر شش حیدر بخش قابل اور مشہور شاعر نے اس کے حال پر رحم کیا اور اس کو آرام دیا۔ بلکہ اس نے روبک صاحب سے جو مشہور ہندوستانی زبان داں تھا، اس کی ملاقات کروادی۔ اس صاحب نے اسے اپنی خدمت میں لیا اور اس کی تنگدستی کو بخشش و عزت سے دور کیا۔ اس صاحب کی خواہش سے اس نے بیچ ۱۸۱۴ء کے کتاب دیوان جہاں مذکور تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں تین چیزیں اول مناجات اور دیباچہ نظم میں۔ دوسرے مختلف اشعار منتخب۔ تیسرے چند شعر خود مصنف کے۔ ایک اور کتاب جو بینی نرائن نے لکھی ہے وہ قصہ شاہ و درویش کا ہے، جس کا مضمون وہی ہے جو

فارسی قصہ نظم ہلالی میں ہے۔ اور اس کا بھی نام یہی ہے۔ ولسن صاحب کے پاس ہے۔ ایک قلمی جلد نستعلیق حروف چو ورقی جلد میں ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں بینی نرائن کی پہلی ہے۔ تصنیف فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بنام چہار گلشن کے۔ اس کتاب کا ذکر روبک صاحب نے فورٹ ولیم کے مدرسہ کی رپورٹ میں درمیان صفحہ (۳۴۹) کے لکھا ہے۔ اس کتاب کی قلمی جلد فورٹ ولیم کے مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور حال میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے،،[1]

گارساں دی تاسی نے اپنی تاریخ ادب میں کم و بیش اسی قسم کی معلومات فراہم کی ہے۔ لکھتے ہیں:

بینی نارائن، مہاراجہ لکشمی نارائن کے بیٹے، رائے کھیم نرائن رند کے بھائی، لاہور کے رہنے، ہندو مصنف اور شاعر ہیں، جن سے مندرجہ ذیل کتابیں منسوب ہیں :۔

(۱) دیوان جہاں۔ مخصوص اُردو شاعروں کے کلام کے منتخبات پر مشتمل ایک بیاض ہے۔ اس بیاض کے دیباچے میں مصنف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سکھ چین کی زندگی گذارتے ہوتے ایک بار تقدیر نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس کا آرام وسکون برباد ہوگیا۔ لہٰذا مجبوراً اسے صوبہ بنگال کے شہر کلکتہ کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں بھی کرم کے پچھمن ساتھ رہے، اور اسے بارہ برس عالم غربت میں، بلاکسی روزگار کے، گذران کرنی پڑی۔ تاآنکہ

---

[1] گارساں دی تاسی۔ تاریخ ادب ہندوستانی۔ ص ۱۱۵-۱۱۶

مشہور شاعر حیدر بخش اس کے حالات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کی دلجوئی کی۔ علاوہ ازیں ماہر زبان ہندوستانی ٹی۔ روبک صاحب سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جو اس سے بہت متاثر ہوئے اور جنہوں نے اسے معقول آمدنی کی آسامی سے منسلک کر کے اس کی پریشانیوں کو دور کیا۔ صاحب موصوف کی خواہش کے مطابق ۱۸۱۲ء میں بینی نرائن نے اردو شاعری کی یہ بیاض "دیوان جہان" مرتب کی۔ اس بیاض کی ترتیب یہ ہے:

(۱) پیش لفظ اور دیباچہ (۲) مختلف شعراء کے کلام سے انتخاب (۳) اختصار کے ساتھ مصنف کا شعری کلام۔

(۲) قصۂ شاہ و درویش بھی بینی نارائن کی تصنیف ہے۔ اس کی ترتیب ہلالی کی فارسی نظم کے مطابق ہے۔ جس کا عنوان بھی یہی ہے۔ ولسن صاحب کے پاس اس کا ایک مسودہ نستعلیق میں لکھا ہوا موجود ہے۔ شاعر کے اور کلام کی طرح یہ بھی اُردو میں ہے۔ بینی نرائن کی یہ پہلی تصنیف فارسی سے ترجمہ ہے۔ اس کا ایک نام چار گلشن بھی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ صفحہ ۳۳۹ پر ٹی روبک صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کلکتہ کی فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا اور اب وہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں ہے۔ یہ ایک فارسی ناول ہے کیونکہ اسے ایک دلچسپ قصہ کہا جاتا ہے [1]

ان مآخذ میں جو حالات و واقعات اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے ہیں،

---

[1] گارساں دی تاسی۔ تاریخ ادب ہندوستانی۔ ص ۱۱۵۔ ۱۵

ان کو ایک لڑی میں پرو کر صحت اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ یک جا کیا جائے تو بینی نرائن جہاں کے حالات اور شخصیت کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔

یہ مآخذ ان حقائق کو واضح کرتے ہیں کہ بینی نرائن جہاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان مہتہ کھتریوں کا مشہور خاندان تھا۔ یہ خاندان عرصے تک لاہور میں آباد رہا۔ لیکن مغلوں کے دور آخر میں بینی نارائن جہاں کے بزرگ شاہجہاں آباد دلی چلے گئے۔ فرخ سیر کے زمانے میں بینی نارائن جہاں کے جد پنجم دیوان آتمارام بادشاہ کے حکم کے مطابق اکبر آباد کے صوبے دار نواب گنج علی خاں کے ساتھ انتظامی امور میں ہاتھ بٹانے کے کام پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد نواب برہان الملک کی سرکار میں بھی انہیں اعلیٰ منصب ملا۔ رائے لچھی نارائن نبیرۂ دیوان آتمارام انہی برہان الملک کی سرکار میں بہ عہدۂ وکالت سرفراز رہے۔ انہیں اس سرکار سے مہاراجہ کا خطاب بھی ملا۔ ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی گئی۔ اور ان کا منصب ہفت ہزاری تک پہنچ گیا۔ رائے لچھی نارائن کے بیٹے مہاراجہ شودرشٹ نارائن تھے جو شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی سرکار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ بینی نارائن جہاں کے والد راجہ شودرشٹ نارائن، مہاراجہ لچھی نارائن کے فرزند تھے۔ ان کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس لئے ان کے بیٹوں (بینی نارائن جہاں اور کھیم نارائن رند) کی پرورش دادا ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ بینی نارائن جہاں کے بھائی رائے کھیم نارائن رند بھی سولہ سال تک لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ منسلک رہے۔ اور وہاں ان کا وقت اچھا گذرا۔ غرض بینی نارائن جہان کے بزرگوں نے

اچھے دن دیکھے۔ وہ ایک زمانے تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور اس اعتبار سے ان کے خاندان کو خاصی شہرت اور اہمیت حاصل رہی۔

بینی نارائن جہاں کے والد کا نام رائے شودرشٹ نارائن تھا۔ انہوں نے خود چار گلشن کے دیباچے میں لکھا ہے :۔

"اب یہ ذرۂ بے مقدار، عاصی، گناہ گار بندہ بینی نارائن ابن رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ رائے لچھمی نارائن مرحوم قوم کھتری متنہ ساکن دارالسلطنت لاہور۔[1]

اور ان کے بھائی کھیم نارائن رند نے بھی لکھا ہے۔

"بعد وہاں سختی کے فلک نیرنگ باز نے خاک سی راقم کے سر پر ڈالی۔ یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ شودرشٹ نارائن جن کا نام تھا، گلگشت جنت کا عزم کیا"۔[2]

سید محمد نے ارباب نثر اردو میں ان کے والد کا نام مہاراجہ لکشمی نارائن بتایا ہے، لکھتے ہیں :۔

"بینی نارائن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے۔ ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے کھیم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے ان کا تخلص رند تھا۔"[3]

---

[1] بینی نارائن جہاں : چار گلشن : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص - ۱

[2] کھیم نارائن رند۔ قصۂ جان و دل۔ قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری ص ۵

[3] سید محمد۔ ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۴۹

حامد حسن قادری مرحوم نے سید محمد کے اسی بیان کو داستان تاریخ اردو میں دُہرایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"بینی نارائن جہاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن بڑے رئیس تھے۔ اُن کے بھائی رائے کھیم نارائن عالم و شاعر تھے۔ رند تخلص کرتے تھے"۔ [۱]

ظاہر ہے کہ سید محمد اور حامد حسن قادری مرحوم دونوں سے غلطی ہوئی ہے۔ ان دونوں کو بینی نارائن جہاں کے چار گلشن اور کھیم نارائن کے قصہ جان و دل کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے گارساں دی تاسی اور کریم الدین کے بیان کو تسلیم کر لیا ہے اور ان دونوں سے بھی یہی غلطی ہوئی ہے کہ وہ بینی نارائن کو لچھمی نارائن کا بیٹا سمجھ بیٹھے ہیں۔ کریم الدین لکھتے ہیں۔

"بینی نارائن لکشمی نارائن کا فرزند اور بھائی کھیم نارائن رند کا"۔ [۲]

اور دی تاسی کا بیان ہے۔

"BENI NARAYAN, FILS DU MAHARAJA LAKSCHMI NARAYAN ET FRERE DE RAE KHEM NARAYAN RIND, EST UN HOMM DE LETTRES HINDOV NATIF DE LAHORE" [3]

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ ایک غلطی بار بار دہرائی گئی

---

[۱] حامد حسن قادری۔ داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص ۱۳۴

[۲] کریم الدین طبقات شعرائے ہند۔ ص ۳۱۰

[۳] GARCIN DE-TASSY. HISTORIRE DE LA LITERATURE HINDOUI ET HINDOUSTANI P. 115-116

ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ ان لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی بینی نارائن جہان اور ان کے بھائی کھیم نارائن رند کی غیر مطبوعہ تصانیف کو نہیں دیکھا۔ اور ان میں جو معلومات موجود ہے اس پر اپنے بیانات کی بنیاد نہیں رکھی۔

بینی نارائن جہاں کے ابتدائی حالات کی تفصیل ان ماخذ میں بھی موجود نہیں ہے۔ مثلاً کسی ذریعے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی تاریخ ولادت کیا ہے؟ اس بات کی وضاحت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے؟ قیاس یہ کہتا ہے کہ وہ لاہور یا دلی میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کا خاصا وقت اپنے والد رائے شودرشٹ نارائن اور بڑے بھائی کھیم نارائن رند کے ساتھ دلی اور لکھنؤ میں گذرا ہوگا۔ جہاں کے والد کی وفات کے بعد کھیم نارائن رند کی پرورش ان کے دادا مہاراجہ لکشمی نارائن نے کی۔ بینی نارائن جہاں کی پرورش بھی انہیں کے زیر سایہ ہوئی ہوگی۔ اور پھر اس کے بعد خود رند نے ان کی پرورش کا بار اُٹھایا ہوگا۔ اگرچہ اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جب رند لکھنؤ سے کلکتہ گئے ہیں تو بینی نارائن جہاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ۱۲۱۵ھ کے قریب کلکتہ پہنچے۔ اور وہاں دس سال تک بیکار رہے۔

بینی نارائن جہان چار گلشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"بیچ سال ۱۲۱۵، ہجری کے، عہد میں نواب معلی القاب مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے، ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ و خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب

دام اقبالہ کہ، بہ عہدۂ وکالت وزیرالممالک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہ، کے بیچ شہر لطافت بھر، کلکتہ آئے تھے، وارد ہوا۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے۔[1]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بینی نارائن جہان کھیم نارائن رند کے ساتھ کلکتہ پہنچے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ لکھنو میں بھی وہ ان کے ساتھ رہے ہوں گے۔ اور ان کی پرورش رند ہی کے زیر سایہ ہوئی ہوگی۔

بینی نارائن جہان کی تعلیم کے بارے میں بھی کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن کھیم نارائن رند نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا اور اس وقت کے علمی اور ادبی ماحول سے انہیں قربت حاصل تھی۔ ان کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی۔ اس ماحول کے اثر سے انہوں نے تعلیم کی وہ منزلیں ضرور طے کی ہوں گی جن کو طے کئے بغیر اس زمانے میں انسان کو زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

کھیم نارائن رند لکھتے ہیں۔

"فلک نیرنگ باز نے خاک سی راقم حروف کے سر پر ڈالی۔ یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ شیو درشٹ نارائن جن کا نام تھا گلگشت جنت کا عزم کیا۔ بعد اس سانحۂ ناگزیر کے جد بزرگوار نے تربیت میں اس ہیچ مدان کی نہایت شفقت و کوشش مبذول فرمائی۔ چنانچہ تھوڑے ایام میں مطالعہ کتب ضروری سے فراغت کر کے محسود اقران ہوا۔ طبیعت کو استادوں کے کلام کی سیر سے قوت پیدا ہوئی و

---

[1] بینی نارائن جہاں۔ چار گلشن۔ قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۲

صاحب سخنوں کی بزم محبت میں چرچا شعر و سخن کا رہنے لگا۔ اس ہیچ مداں کو بھی شوق شعر کہنے و نثر لکھنے کا گریبان گیر خاطر ہوا۔ صاحب سخن شہر کے جب غزل تازہ طرح کرتے تھے یہ عاصی بھی موافق عقل ناقص کچھ کہتا اور آفرین سنتا۔ جب کہ ساقیٔ اجل نے مولوی فخرالدین صاحب و مرزا جان جاناں و خواجہ میر درد صاحب علیہ الرحمہ والغفران کو شربت مرگ سے سیراب کیا، جدائی سے ان بزرگوں کی اس سرمست نشاط سخن کی شراب زندگی تلخ ہوئی تب لاچار خدمت جد بزرگوار سے رخصت ہو کر عزم شہر لکھنؤ کا کیا و سولہ برس حضور نواب آصف الدولہ بہادر میں بہ عیش و عشرت بس ہوئی۔ مرزا محمد رفیع متخلص سودا و میر محمد تقی صاحب کہ رفقائے قدیم جد مرحوم تھے، ہمیشہ اس خاکسار کے کلبۂ احزاں کو نور قدوم سے منوّر رکھتے اور بلبل زبان کو زمزمہ سنجی اشعار آبدار سے مترنم رکھ کر چمنستان سخن کو رشک گلزار بہشت کرتے تھے۔ ان دنوں اس عاصی کو شوق شعر فارسی کا گریبان گیر تھا۔ چنانچہ دو سال کے عرصے میں قصۂ چہار درویش و افسانۂ حسن و عشق و قصۂ عشق ہیر و رانجھا و ایک مثنوی مسمابہ باغ بہار اور دوسری گوہر شہوار و ایک دیوان متضمن ہر قسم کے شعر کا تصنیف کیا۔ و نثر میں بھی دو رسالہ معنی حسن و آداب و اخلاق کے لکھے۔"[1]

ظاہر ہے کہ جس شخص کے بڑے بھائی نے اس ماحول میں زندگی

---

[1] کھیم نارائن رند۔ قصۂ جان و دل۔ قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری ورق ۵-۶

کے دن گذارے ہوں گے، اس کے چھوٹے بھائی پر بھی اس کا اثر ہوا ہوگا۔
غرض بینی نارائن جہاں کی تعلیم و تربیت اچھے ماحول میں ہوئی، اور انہوں نے دلی اور لکھنؤ میں میرا اور سودا کے ماحول کو دیکھا۔ اسی ماحول کے اثر سے انہیں اردو زبان اور ادب کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوا، اور ان کے دل میں تصنیف و تالیف کے جذب و شوق کی شمع فروزاں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کا سہرا بینی نارائن جہاں کے بڑے بھائی کھیم نارائن رند کے سر ہے۔

لیکن زمانے نے ان محفلوں کو برہم کر دیا، اور کھیم نارائن رند کو اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ جانا پڑا۔ رند نے اس کی تفصیل قصہ جان و دل کے دیباچے میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

جُب کہ نواب آصف الدولہ بہادر نے بھی عزم گلگشت جنت کا فرمایا۔ اور چار مہینے میں وزیر علی خان مانند حباب نگاہ حسرت آلود دریائے دولت پر کھول کے گرداب ادبار میں گم ہوگیا۔ نواب یمین الدولہ ناظم الملک سعادت علی خان بہادر مبارز جنگ سفارش سے ان کی مسند نشین ایوان وزارت ہوئے۔ جس وقت کہ نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل مارکوِیس لارڈ مارنگٹن ولزلی صاحب بہادر نے شہر کلکتہ سے طرف لکھنؤ کے منہضت فرمائی نواب وزیر الممالک سعادت علی خان بہادر نے بوقت رخصت اس خاکسار کے حقوق قدامت کو منظور نظر فرمایا کہ بہ عہدۂ سفارت حضور گورنر بہادر میں مامور کیا۔ اگرچہ چار برس لوازم دولت خواہی میں کچھ قصور نہ ہوا مگر بہ سبب نحوست ایام گذر اوقات مشکل دیکھ کے نوکری سے استعفا دیا و باشندگی شہر کلکتہ کو اختیار

کیا۔ چنانچہ تین سال گذرے کہ یہ عاصی اس شہر لطافت بھر میں مقیم ہے۔[۱]

رند کی یہ داستان قصۂ جان و دل ۱۲۲۳ ہجری یعنی ۱۸۰۸ء میں لکھی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینی نارائن جہاں اپنے بھائی کھیم نارائن رند کے ساتھ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ کے قریب کلکتہ پہنچے۔ جہان نے چار گلشن کے دیباچے میں اپنے جو حالات بیان کئے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔[۲]

یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے وہاں اردو کے لکھنے والوں کو کالج میں جمع کر لیا تھا، اور تصنیف و تالیف کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، خلیل علی خان اشک، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی خان ولا وغیرہ کالج میں ملازم ہو چکے تھے اور انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔

اس ماحول میں بینی نارائن جہاں کہیں نظر نہیں آتے۔ بلکہ یہ زمانہ ان کی بیکاری اور عسرت کا زمانہ ہے۔ دس سال انہوں نے اس بیکاری اور عسرت کے عالم میں گذارے۔ بالآخر ۱۲۲۵ کے قریب سید حیدر بخش حیدری کی سفارش پر انہیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت ملی۔ انہوں نے خود

---

[۱] کھیم نارائن رند۔ قصۂ جان و دل قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی۔ ورق ۶-۷

[۲] بینی نارائن جہاں۔ چار گلشن قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۲

لکھا ہے کہ کلکتہ میں جب ان کی زبوں حالی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور وہ فکر خورد و نوش کے باعث ہر لمحہ غم سے ہم آغوش رہتے تھے، تو ایک دن سید حیدر بخش حیدری جو فن شعر میں درِیکتا تھے ان کے مکان پر تشریف لائے، اور ان کی زبوں حالی پر ترس کھایا اور افسوس ظاہر کیا۔ اور ٹامس روبک سے ملنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بینی نارائن جہاں ان سے ملے۔ انہوں نے ان سے اردو شعراء کے حالات لکھنے کی فرمائش کی اور وہ

۱۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اردو اہل قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ وہ ابتداً فوج میں ملازم ہوئے اور لیفٹیننٹ اور پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی۔ ان کو اردو زبان اور اس کے ادب سے خاص شغف تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے فیض صحبت سے ان میں اردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ پہلے فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے۔ جب ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی صدارت اور اردو کی پروفیسری سے سبکدوش ہو گئے تو یہی ان کی جگہ مامور ہوتے۔ مصنفین و مؤلفین کی سرپرستی کر کے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے مصنفین اور اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی ترغیب دی اور متعدد کتابیں شائع کرائیں۔ ان میں سے ایک منشی بینی نارائن جہاں ہیں جو کپتان روبک ہی کی بدولت مصنف بنے۔ کپتان روبک کو عام نثری کتابوں کے علاوہ اردو شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن جہاں سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھوایا۔ مرزا جان طپش نے جو کلکتہ کے مشہور شاعر اور فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے، اپنی مثنوی

بہار دانش میں ان کی تعریف عجیب پرلطف انداز میں کی ہے۔

پھر آگے کہاں وہ زبان و بیان
ادا ہو جو کپتان صاحب کی شان
شریف النسب اور گرامی شکوہ
حکیم و خردمند و دانش پژوہ
امارت میں شوکت ہیں عالی طریق
بہ تسخیر دلہا شفیق و خلیق
ہنر سنج و دقاق و معنی شناس
سخن کے سخنداں کا ہے جس کو پاس
شرف جس سے تدریس کو ہے ملا
دیا جس نے تعلیم کو مرتبا
زبس ہے سب آگاہ علم و کمال
دقایق میں ہے ریختے کے مثال
کہیں کیوں نہ ہم اس کو طوطی مقال
کہ ہندی زبان کا ہے صاحب کمال
حق اس کے تئیں نت سلامت رکھے
سلامت رکھے باکرامت رکھے

کپتان روبک "ہندوستانی لغت" کی تدوین میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح مدد و معاون تھے۔ بطور خود بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک "لغت جہاز رانی" ہے۔ اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو

اس کام میں مصروف ہوئے۔ لیکن اس سے قبل وہ چار گلشن لکھ چکے تھے۔ اور اس کا ایک نسخہ انہوں نے کپتان ٹیلر[1] کو پیش کیا تھا۔ ہو

حاشیہ بقیہ۔ میں جمع کئے گئے ہیں اور ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی ذخیرہ کثیر ہے جو انگریز کمانڈروں کو میدان جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ پھر اردو کی قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی اس کے ساتھ میں بطور ضمیمہ شریک کیا۔ اس مفید لغت کی پہلی اشاعت کلکتہ سے ۱۸۱۱ء میں ہوئی دو سال بعد دوسرا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا۔ کپتان روبک کی دوسری کتاب "ترجمان ہندوستانی" (ہندوستانی انٹرپریٹر) ہے۔ اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل مندرج ہیں۔ یہ کتاب پہلے لندن سے ۱۸۲۴ء میں اور پھر پیرس و لندن سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے۔ کپتان روبک نے ان کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی ایک مبسوط تاریخ بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ (سید محمد ارباب نثر اردو لاہور ص ۳۴-۳۶)

[1] کپتان جوزف ٹیلر بھی اردو زبان کے دلدادہ اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ اور کپتان روبک کی طرح ایک بسیط اردو انگریزی لغت مرتب کی ہے۔ ابتداءً اپنے ذاتی استعمال کے لئے بطور فرہنگ تیار کی تھی۔ پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ایم، ڈی کی مدد سے اس کو باضابطہ مرتب و شائع کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر بھی کالج میں ملازم

حاشیہ۔ اور اردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ طپش نے ان کی بھی مدح کی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں :

چل اے خامہ کالج کی توصیف کر
ہوئے مجتمع جس میں اہل و ہُنر
فصاحت بلاغت کا ہے جو مقام
جو ہے تربیّت گاہ ہر خاص و عام
رہے ڈاکٹر ہنٹر اس میں سدا
ہر اک اہل حاجت کا حاجت روا
تنعم، تمکن، ترحم، کرم
عیاں اس کے سیما پہ ہے دمبدم
ہے وابستہ اس سے ہر اہل سخن
کہاں ایسے ہوتے ہیں آگاہ فن
شرف اس نے ہندی زباں کو دیا
دیا نظم اردو کو یہ مرتبا
ترقی سب اس کی اسی سے ہوتی
ہوئی قدر اس سے تصانیف کی

کپتان ٹیلر کی لغت بھی نہایت کار آمد ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ولیم کارمیکائیل اسمتھ نے اس کی نظر ثانی کر کے ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۲۰ء میں شائع کیا تھا۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر دونوں نے اردو نثر نویسوں کی سر پرستی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

سکتا ہے اسی تالیف کی وجہ سے انہیں کالج میں ملازمت ملی ہو۔ اس بات کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ بینی نارائن کب تک فورٹ ولیم کالج میں رہے اور کب ان کا انتقال ہوا۔

بینی نارائن جہان مندرجہ ذیل تین کتابوں کے مولّف ہیں۔

(۱) چار گلشن

(۲) دیوان جہاں

(۳) تنبیہ الغافلین

چار گلشن بینی نارائن جہاں کی پہلی ادبی تالیف ہے۔ یہ کتاب انہوں نے کلکتہ کے دوران قیام میں لکھی۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۱ء ہے۔ یہ کہانی ان کے حافظے میں عرصے سے محفوظ تھی۔ ایک دن انہوں نے اس کو منشی امام بخش صاحب کے سامنے بیان کیا۔ منشی صاحب نے اس کو قلم بند کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ بینی نارائن جہاں نے ان کے اصرار پر اس کو اردو زبان کا جامہ پہنایا۔ اور انہیں کی فرمائش پر اس کا ایک نسخہ کپتان ٹیلر کو پیش کیا۔ اس کی تفصیل بینی نارائن نے خود اس کتاب کے شروع میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

اَب یہ ذرۂ بے مقدار، عاصی، گناہ گار، بندہ بینی نارائن ابن

(بقیہ حاشیہ) ان ہی اردو پسند انگریزوں کی بدولت فورٹ ولیم کالج قائم رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔ (سید محمد۔ ارباب نثر اردو صفحہ ۳۶-۳۷)

رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ مہاراجہ لچھی نارائن مرحوم قوم کھتری ٹہنۂ ساکن دارالسلطنت لاہور جو بیچ سال ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری کے عہد میں نواب معلی القاب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب دام اقبالہ، کے، کہ بہ عہدۂ وکالت وزیرالممالک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہٗ کے بیچ شہر لطافت بہر کلکتہ کے آتے تھے، وارد ہوئے۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا ہوگا کہ حالت بیکاری میں گرفتار رہے اور اب کہ سن ایک ہزار دو سو پچیس، ہجری ہیں، عہد دولت میں نواب مستطاب، گردوں رکاب، مہر سپہر دولت و بختیاری، ماہ تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز، مشیر خاص الخاص بادشاہ کیواں بارگاہ انگلستان، زبدۂ نوئینان عظیم الشان، گورنر جنرل اشرف الامرا، لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے ایک دن اس کہانی کو، کہ بہت دنوں سے اس گنہ گار کو یاد تھی، بر سبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان، معدن لطف و احسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا۔

منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بہ ضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا کہ "اس قصۂ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لائیے" اور زبان ہندی میں اوپر صفحۂ کاغذ کے لکھیے۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقب یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہٗ کے گذرائیے کہ اگر ان کو جان سخن کہیے تو بجا ہے جان سخن کہنا سزا ہے۔ اس کے سننے سے وہ جناب محظوظ ہوویں۔

اور بہ سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے۔"

سو اس عاصی نے بہ موجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو کہ عقل ناقص میں آیا، قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا۔ امید حضور فیض گنجور سے اس جناب کے، کہ قدر دان اہل سخن و فیض رساں زمین و زمن ہے، یہ ہے کہ اس نذر حقیر کو، نظر قبول سے سرفراز فرماویں، اور چشم داشت سامعان روزگار اور منشیان عالی وقار سے یہ ہے کہ جو کوئی سہو اور خطا، کیا عبارت میں اور کیا بیچ کتابت کے، اس کہانی کے نظر آوے، از روئے اپنی بزرگی کے قلم اصلاح سے قصور نہ کریں۔ اور بہ سبب اس قصۂ رنگین کے اس مور ضعیف کو بھی یاد فرماویں۔" [1]

روبک کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ کتاب کالج کے کتب خانے میں داخل کی گئی اور بینی نارائن جہاں کو اس پر انعام بھی ملا۔[2]

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہی کتاب فورٹ ولیم کالج میں ان کی ملازمت کا وسیلہ بنی ہو۔

بینی نارائن نے اس کہانی کو نہایت محنت سے، اس اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ ضرور پسند کی جائے گی، اور جو شخص بھی اس کو سنے

---

[1] بینی نارائن جہاں - چار گلشن : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن - ورق ۱ - ۳

[2] ROEBUCK: ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM P.339

یا پڑھے گا۔اس کی داد ضرور دے گا۔کتاب کے آخر میں چند اشعار کی ایک نظم ہے جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے، لکھتے ہیں۔

کہانی جو فرخندہ کی میں لکھی
غلط سمجھو مت یہ ہے سب سہی[1]
بہت خون دل اس میں کھایا ہے میں
مزہ خوب سا اس میں پایا ہے میں
رکھا چار گلشن جو میں اس کا نام
رہے گی خزاں دور اس سے مدام
سنے جو کوئی اس کو کیجو یقین
کرے گا مصنف کو بس آفرین
کہانی ہوئی اب یہاں سے تمام
بہ حق محمد علیہ السلام[2]

کریم الدین نے اپنے تذکرے میں چار گلشن کی تالیف اور اس کے قلمی نسخوں کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔
"ایک اور کتاب جو بینی نارائن نے لکھی ہے وہ قصہ شاہ درویش کا ہے، جس کا مضمون وہی ہے جو فارسی قصہ نظم ہلالی میں ہے[3] اور اس

بلوم ہارٹ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ص ۳۱۹

[1] صحیح [2] بینی نارائن جہاں۔ چار گلشن، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ورق ۹
[3] گارساں دی تاسی نے بھی چار گلشن کو ہلالی کے قصے سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن بلوم ہارٹ نے یہ لکھا ہے کہ اس داستان کا ہلالی کے فارسی قصے شاہ درویش سے کوئی تعلق نہیں۔ گارساں دی تاسی کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

کا بھی نام یہی ہے۔ ولسن صاحب کے پاس ہے۔ ایک قلمی جلد نستعلیق
حروف چو ورقی جلد میں ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں بینی نارائن کی
پہلی ہے۔ تصنیف فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بنام چار
گلشن کے۔ اس کتاب کا ذکر روبک صاحب نے فورٹ ولیم کے مدرسے
کی رپورٹ میں درمیان صفحہ ۳۴۹ کے لکھا ہے۔ اس کتاب کی قلمی جلد
فورٹ ولیم کے مدرسے کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور حال میں
ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے"[۱]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چار گلشن کی ایک جلد فورٹ ولیم
کالج کے کتب خانے میں داخل کی گئی تھی اور بعد میں اس کو ایشیاٹک
سوسائٹی کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ نسخہ اب نایاب
ہے۔ کیونکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں موجود
نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں اب بھی موجود ہو۔
ولسن صاحب کے پاس اس کا جو قلمی نسخہ تھا، وہ کسی طرح ان کے ساتھ
لندن پہنچا۔ برٹش میوزیم لندن نے اس کو مسٹر ولسن سے ۱۲؍ جنوری
۱۸۶۱ء کو خریدا۔ اور اب یہ نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب
خانے کی زینت ہے۔ یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اب یہ پہلی بار
شائع کی جا رہی ہے۔

چار گلشن کے ماخذ کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا

(بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ص ۳۱۹)

[۱] کریم الدین۔ طبقات شعرائے ہند۔ صفحہ ۳۱۰

جا چکا ہے، گارساں دی تاسی اور کریم الدین نے اس داستان کو ہلالی کے فارسی قصے "شاہ درویش" سے ماخوذ بتایا ہے[۱]۔ بلوم ہارٹ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ہلالی کے قصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں[۲] اور بلوم ہارٹ کا خیال صحیح ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بینی نارائن جہاں نے اس کہانی کو فارسی کی کسی خاص داستان کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا۔ کسی فارسی داستان کا ترجمہ بھی نہیں کیا۔ اس قسم کی کہانیاں اس زمانے میں بہت عام تھیں۔ بینی نارائن نے اس کہانی کو سنا، اور جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، عرصے تک اپنے حافظے میں محفوظ رکھا بالآخر منشی امام بخش کی فرمائش پر اس کو قلم بند کیا۔[۳]

سید محمد نے لکھا ہے :-

"بینی نارائن کی یہ تالیف بہ حیثیت قصہ نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک قدیم نثری کتاب ہونے کے ضرور قابل قدر ہے۔ باغ و بہار، باغ اردو، آرائش محفل کی طرح یہ بھی اردو کی ابتدائی کتب نثر میں ہے، اور تاریخ ادبیات اردو میں اس سلسلے کی کڑی ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے"۔[۴]

---

[۱] گارساں دی تاسی۔ تاریخ ادب ہندوستانی۔ ص ۱۱۶ کریم الدین۔ طبقات شعرائے ہند۔ ص ۳۱۰

[۲] بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن۔ ص ۳۱۹

[۳] بینی نارائن جہاں۔ دیباچہ چار گلشن، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ورق ۲

[۴] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۵۵

سید محمد کو چار گلشن کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ اگر یہ کتاب ان کی نظر سے گذری ہوتی تو یقیناً وہ اس کی کہانی کے بارے میں بھی اچھی رائے قائم کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ چار گلشن کہانی کی حیثیت سے بھی دلچسپ ہے اور اردو کی قدیم نثری کتاب کی حیثیت سے بھی ایک قابل قدر اور منفرد تالیف ہے۔

بینی نارائن جہاں کی دوسری کتاب دیوان جہاں ہے۔ یہ کتاب بھی انہوں نے کلکتہ کے دوران قیام میں لکھی۔ اس کی تالیف کا سبب بینی نارائن نے یہ بیان کیا ہے کہ جب سید حیدر بخش حیدری نے ان کی زبوں حالی پر ترس کھا کر ٹامس روبک سے انہیں ملایا تو انہوں نے جہاں سے اس قسم کا تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انہوں نے روبک کی فرمائش پر اس کو لکھنا شروع کیا، اور تھوڑے عرصے میں اس کو مکمل کر لیا۔

کیا ارشاد یوں اس[1] نے کرم سے
تجھے جو لطف کی ہے چشم ہم سے
تو کر شعر و غزل کتنے فراہم
کریں اس کے صلہ کا فکر تاہم
ہوا یہ بات سنتے ہی میں دل شاد
بجا لایا کیا تھا جو کہ ارشاد
تلاش و سعی تب کر کے فراواں
جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں

---

[1] ٹامس روبک

انہوں کے جمع کر اشعار یکسر
سوا ان کے جو تھے نامی سخنور
انہوں کی بھی غزل اور شعر لکھے
بہ ترتیب و بائیں جمع کر کے
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام
ہیں دیوان جہاں اس کا رکھا نام[1]

جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہے یہ کتاب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے کو بینی نارائن نے ۱۸۱۲ء میں لکھا۔ بلوم ہارٹ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غالباً یہ تذکرہ ۱۸۱۴ء لکھا گیا ہو گا[2]۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں دیوان جہاں کا جو نسخہ ہے اس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"تمام شد بتاریخ سی ام ماہ ستمبر ۱۸۱۲ء
بہ توفیق اللہ"[3]

اس عبارت کو دیکھنے کے بعد اس خیال میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ دیوان جہاں ۱۸۱۲ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس پر نگر نے بھی

---

[1] بینی نارائن جہاں: دیوان جہاں: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ورق۔ ۳
[2] بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن۔
[3] بینی نارائن جہاں۔ دیوان جہاں قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی (مرتبہ کلیم الدین احمد) ورق ۱۷۸

اس کا سنہ تالیف یہی لکھا ہے[1] اور یہی صحیح ہے۔ گارساں دی تاسی نے اس کا سنہ تالیف ۱۸۱۴ء لکھا ہے[2] ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح سید محمد نے جو قیاس آرائی کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔
"ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کی تاریخ تالیف ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ بتاتی ہے مگر خود مولف تذکرہ نے اس کی تاریخ اختتام ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء لکھی ہے۔ غالباً اس کی تالیف ۱۲۲۷ھ میں شروع ہوئی۔ اور دو سال میں اتمام کو پہنچی[3]"

سید محمد کی نظر سے ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ نہیں گذرا اسی لئے قیاس آرائی میں ان سے یہ غلطی ہوئی۔ دیوان جہاں ستمبر ۱۸۱۲ء سے قبل ہی مکمل ہوگیا تھا۔

دیوان جہاں میں اردو کے ایک سو پچیس شاعروں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور یہ اختصار اس میں اس حد تک پایا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اشعار کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے اس کی کوئی خاص ادبی اور تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں شاعروں کے حالات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور تاریخوں کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اس وقت دنیا میں تذکرۂ دیوان جہاں کے صرف دو قلمی نسخے ہیں۔

---

[1] اسپرنگر۔ فہرست مخطوطات اودھ ص ۱۷۸

[2] گارساں دی تاسی: تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی (فرانسیسی) ص ۱۱۶

[3] سید محمد۔ ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۵۵

ایک تو برٹش میوزیم لندن کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں۔ میوزیم کا نسخہ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں جلی لکھا ہوا ہے۔ اس پر تاریخ تالیف اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن کلیم الدین احمد نے اس کو مرتب کرکے پٹنہ سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں قلمی نسخے کے پہلے اور آخری صفحات کی تصویریں بھی دی ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا، اور جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا۔

گارساں دی تاسی اس تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"تذکرۂ جہاں ان چھ تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے اپنی تاریخ میں کام لیا ہے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ان چھ تذکروں میں سے ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے ہیں۔ اس تالیف کا نام دیوان جہاں ہے جس میں مؤلف کے تخلص کا اشارہ ہے۔ بعض اوقات جہاں کا لفظ استعارے کے طور پر ہندوستان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو کچھ میں پہلے اپنی تاریخ میں اس کتاب کے متعلق جو ۱۲۲۷ (۱۸۱۲ء) کی تالیف ہے، نیز اس کے مؤلف کے متعلق لکھ چکا ہوں، اس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ مؤلف اگرچہ ہندو ہے جو اس کے نام بینی نارائن سے ظاہر ہے مگر کتاب اس نے مسلمانوں کی زبان میں لکھی ہے۔ نئی اطلاع مجھے بینی نارائن جہاں کے متعلق یہ ملی ہے کہ وہ قوم کا کاستھ تھا اور بقول بعض دہلی کا رہنے والا اور بقول بعض لکھنؤ کا باشندہ تھا۔ اس کے باپ کا نام

سدرشٹ نرائن اور دادا کا نام لکشمی نارائن تھا۔ دیوان جہاں کو تذکرہ نہیں بلکہ مجموعہ انتخابات کہنا چاہیئے۔ اس میں کوئی ایک سو پچاس شعراء کا تذکرہ ہے۔ انتخابات بہت اچھے ہیں مگر اقتباسات بہت طویل ہیں۔"[۱]
اس تذکرے کا انداز مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا۔
"آفتاب تخلص، مہر سپہر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ جنت آرام گاہ ابن عالمگیر ثانی کا۔ یہ تصنیف خاص ہے"۔[۲]
"آبرو تخلص، عرف شاہ مبارک آبرو، نام نجم الدین علی خان محمد غوث گوالیاری کے پوتے تھے۔ یہ ان سے ہے"۔[۳]
"افسوس تخلص، نام میر شیر علی، منظفر خاں کے بیٹے۔ پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح لی۔ بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیراں کے۔ نارنول کے رہنے والے۔ کلکتے میں رحلت کی"۔[۴]
"انشاء تخلص، نام میر انشاء اللہ۔ میر ماشاء اللہ کے بیٹے کہ فن حکمت میں بوعلی سینا۔ اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں"۔[۵]
"حیدری تخلص، میر حیدر بخش، دہلی کے رہنے والے۔ بالفعل مسند حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی ہے۔ اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں"[۶]

ل۔ بینی نارائن جہاں نے خود اپنے آپ کو متنہ کھتری لکھا ہے۔ اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد لاہور کے رہنے والے تھے۔ لیکن یہ لوگ ملازمت کے سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ میں بھی رہے۔ گارساں کی معلومات صحیح نہیں ہیں۔

[۱] گارساں دی تاسی۔ خطبات (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء) ص ۸۹-۹۰
[۲] بینی نارائن جہاں دیوان۔ جہاں: (مرتبہ کلیم الدین احمد) ص ۵
[۳] ایضاً ص ۱۳ [۴] ایضاً ص ۲۲ [۵] ایضاً ص ۳۰ [۶] ایضاً ص ۹۹

"نام ان کا معلوم نہ ہوا کہ کیا تھا۔ یہ ان سے ہے"۔[1]

"زند تخلص، نام رائے کھیم نارائن۔ مہاراجہ لچھمی نارائن کے پوتے۔ عمدہ روزگار رہے۔ دہلی کے رہنے والے۔ اور اب ہوگلی تشریف رکھتے ہیں۔ اور یہ خاکسار بھی چھوٹا بھائی انہیں کا ہے"۔[2]

بینی نارائن جہاں کی تیسری تالیف تنبیہ الغافلین ہے۔ یہ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ بینی نارائن جہاں نے ۱۲۴۵ بنگالی ۱۸۳۹ء میں اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں ہے۔ اس کا نمبر ہے ۳۱۶۴ پی اور یہ ۱۱۸ اوراق پر مشتمل ہے[3] اس نسخے میں کل بیس باب ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"اچھی اچھی صفتیں اور تعریفیں اللہ تعالیٰ کو ثابت ہیں کہ خدا تعالیٰ پیدا کرنے والا اور پالنے والا تمام خلق و عالم کا ہے، اور درود نامحدود کے پیغمبر کے اوپر"[4]۔ اور اس عبارت پر ختم ہوتا ہے۔

"حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے آٹھویں تاریخ اگھن مہینے کی سنہ بارہ سو پینتالیس بنگلہ میں سینچر کے دن دوپہر ایک گھڑی کے سمے تمام ہوئی"۔[5]

---

[1] بینی نارائن جہاں: دیوان جہاں ص ۱۰۷

[2] ایضاً ص ۱۳۰

[3] بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات انڈیا آفس اے لندن ص ۷

[4] بینی نارائن جہاں: تنبیہ الغافلین: قلمی نسخہ انڈیا آفس ورق ۱

[5] ایضاً۔ ورق ۱۱۸ (بحوالہ بلوم ہارٹ)

میں نے خود تنبیہ الغافلین کے اس قلمی نسخے کو نہیں دیکھا۔ یہ عبارتیں یہاں بلوم ہارٹ کی فہرست مخطوطات سے یہاں نقل کی گئی ہیں۔ سید محمد نے اس کا ایک اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے۔ وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں ایک بڑا دانا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو! ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی تم دونوں ہی بانٹ لیجیو۔ یہ بات سن کے وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پاکر خوش گزران کرنے لگے اور وہ بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کے قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بے چارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا گیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔" (تنبیہ الغافلین قلمی نسخہ انڈیا آفس)[1]

بینی نارائن جہاں کی یہ کتاب طبع نہیں ہوئی۔

یوں تنبیہ الغافلین کے نام سے ایک کتاب بار بار شائع ہوئی ہے لیکن یہ بینی نارائن کی کتاب سے مختلف ہے۔ اس میں پچیس باب ہیں۔ بینی

---

[1] سید محمد۔ ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۵۹

نارائن کی کتاب میں کل بیس باب تھے۔

سید محمد لکھتے ہیں۔

"آج کل تنبیہ الغافلین اردو کے جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں وہ یقیناً بینی نارائن کے نہیں ہیں۔ بینی نارائن کے ترجمے میں صرف ۲۰ الواب ہیں۔ اور موجودہ نسخوں میں ۲۵ الواب پائے جاتے ہیں۔ مطبوعہ ترجمہ سید محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی متحدہ مساعی کا نتیجہ ہے۔

ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز کی تصحیح سے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی بینی نارائن کے ترجمے کا ذکر نہیں۔ البتہ یہ فقرہ موجود ہے۔ اُس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو، جس میں ۲۰ باب تھے، فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں، معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بینی نارائن ہی کا ہے۔"[1]

تنبیہ الغافلین کے مطبوعہ نسخے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"اچھی اچھی تعریفیں اور صفتیں اللہ تعالےٰ کو ثابت ہیں جو پیدا کرنے والا اور پالنے والا تمام خلق اور عالم کا ہے۔ اور صلوٰۃ اور درود اس کے پیغمبروں پر خصوصاً محمدؐ مصطفےٰ احمد مجتبےٰ، خاتم انبیا، سرور اصفیا، ہدایت کرنے والے گمراہوں کے، بخشانے والے گناہ گاروں کے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر اور ان کی اولاد اور یاروں پر اور تمامی پرہیزگاروں اور نیک

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور) صہ ۲۵۸

کاروں پر۔ بعد حمد و نعت کے لکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں اور رسول اللہ کی حدیثوں اور مشائخوں کے اچھے کلاموں سے۔ اور اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے۔ اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے، اس کو جس میں بیس باب تھے، فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں۔ حاجی سید عبداللہ صاحب نے اس کی آیتیں اور حدیثیں صحیح کر کے، بلکہ کچھ اور بھی اپنی طرف سے زیادہ کر کے، عربی خط سے بیس باب میں چھپوایا تھا۔ ان دنوں عاصی سید محمد اور محمد طیب اور امین الدین اور محمد تقی خیر خواہان خلق اللہ نے جب دیکھا کہ لوگوں کی خواہش اس کتاب کی طرف عربی خط کے سبب کم ہے۔ اس واسطے یہ عاصیوں نے اعانت اور تصحیح سے جناب حضرت مولوی عبدالعزیز صاحب اور جناب مولوی امیر الدین صاحب کے اس کتاب کو جو سبب ہدایت گمراہوں کے اور باعث رہنمائی فلسفوں کی ہے، کچھ اور بھی اپنی طرف سے مسائل زیادہ کر کے پچیس باب اور خاتمہ میں فارسی خط سے واسطے فائدہ عوام کے چھپوایا۔"[1]

اس عبارت کا ابتدائی حصہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کی بنیاد بینی نارائن جہاں ہی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ یہ عبارت قلمی نسخے کی عبارت سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں یقیناً ترمیم و اضافہ ہوتا رہا اور یہ اپنی مقبولیت کے باعث بار بار چھپ کر شائع ہوتی رہی۔

---

[1] تنبیہ الغافلین (مطبوعہ مطبع دار السلام دہلی۔ طبع دوم ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۸ء) ص ۳۰۲

گارساں دی تاسی نے اپنے ایک خطبے میں یہ لکھا ہے کہ بینی نارائن جہاں نے ایک کتاب "قصہ جات" کے نام سے بھی لکھی تھی۔ اس میں قصے کہانیاں تھیں[1]۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ باوجود کوشش کے راقم کو نہیں ملا۔ فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی لکھی ہوئی بعض مختصر کہانیاں انگلستان کے مختلف کتب خانوں میں ملتی ضرور ہیں لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بینی نارائن کی لکھی ہوئی ہیں۔ اگر یہ کتاب مل گئی تو یقیناً اُردو افسانے کی روایت میں حیدری کی مختصر کہانیوں کی طرح ایک نئی دریافت ہوگی۔

بینی نارائن کی ان تصانیف سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھے خاصے نثر نگار تھے۔ اور انہوں نے ایک نثر نگار کی حیثیت سے اپنے زمانے ہی میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی تمام تالیفات اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چار گلشن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان کی یہ کتاب کہانی اور اسلوب دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اور اِسی کی بدولت اردو نثر کی روایت کے افق پر بینی نارائن جہاں کے نام کا ستارہ ہمیشہ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵ راپریل ۱۹۶۷ء

عبادت

---

[1] گارساں دی تاسی : خطبات (انجمن ترقی اُردو) ص ۹۰

۲۱

ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک

ارض پاک سے دیار فرنگ تک کی یہ داستان مَیں نے اسی وقت قلم بند کی تھی جب میں آج سے تقریباً پانچ سال قبل لاہور سے رخصت ہو کر لندن پہنچا تھا، اس میں ایک ایسے شخص کے تاثرات اور جذبات و احساسات کی تصویریں ہیں، جو ذہنی طور پر اس سفر کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن جس کو حالات نے چند سال کے لئے وطن عزیز چھوڑنے اور دیار فرنگ میں قیام کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہ شخص اُس سرزمین پر پہنچا، اور اس کو وہاں کی زندگی کے اَن گنت پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ وہ ان سے متاثر ہوا۔ اُس پر وہاں کی زندگی کے گہرے نقوش ثبت ہوئے۔ لیکن وہ صرف وہاں کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں گم ہی نہیں ہو گیا۔ اُس نے وہاں کی زندگی کا مشاہدہ تجزیاتی زاویۂ نظر سے

بھی کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس روداد سفر میں تاثر اور تجزیے کے عناصر آپس میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ داستان صرف چند واقعات، مشاہدات و تاثرات کے اظہار و حقائق کے بیان پر مشتمل ہے، اس میں زیب داستان کے لئے کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں دیار فرنگ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے وہاں کی زندگی کی ایک تصویر سامنے ضرور آجاتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ اس بیان میں تفصیل جزئیات کے عناصر نہیں ہیں، صرف چند اشارے کئے گئے ہیں، لیکن ان اشاروں میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے اس کوشش میں کہنے والا کس حد تک کامیاب ہوا ہے، اس کا فیصلہ تو ظاہر ہے کہ اس کے پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

اس روداد سفر کو صرف یادداشتوں کی صورت میں قلم بند کیا گیا تھا، انہیں یادداشتوں کو اشاعت کے وقت تھوڑی سی مربوط شکل دے دی گئی ہے۔ اس کو اشاعت کے خیال سے نہیں لکھا گیا تھا، یہ تو محض ذاتی اور انفرادی تجربات کا افسانہ تھا، اس افسانے کو بعض احباب نے سنا تو اس کی اشاعت پر اصرار کیا۔ چنانچہ اب پانچ سال کے بعد بعض انگریز اور پاکستانی احباب کے اصرار پر اس افسانے کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

افسانۂ نوشت نظیری کتاب شُد

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۲۵ رجون ۱۹۶۷ء

۲۲

جشن نامۂ اقبالؒ

حکیم الامت، شاعر مشرق، مفکر اسلام، خالق تصور پاکستان علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کئی سال تک اورینٹل کالج کے ساتھ وابستہ رہے۔ تقریباً تین سال تک تو انہوں نے میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اورینٹل کالج میں باقاعدہ طور پر علمی اور تدریسی کام کیا۔ اس زمانے کی یادگار ان کی ایسی گراں قدر تصانیف ہیں جن کو علمی دنیا میں ہمیشہ عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ پھر جب وہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں استاد تھے، تو لیکچر دینے

کے لئے اورینٹل کالج ہی میں تشریف لاتے تھے۔ کیوں کہ علامہ اقبالؒ جن موضوعات پر لیکچر دیتے تھے، ان کی تدریس کا انتظام اس وقت اورینٹل کالج ہی میں تھا۔ غرض یہ کہ اورینٹل کالج کے ساتھ ایک زمانے تک علامہ کا گہرا تعلق رہا۔ انہوں نے اس کالج کے دوران قیام میں علمی اور تدریسی اعتبار سے اہم کارنامے انجام دیئے اور اس طرح اس روایت کو سہارا دیا جس کے لئے اورینٹل کالج نہ صرف برعظیم ہندو پاکستان، بلکہ ساری دنیا میں مشہور تھا۔

اورینٹل کالج علامہ اقبالؒ کی اس وابستگی پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قیام پاکستان سے قبل اورینٹل کالج میں علامہ اقبالؒ پر کوئی خاص قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ اورینٹل کالج میگزین کا کوئی خاص نمبران کے بارے میں شائع نہیں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میگزین میں ان کی شخصیت اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر مضامین شائع نہیں ہوئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں میگزین کا دائرہ کار زیادہ تر قدیم کلاسیکی ادبیات کی تحقیق تک محدود تھا۔ اس لئے غالباً یہ خیال ہی کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ میگزین کے ایک خاص نمبر میں عصر حاضر کے عظیم مفکر اور شاعر علامہ اقبالؒ کو خراج عقیدت پیش کیا جائے۔

اب علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے مبارک موقع پر اس کی کسی حد تک تلافی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اورینٹل کالج کی طرف سے اقبال شناسی کے موضوع پر یہ مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مجموعہ علامہ اقبالؒ پر شائع ہونے والے مجموعوں اور رسالوں

کے خاص نمبروں سے مختلف ہے، کیوں کہ اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اورینٹل کالج سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہنے والے استادوں، پروفیسروں، پرنسپلوں، محققوں، نقادوں، علوم مشرقی کے ماہروں اور اورینٹل میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کی ایسی تحریریں یک جا کی جائیں جو اقبال شناسی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، اور جن سے واقعی علامہ اقبالؒ کی شخصیت شاعری اور افکار و خیالات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گزشتہ تیس سال سے اورینٹل کالج اقبال شناسی کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ ایم۔اے اردو اور فارسی کی جماعتوں میں علامہ اقبالؒ کا خصوصی مطالعہ گزشتہ تیس سال سے شامل ہے اور بلا مبالغہ حکیم الامت کی شخصیت اور شاعری اور فکر و فلسفہ پر ہزارہا لیکچر اورینٹل کالج کے اساتذہ اب تک دے چکے ہیں۔ اور اب بھی دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی طلباء و طالبات نے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے لئے علامہ اقبالؒ کے مختلف پہلوؤں پر سینکڑوں کی تعداد میں تھیسز اور مقالے لکھے ہیں اور بعض اساتذہ نے تو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مطالعہ اقبالؒ کے لئے وقف کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں اقبالؒ پر اُن کے ان گنت ایسے گراں قدر مقالات چھپ کر سامنے آئے ہیں جو اقبال شناسی میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، اور جن کو اقبالیات کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بظاہر اس دعوے میں خود ستائی اور تعلی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن ایمان کی بات یہ

ہے ، اور اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا، کہ اورینٹل کالج اقبالؒ شناسی میں اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی یہ حقیقت بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی گئی ہے۔

جشن اقبالؒ کے مبارک موقع پر اورینٹل کالج سے شائع ہونے والے اس مجموعے کے لئے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جن پروفیسروں اور عالموں نے پیغامات بھیجے، خطوط ارسال کئے، مقالات لکھے اور اپنی علمی کاوشوں سے اس مجموعے کو بین الاقوامی حیثیت دے کر وقیع بنایا، وہ سب کے سب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں اور اورینٹل کالج کے سربراہ کی حیثیت سے اس تعاون کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان اُستادوں اور پروفیسروں کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوش گوار فرض ہے، جن کی شائع شدہ تحریریں اس مجموعے کی زینت ہیں۔

اس کو علامہ اقبالؒ کے نام کی برکت سمجھنا چاہیئے کہ اپنے محدود وسائل کے باوجود اورینٹل کالج نے اقبال شناسی سے متعلق ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا، جس کو نہ صرف لوگ اس وقت دلچسپی سے پڑھیں گے بلکہ جس کو ہمیشہ ہمیشہ سینت کر رکھیں گے کیوں کہ اس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، اقبال شناسی سے متعلق علمی استفادے کا وافر سامان ضرور موجود ہے۔

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
۲۵ ر دسمبر ۱۹۷۷ء

عبادت

(۲۳)

خُطوطِ عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے خطوط ہماری قومی اور ثقافتی تاریخ کا نہایت ہی گراں قدر سرمایہ ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم سرسید کے ہمدم و دمساز اور قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے رفیق و ہم کار تھے۔ انہوں نے متعصب ہندوؤں سے اردو کی لڑائی لڑی، اور اس طرح تہذیبی و ثقافتی سطح پر تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا۔ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں نے ان کے اس اہم قومی کام کو سراہا ہے اور اس کو تحسین و آفرین کی نظروں سے دیکھا ہے۔ ان کے اس کام کی تفصیل و جزئیات کی صحیح تصویر ان کے ایسے خطوط میں نظر آتی ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں اپنے دوستوں اور ہم عصروں کو لکھے ہیں۔

یہ خطوط ابھی لاکھوں کی تعداد میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں، ان کو تلاش کر کے شائع کرنا ایک قومی خدمت ہے۔ کیونکہ ان سے سر سید احمد خان کے ایک اہم رفیق کار، اسلامیان ہند کی تہذیب و ثقافت کے ایک بہت بڑے علم بردار، تحریک پاکستان کے ایک عظیم رہنما اور اردو کے ایک جاں باز سپہ سالار کے خیالات و نظریات اور کارہائے نمایاں کی تفصیل و جزئیات ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی احساس کے پیش نظر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مولوی صاحب مرحوم کے جو خطوط اہم شخصیتوں کے پاس محفوظ ہیں، انہیں حاصل کر کے شائع کیا جائے۔ خاصی تعداد میں مختلف لوگوں سے خطوط حاصل کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب کے نام جو خطوط انہوں نے لکھے ہیں، ان کو شائع کیا جا رہا ہے، میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کا شکر گزار ہوں، کہ انہوں نے از راہِ نوازش نہ صرف سب سے پہلے مولوی صاحب کے خطوط مجھے عنایت فرمائے بلکہ ان کی شخصیت اور خطوط پر ایک گراں قدر مضمون بھی لکھا۔ اس مضمون سے مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کے خطوط کے مختلف پہلوؤں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کے نام مولوی صاحب مرحوم کے جو خطوط اس وقت شائع کئے جا رہے ہیں، ان میں سے بیشتر حیدر آباد دکن سے لکھے گئے ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم کی زندگی میں قیام حیدر آباد کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ریاست حیدر آباد میں حکمرانی تو نظام حیدر آباد کی تھی لیکن تعلیمی، علمی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں مولوی عبدالحق صاحب کا سکہ چلتا تھا۔ انہوں نے اس زمانے میں

انجمن ترقی اردو کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اردو ادب کی قدیم قلمی اور مطبوعہ کتابیں خرید خرید کر انجمن کے کتب خانۂ خاص میں داخل کیں اور شعرا کے دیوان، تذکرے، اور اردو سے متعلق بعض بہت ہی اہم کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کو عملی جامہ پہنایا۔ ان میں سے بیشتر کو انہوں نے خود مرتب کیا۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کے قیام میں انہوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پہلے پروفیسر مقرر کئے گئے اور انہوں نے اس حیثیت سے بھی جامعہ عثمانیہ میں اُردو زبان و ادب کی تحقیق اور تدریس کا اعلےٰ معیار قائم کیا۔

یہ خطوط ان تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں، اور اس طرح ان سے مولوی صاحب مرحوم کی زندگی کے سب سے اہم دور کی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب خوش قسمت ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے انہیں یہ خطوط لکھے، اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ چغتائی صاحب نے ان خطوط کو محفوظ رکھا، اور حوادث زمانہ کا شکار ہونے سے بچایا۔ نادر و نایاب چیزوں کو محفوظ کرنے میں چغتائی صاحب کو کمال حاصل ہے۔ ان کی ساری زندگی تہذیبی اور ادبی اعتبار سے نادر و نایاب چیزوں کو جمع کرتے ہوئے گزری ہے، اور خدا جانے کتنے انمول خزانے انہوں نے اپنے پاس محفوظ کر رکھے ہیں۔ اورینٹل کالج ان کا ممنون احسان ہے کہ انہوں نے ایک بیش بہا خزانہ اس کو اشاعت کے لئے عطا فرمایا۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ ان کی سادہ مزاجی

اور درویشی کی مثال اس دور میں نہیں مل سکتی۔ علمی کام کی جو لگن ان کے پاس ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ قدیم فن تعمیر کے ماہر ہیں۔ دوسرے فنون لطیفہ پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ فارسی اور اردو ادبیات اور اسلامی تاریخ و فکر سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف اور مضامین و مقالات علمی اعتبار سے ہمارے لئے ایک بہت بڑا سرمایہ ہیں

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے ان کے اندر ایک جوہر قابل کو دیکھا تھا۔ اور اس لئے وہ ان پر شفقت فرماتے، اور ہمیشہ ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کی رائے چغتائی صاحب کے بارے میں بہت اچھی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ "عبداللہ چغتائی بہت پر لطف آدمی ہے۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک خوبی ایسی ہے جو کسی کو نصیب نہیں۔ کتابوں کو محفوظ کرنے اور ان کی نمائش کے فن کو جس طرح یہ شخص جانتا ہے، کوئی اور نہیں جانتا" یہی وجہ ہے کہ ایسے کاموں کے لئے مولوی صاحب مرحوم ہمیشہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ ریاست حیدر آباد میں اور پھر پاکستان میں مختلف کانفرنسوں کے مواقع پر مولوی عبدالحق صاحب نے نمائشوں کا انتظام ہمیشہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے سپرد کیا۔ ان خطوط کے ساتھ جو تین تصویریں شائع کی جا رہی ہیں، ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب اس اعتبار سے ان کی کتنی قدر کرتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کے نام ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے یہ خطوط دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور ان میں ہمارے علمی، تعلیمی، تہذیبی، ادبی اور لسانی پہلوؤں کا جو بیش بہا خزانہ محفوظ ہے،

اس سے علم و ادب کے طالب علموں کو علمی اور تحقیقی اعتبار سے استفادے کا موقع بھی ملے گا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۶ر جولائی ۱۹۷۷ء

عبادت

۲۴ اقبالؒ کی اُردو نثر

علامہ اقبالؒ ایک عظیم شاعر ہیں۔ اُنہوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی ہے اور انسان کو بلندی سے ہم کنار کرنے کا ایک مکمل لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ وہ عظمت انسانی کے قائل ہیں۔ اسی لئے وہ انسان کو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ غلط نظامِ اقدار نے جس طرح انسانیت کو زخموں سے چُور کر دیا ہے، وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں لیکن اپنی مثبت اور جان دار فکر سے اس کے زخموں پر مرہم بھی رکھتے ہیں۔ وہ مشرق کے شاعر ہیں، ملّتِ اسلامیہ کے مغنّی ہیں۔ انہوں نے اسلامیانِ ہند کے معاملات و مسائل کی ساری تفصیلات و جزئیات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔

بین الاقوامی سیاست، ملکی و قومی معاملات، طبقاتی تفریق کو مٹا دینے کے خیالات اور ایک نئے نظامِ اقدار کے نتیجے میں مساوات کو عام کرنے کے تصوّرات ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ اُنہوں نے فکرِ اسلامی کے اسرار و رموز اس لیے کھولے ہیں کہ انسانی زندگی حریّت اور مساوات کے خیالات سے آشنا ہو اور اس طرح یہ حیات انسانی ایک دفعہ پھر جنّتِ ارضی کا روپ اختیار کرلے۔ اُنہوں نے ان خیالات و نظریات اور افکار و تصوّرات اور اس سلسلے کے متنوّع اور مختلف موضوعات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کے ہاں حسن و جمال کی دنیائیں آباد ہو گئی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ اسلامیانِ ہند بیسویں صدی کو عہدِ اقبالؒ سمجھتے ہیں اور اس عہد میں وہ اقبال اور کلامِ اقبال سے زندگی کا شعور اور حسن و جمال کا ذوق حاصل کرتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے کلامِ اقبالؒ کو اپنے دلوں میں جگہ دی ہے، اس کو اپنے حواس پر طاری کیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنے کاروانِ حیات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال اور کلامِ اقبال اسلامیانِ ہند کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی معاملات و مسائل کو سلجھانے کے لئے ایک بہت بڑا سہارا رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری قومی و ملّی زندگی کی رگوں میں نیا خون دوڑایا ہے اور اس کو ذہنی و فکری اور جذباتی و جمالیاتی اعتبار سے انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ ان کی شاعری کی ساحری ہے، لیکن ان کی نثر نگاری بھی اس اہم کام کو انجام دینے میں پیچھے نہیں رہی۔ ان کی

نثر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور وہ اقبالؒ کی عظیم شخصیت کا صحیح آئینہ ہے۔ اس میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی شاعری میں ہے۔ ان کے افکار و خیالات اور نظریات و تصوّرات ان کی نثر میں بھی پوری طرح واضح ہوتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان سب کی تفصیل اور جزئیات ہمیں ان کی نثر ہی میں ملتی ہیں۔ چونکہ نثر میں تحلیل و تجزیہ کی نسبتاً زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے اقبال کا مفکّرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح رونما کرتا ہے۔ پھر ان کی نثر میں موضوعات کا جو تنوّع ہے، فکر کی جو گہرائی ہے، خیال کی جو بلندی ہے، اظہار کی جو جمال آفرینی ہے، وہ اس کو خاصے کی چیز بنا دیتی ہے۔ اقبال کی مفکّرانہ اور شاعرانہ عظمت سے صحیح طور پر آشنا ہونے کے لئے یہ نثر ایک بہت بڑا ذریعہ بلکہ سہارا ہے۔

اقبالؒ نے نثر میں باقاعدہ کتابیں بھی لکھی ہیں، مضامین و مقالات بھی تحریر کئے ہیں اور ان کے خطوط کا بھی ایک خاصا بڑا سرمایہ موجود ہے اور مجموعی طور پر یہ تمام تحریریں مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ابھی تک علامہ اقبال کی نثر کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کی اہمیت کے چہرے سے نقاب نہیں اُٹھائی گئی ہے۔ ابھی تک اس حقیقت کو بھی واضح نہیں کیا گیا ہے کہ ان کی نثر میں ایک ایسا اسلوب موجود ہے جو ان کے موضوعات کے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ تخلیقِ حسن کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ اس اسلوب کی انفرادیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور اردو نثر کی روایت میں — خصوصاً بیسویں صدی کی روایت میں — اس کا ایک خاص مرتبہ ہے۔

میں نے اسی احساس کے پیشِ نظر علامہ اقبال کی نثر نگاری کے تجزیئے کے کام کو اپنے ذمّے لیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ علامہ اقبال کی نثر کا ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ تیار ہو جائے تاکہ پڑھنے والے اس کی اہمیت سے آشنا ہوں اور اُنہیں اس حقیقت کا اندازہ ہو کہ نظم اور شاعری کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی نثر بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ اور جو کارنامے ان کی شاعری نے انجام دیئے ہیں، وہی کارنامے ان کی نثر بھی انجام دیتی رہی ہے۔

آسانی کے خیال سے میں نے علامہ اقبال کی نثر کے اس تحقیقی و تنقیدی جائزے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے:

پہلا باب تمہیدی ہے اور اس میں نثر نگاری اور اسلوبِ نثر کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں علامہ اقبال کی نثر کے بنیادی خد و خال نمایاں ہو سکتے ہیں۔

دوسرے باب میں عہدِ اقبال یعنی بیسویں صدی میں اُردو نثر کے رجحانات کا تجزیہ ہے تاکہ وہ منظر اور پس منظر سامنے آسکے جو روایت اور تجربے کی صحیح صورتِ حال کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ضروری ہے۔ اقبال کی نثر بھی اسی عہد کی پیداوار ہے اور انہوں نے روایت اور تجربے کی ہم آہنگی سے اس عہد میں جس اسلوبِ نثر کی تشکیل کی ہے اس کی صحیح اندازہ دانی اسی منظر اور پس منظر کو سامنے رکھ کر کی جاسکتی ہے۔

تیسرے باب میں علامہ اقبال کی تصانیفِ نثر کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس جائزے کا اہتمام اس خیال سے کیا گیا ہے کہ جو کچھ علامہ اقبال نے نثر میں پیش کیا ہے، اس سے پڑھنے والوں کو آشنا ہونے کا موقع ملے۔ اس کو علامہ اقبال کی تصانیفِ نثر کا ایک تعارف بھی کہا جاسکتا ہے۔

اسی وجہ سے اس میں اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ تنقید اور تجزیہ کے پہلو کو شعوری طور پر اس میں نمایاں نہیں کیا گیا۔ تنقید اور تجزیئے کے پہلو چوتھے اور پانچویں باب میں زیادہ نمایاں ہیں کیونکہ ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کی نثر نگاری کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اس طرح ہو جائے کہ اُس کے تمام نشیب و فراز نہ صرف پڑھنے والے کے سامنے آجائیں بلکہ اس کے ذہن و فکر کا حصہ بھی بن جائیں۔

چوتھے باب میں ان کے موضوعات نثر کا تنقیدی جائزہ ہے۔

پانچویں باب میں اُن کے اسلوب نثر کی تنقیدی وضاحت ہے۔

چھٹے باب میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ اُردو نثر کی روایت میں علامہ اقبال کی نثر نگاری کی کیا اہمیت ہے اور یہ کہ اس روایت میں ان کی نثر کا مرتبہ کیا ہے۔

یہ جائزہ ایک نہایت معمولی سی تحقیقی، تنقیدی اور ادبی کوشش ہے۔ اس کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس میں اس بات کی کوشش ضرور کی گئی کہ علامہ اقبال کی عظیم شخصیت جس طرح ان کی نثر میں ظاہر ہو رہی ہے، کسی حد تک اس کی وضاحت ہو جائے، اور ان کی عظیم شخصیت نے جس طرح اس نثر کو عظیم بنایا ہے، اس کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے۔ اس کوشش نے اس جائزے کو علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی نثر نگاری دونوں کا ایک جائزہ بنا دیا ہے، اور اس جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی نثر نگاری اُن کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۲۵ راپریل ۱۹۷۷ء

۲۵

جشنِ اقبالؒ

یہ رپوتاژ دہلی کے اس سفر کی روداد ہے جو مجھے نومبر ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبالؒ کے جشنِ صد سالہ کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی غرض سے کرنا پڑا۔ اقبال کی نسبت سے یہ سفر میرے لئے حد درجہ اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر میں اس کی مفصل روداد لکھنے کے لئے آمادہ ہوا۔ میں نے اس کو ڈوب کر نہایت ذوق وشوق کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ روداد ایک حکایت لطیف بن کر رہ گئی ہے اور جس کو میں لذیذ ہونے کے باعث دراز تر کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔

علامہ اقبالؒ سے محبت کرنے والوں کے لئے اس میں دلچسپی کا خاصا

سامان ہے۔ کیونکہ یہ ایک سیمینار کی روداد ہی نہیں، ایک ایسے شخص کے جذبات و احساسات کا مرقع بھی ہے جو دلی کو مسلم تہذیب کی عظیم علامت سمجھتا ہے اور جس کے بارے میں علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اس کے ذرے ذرے میں اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے، اور جس کی خاک میں خیرالامم کے تاج دار سوتے ہیں۔ اس شخص کے خیال میں دلی کی سرزمین پر اقبالؒ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات کی عظمت، برصغیر کی مسلم تہذیب، اسلامی فکر اور پاکستانی نظریے کی اہمیت کا اعتراف تھا۔

اس رپورتاژ میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن پڑھنے والا اس کو پڑھ کر یہ ضرور محسوس کرے گا کہ وہ دلی کے اس سفر میں نہ صرف میرا ہم سفر تھا بلکہ میرا ہم نشین اور ہمدم و ہم راز بھی تھا۔

عبادت بریلوی

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سید حیدر بخش حیدری دہلوی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں میں اردو نثر کی سب سے زیادہ کتابیں تالیف کیں اور نہ صرف ترجمے تک اپنے آپ کو محدود رکھا بلکہ طبع زاد کتابیں بھی لکھیں۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز بھی تھے۔ اور اس اعتبار سے ان کا ادبی مرتبہ میر امن دہلوی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن یہ عجیب بات

ہے کہ ان پر ابھی تک کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوا۔ ان کی بیشتر کتابیں بھی سلیقے سے مرتب کر کے شائع نہیں کی گئیں ــــ بلکہ بعض اہم کتابوں کے بارے میں تو یہ تک لکھ دیا گیا کہ انھوں نے یہ کتابیں لکھی ضرور تھیں لیکن اب ان کا کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔

گلزار دانش ان کی ایک اہم کتاب ہے لیکن اس کے متعلق تقریباً تمام ادبی مورخوں نے یہی لکھا کہ کتاب اب ناپید ہے اور دنیا میں کہیں اس کا وجود نہیں ہے۔

سید محمد نے اس کتاب کے بارے میں اپنی کتاب "ارباب نثر اردو" میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل لکھا تھا:

"ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اور نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ حیدری نے یہ ترجمہ کس سنہ میں تمام کیا۔ عنایت اللہ کی بہار دانش کئی سو صفحات کا ایک نیم تاریخی قصہ ہے اور اس میں بہرام شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقے اور جہاں دار شاہ کی مہموں اور مبارزہ طلبیوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۱ھ ہے اور مولف نے دیباچے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ یہ قصہ اس کی اپنی ایجاد یا اختراع پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نے کسی نوجوان برہمن کی زبانی یہ حسن و عشق کی کہانی سنی تھی، جس نے اس کو فارسی میں تالیف کر دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل فارسی تالیف کا ایک نسخہ ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ بھی مولوی یافعی صاحب کے کتب خانے سے حاصل ہوا۔ مگر افسوس کہ حیدری کا ترجمہ نہیں ملا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے طبع نہیں ہوا۔

حیدری کے دوسرے کارناموں کی طرح اس کو کچھ زیادہ شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں۔[1]"

اور مولانا حامد حسن قادری نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے۔ اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں انہوں نے لکھا تھا:

"گلزارِ دانش، شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہارِ دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۶۵۱ء مطابق ۱۰۶۱ھ میں ہوئی ہے۔ یہ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں، سچا واقعہ ہے۔ بہر حال حیدری کی گلزارِ دانش بھی اب گم ہے۔[2]"

ان دو اہم ادبی مورخوں کے ان بیانات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حیدری کی گلزار دانش کے متعلق گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں بھی یہی خیال عام رہا کہ حیدری نے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں لکھی ضرور تھی لیکن نہ تو وہ شائع ہوئی نہ اس کا کوئی قلمی نسخہ محفوظ رہ سکا ــــ اور اردو ادب کے مؤرخ اور محقق یہی سمجھتے رہے کہ یہ کتاب ضائع ہو گئی۔ لیکن میرا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا، اور جب بھی میں اس کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے دل میں اس خیال کی ایک لہر سی اُٹھتی تھی کہ اس کا کوئی

---

[1] سید محمد: ارباب نثر اردو: صفحات ۸۴ - ۸۵

[2] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) صفحہ ۹۶

نہ کوئی نسخہ، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کتب خانے میں ہوگا ضرور — چنانچہ میں نے اس کی تلاش جاری رکھی لیکن تیس سال تک مجھے بھی اس کا سراغ نہ ملا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی مجھے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں پانچ سال تک اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ لندن کے دوران قیام میں انگلستان اور یورپ کے دیگر کتب خانوں میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ اور مجھے وہاں بعض عجیب و غریب اور نادر و نایاب کتابیں دستیاب ہوئیں۔ جن میں سے کچھ تو شائع ہو چکی ہیں، اور کچھ طباعت و اشاعت کی مختلف منزلیں طے کر رہی ہیں۔

انہی نادر و نایاب کتابوں میں سید حیدر بخش حیدری دہلوی کی ضخیم کتاب گلزار دانش بھی ہے جس کا قلمی نسخہ مجھے یورپ کے ایک کتب خانے میں ملا — یہ نسخہ کس طرح دستیاب ہوا اس کی داستان نہایت دلچسپ اور لذیذ ہے — اسی لئے اس کو دراز تر بنا کر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک روز میں برٹش میوزیم لندن میں مختلف ممالک کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ رہا تھا کہ میری نظر سے ایک ایسی کیٹلاگ گذری جو ڈینش زبان میں تھی اور جس کو میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں اس کی ورق گردانی کرتا رہا اس خیال سے کہ شاید اس میں کسی فارسی یا اردو کتاب کا نام مل جائے چنانچہ اس کیٹلاگ کے آخری حصے میں مجھے ایسے نام نظر آئے جو برعظیم پاک و ہند سے تعلق رکھتے تھے۔

میں نے اس حصے کو بغور دیکھا تو مجھے اس میں ایک جگہ بہار دانش کا نام نظر آیا۔ ایک جگہ حیدری اور گلزار دانش کا نام بھی ملا۔ لندن میں اُس وقت کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ڈینش زبان سے انگریزی میں اس عبارت کا ترجمہ

کرتا ۔حیدری اور گلزار دانش کے نام رومن میں چھپے ہوئے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور یہ حیدری کی گلزار دانش کا قلمی نسخہ ہے جس کا ذکر اس کیٹلاگ میں کیا گیا ہے مجھے اس نسخے کی ایک زمانے سے تلاش تھی ۔اس لئے مجھے اس خیال سے بے حد خوشی ہوئی کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

یہ فہرست کوپن ہیگن کے شاہی کتب خانے کی تھی جس کا نام ڈینش زبان میں DET KONGLIEGE BIBLITEQUE تھا۔چنانچہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کتب خانے کے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھ کر اس کتاب کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کی جائے۔میں نے خط لکھا ۔ایک ہفتے کے اندر یہ جواب آیا کہ ہمارے کتب خانے کے ہندوستانی کمشن میں ایک قلمی کتاب موجود ہے لیکن یہ فارسی میں ہے۔میں مایوس ہو گیا اور یہی قیاس کیا کہ یہ عنایت اللہ کی کتاب بہار دانش ہو گی ۔لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا کیونکہ کٹیلاگ میں کئی جگہ حیدری اور گلزار دانش کے نام بھی پڑھے جاتے تھے۔اس لئے میں نے یہ سوچا کہ مجھے کوپن ہیگن جا کر اس کتاب کو دیکھنا چاہیئے چنانچہ میں نے کوپن ہیگن کا سفر کیا۔ شاہی کتب خانے میں پہنچا۔ وہ کتاب نکلوائی —— اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ تو سیّد حیدر بخش حیدری دہلوی کی اُردو کتاب گلزار دانش کی دونوں مکمل جلدیں تھیں۔اس قلمی نسخے کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہے۔

گلزار دانش کا قلمی نسخہ خاصا ضخیم ہے ، بڑے سائز کے پانسو سینتیس ۵۳۷ اوراق پر پھیلا ہوا ہے جن میں کتابت شدہ صفحات کی کل تعداد دس سو تہتر (۱۰۷۳) ہے۔اس کی دو جلدیں ہیں۔پہلی جلد میں دو سو باون (۲۵۲) اوراق

یعنی پانسو چار (۵۰۴) صفحات ہیں۔ دوسری جلد دوسو پچاسی (۲۸۵) اوراق کی ہے۔ اس میں پانسو انہتر (۵۶۹) صفحات ہیں۔ کتاب صفحہ پانسو انہتر (۵۶۹) پر ختم ہو جاتی ہے۔ صفحہ پانسو ستر (۵۷۰) خالی ہے۔ نسخہ خوشخط لکھا ہوا ہے۔ خط روشن نستعلیق ہے لیکن کاتب کا نام اور کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں مرزا کاظم علی جواں اور رائے کھیم نرائن رند کے کہے ہوتے قطعات تاریخ درج ہیں جو مقدمے میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ جواں کے قطعے سے سال بارہ سو چودہ (۱۲۱۴ھ) اور رند کے قطعے سے سال بارہ سو پندرہ (۱۲۱۵ھ) حاصل ہوتا ہے۔ پہلے مادۂ تاریخ میں گیارہ (۱۱) کا اور دوسرے میں چار (۴) کا تخرجہ ہے۔ حیدری نے اپنے دیباچے میں تالیف کا سال بارہ سو اٹھارہ (۱۲۱۸ھ) مطابق اٹھارہ سو چار (۱۸۰۴) عیسوی بتایا ہے۔ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں اسے آخری شکل دی گئی اور اس کی کتابت کرائی گئی۔ اس ضخیم کتاب کا یقیناً یہی کتابت شدہ نسخہ ہے جو ہمیں ملا ہے اور دنیا میں اس کا یہ واحد نسخہ ہے جو ہم شائع کر رہے ہیں۔

دونوں جلدوں کے آخری صفحات پر انگریزی میں ٹامس روبک کے دستخط ہیں اور انگریزی کی یہ عبارت بھی ملتی ہے:

PRESENTED TO T. ROEBUCK BY GEORGE SWINTON ESQ CALCUTTA APRIL 1811.

روبک کے متعلق اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر سے دلچسپی لینے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج سے متعلق تھا اس نے اس کالج سے متعلق ایک جامع کتاب ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM لکھی تھی جو اب آسانی سے نہیں ملتی ــــ صرف انڈیا آفس اور برٹش

میوزیم میں اس مطبوعہ کتاب کے نسخے نہایت خستہ حالت میں موجود ہیں۔ جارج سوئنٹس GEORGE SWINTON جس نے گلزار دانش کا یہ نسخہ ٹامس روبک کو ۱۸۱۱ء میں پیش کیا، کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہدہ دار تھا۔ یہ حیدری کا معاصر تھا۔

حیدری نے اس قلمی نسخے کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد یہ معلومات فراہم کی ہے:

بعد اس کلام متبرک کے صاحب دانش و بینش پر ظاہر ہو کہ کتاب بہار دانش کو شیخ عنایت اللہ طوطیٔ سخن نے ایک برہمن بچۂ حسین و مہ جبین کے کہنے سے تصنیف کیا تھا۔ اور محمد صالح جو اس والا جوہر سے نسبت ہم گوہری اور شاگردی کی رکھتا تھا۔ اس نے بھی ایک دیباچہ اپنی موزونیٔ طبع کے ساتھ عبارت رنگین و خوب و بندشِ الفاظ دلچسپ و مرغوب کے تصنیف کر کے اس کتاب میں داخل کیا تھا ــــ اب اس ذرّہ بے مقدار، خاک پائے آل احمد مختار، صلوات اللہ علیہ و آلہ الاجمعین سید حیدر بخش آمادہ بے ہنری متخلص بہ حیدری، ساکن دلّی، خلف سیّد ابو الحسن نجفی کے، عہد میں ظل سبحانی ابن عالمگیر ثانی شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ کے دورِ حکومت میں، افتخار بصیرتِ جہاں و استظہارِ سخنورانِ دوراں، معدنِ عدل و انصاف، اشرف الاشراف، زبدۂ نوآیینانِ عظیم الشان، مشیرِ خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام افضالہٗ کے سنہ بارہ سو اٹھارہ ہجری مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی کے، فرمانے سے صاحب والا شان ارسطوئے

زماں و فلاطون حشم مخزن لطف و کرم مسٹر ولیم ہنٹر دام اقبالہ کے موافق اپنی طبع کے زبانِ ریختہ میں ترجمہ کیا اور نام اس کا گلزار دانش رکھ کر اہلِ دانش و بینش کی نذر گذارنا"۔ [1]

حیدری کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ گلزار دانش کا یہ قلمی نسخہ شیخ عنایت اللہ کی فارسی کتاب بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے جس کو انہوں نے ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۲۱۸ھ ـــــ ۱۸۰۴ء میں کیا اور اس کا نام گلزار دانش رکھا۔ ایک زمانے تک یہ نسخہ گوشۂ گمنامی میں رہا اور اردو ادب کے مورخوں اور محققوں تک کو اس کا علم نہ ہو سکا، اور وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ یہ کتاب ضائع ہو گئی ہے اور اب دنیا میں کہیں اس کا وجود نہیں ہے لیکن اس نسخے کی دریافت نے ان کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔

میں نے اس نادر و نایاب قلمی نسخے کا تعارف اورینٹل کالج میگزین شمارہ مسلسل ۱۸۸، ۱۸۹ جلد ۴۸، عدد ۱، ۲، مارچ، جون ۱۹۷۲ء میں کرایا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جلد اس کے متن کو مکمل طور پر شائع کر دیا جائے گا چنانچہ اب اس خیال سے کہ یہ نسخہ معنی و اسلوب نثر کے اعتبار سے حد درجہ اہمیت رکھتا ہے اور اس میں اردو زبان و ادب کے استادوں اور طالب علموں کے لئے دلچسپی کا خاصا سامان ہے، اس کو ایک نئی ادبی دریافت سمجھ کر مناسب تصیح و تحشیہ کے ساتھ مکمل طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

اورینٹل کالج لاہور

دسمبر ۱۹۷۳ء — عبادت بریلوی

---

[1] حیدری: گلزار دانش قلمی نسخہ ص ۲، ۳

سید حیدر بخش حیدری دہلوی کی اہمیت کو بہت کم لوگوں نے جانا اور ان کے ادبی مقام کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے بارے میں ہماری تحقیق اور تنقید دونوں لکیر کی فقیر رہی ہیں۔ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ انہیں صرف توتا کہانی اور آرائش محفل کے مؤلف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں کا ابھی تک کسی کو علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان میں سے بیشتر یورپ کے مختلف کتب خانوں میں ایک عالم کس مپرسی میں پڑی ہیں۔ ان کتابوں کا شائع کرنا تو درکنار ان میں سے بیشتر کا تو دیکھنا بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ انگلستان کے دوران قیام میں مجھے خاصی تعداد میں ان کی ایسی کتابیں ملی ہیں جن کا اس سے قبل بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ یہ کتابیں انہیں اپنے زمانے کا سب سے اہم مصنف ثابت کرتی ہیں اور ان سے اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ کے انشا پرداز اور ایک اعلیٰ درجے کے تخلیقی فن کار تھے۔ یہ بات بھی ان تصانیف سے واضح ہوتی ہے کہ ان کا قلم صرف ترجمے ہی تک محدود

نہیں رہا، طبعزاد تخلیقات کے میدانوں میں بھی اس نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تصانیف کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ اس لئے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادیب اور فن کار کی حیثیت سے ایک پہلودار اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی داستان گوئی اور افسانہ نگاری شاعری اور تذکرہ نویسی سب اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف مصنف ہونے کے باوجود ان پر جیسا کام ہونا چاہیئے تھا، وہ نہیں ہو سکا ہے۔ بہت کم لکھنے والوں نے ان کے حالات کا سراغ لگایا ہے اور ان کے ادبی مرتبے کی اندازہ دانی کی ہے۔ ان کے حالات کی تفصیل خود ان کے ہم عصروں کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ شاعر تھے اور انہوں نے عنفوان شباب ہی میں شاعری شروع کر دی تھی[1] لیکن ان کے زمانے کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نواب علی ابراہیم خلیل خاں خلیل ان کے محسن اور مربی تھے اور حیدری نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا تھا لیکن تذکرۂ گلزار ابراہیم میں خلیل نے حیدری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مرزا علی لطف ان کے ہم عصر اور فورٹ ولیم کالج میں ان کے رفیق کار تھے لیکن لطف کا تذکرہ گلشنِ ہند بھی حیدری کے ذکر سے خالی ہے۔ اردو شاعروں کے صرف تین تذکرے ایسے ہیں جن میں حیدری کا ذکر موجود ہے۔ ایک تو بینی نارائن جہان کا تذکرہ دیوان جہان دوسرا عبدالغفور نساخ کا تذکرہ سخن شعراء اور تیسرا

---

[1] دیوان حیدری: (غیر مطبوعہ) قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ

کریم الدین کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند بینی نارائن جہان نے اپنے تذکرے میں ان کے متعلق صرف یہ لکھا ہے :

"حیدری تخلص : نام میر حیدر بخش ، دلّی کے رہنے والے، بالفعل مسندِ حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی ہے اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں۔"[1]

اور عبدالغفور نساخ نے صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے :

"حیدری تخلص حیدر بخش دہلوی۔ ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی آرائش محفل یعنی ہفت سیر حاتم نظر سے گزری۔"[2]

کریم الدین نے طبقاتِ شعرائے ہند میں کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات بیان کئے ہیں لکھتے ہیں :

منشی سید حیدر بخش حیدری تخلص، متاخرین میں سے ہے۔ وہ ایک متاخر مصنف ہے جس نے بہت سی کتابیں بنائی ہیں۔ طوطا کہانی کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ اوس نے علی ابراہیم خاں سے جو ۱۸۰۱ء میں مرا تھا، تعلیم پائی۔ اور وہ مولوی غلام حسن غازی پوری کا بھی شاگرد تھا۔ بینی نارائن بیان کرتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء میں موجود تھا اور اس سے واقفیت رکھتا ہے۔ سوا اکثر نظم کے اس کی تصنیف سے یہ ہیں۔ ایک طوطا کہانی۔ یہ قصہ ایک مغلق عبارت میں ضیاء الدین نخشبی نے تصنیف کیا تھا مگر

---

[1] بینی نارائن جہاں : دیوان جہان قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن صفحہ ۵۰۔ ۵۱

[2] نساخ : سخن شعرا، مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۴۳

محمد قادری نے کچھ مختصر کر کے سہل عبارت میں تصنیف کیا۔ اور حیدری نے اس کتاب سے اپنا ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کا ترجمہ شائستہ اوس کے ہے اور اوس میں نظم اور نثر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے اصل اس کتاب کی ایک کتاب سنسکرت میں سکھا سینتی ہے۔ حیدری نے اس کتاب کو درمیان ۱۲۱۵ھ کے تصنیف کیا تھا۔ اور ایک ترجمہ اردو قصہ حاتم طائی کا نثر اور نظم آمیز اس کی تصنیف ہے۔ ایک ترجمہ اس کا ڈنکن فوبؔ[1] نے انگریزی ترجمہ تیار کیا ہے۔ اس ترجمے کا نام آرائش محفل ہے۔ یہ ترجمہ درمیان ۱۲۱۴ھ کے تیار ہوا تھا مگر ہندوستانی اپنے خیالات درباب ترجمہ اتنے بھڑاتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ترجمہ نہیں رہتا بلکہ اس کی ایک علیٰحدہ تصنیف مثل اول کے تصور کرنا چاہیئے۔ تیسرے گل مغفرت اس میں ان شہدا کا بیان ہے جو پیغمبرِ خدا سے امام حسین علیہ السلام تک گزرے ہیں۔ یہ کتاب ایک ترجمہ روضۃ الشہدا کا ہے جس کو گلشنِ شہیداں بھی کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ میں تیار ہوا تھا۔ یہ کتاب بہ خواہش مولوی سید حسین جون پوری کے تصنیف کی تھی۔ چوتھی کتاب گلزار دانش۔ یہ ایک ترجمہ بہار دانش کا ہے جو فارسی میں محمد مہدی نے لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ ولیم جونس نے انگریزی میں تیار کیا ہے۔ چھٹا مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی حیدر بخش نے ایک مختصر شاہنامہ اردو میں لکھا ہے۔ ایک مثنوی بہ نام ہفت

---

[1] ڈنکن فوربس

پیکراوس کی تصنیف ہے۔ یہ ایک قصّہ وہ ہے جس میں مضمون وہ
ہی ہے جو نظامی کی کتاب ہفت پیکر میں۔ ایک قصہ دکنی زبان میں
بھی ہے۔ بہ نام قصہ بہرام و گل اندام۔ وہ بھی اس طور کا ہے جو کہ
بدنصیب سلطان ابوالحسن آخری نواب گولکنڈہ کے، جس نے
شکست کھا کر اورنگ زیب کی قید میں مقید ہوا تھا، درمیان
۱۶۸۷ء کے۔"[1]

جدید دور میں سید محمد نے ارباب نثر اردو میں، حامد حسن قادری نے داستان
تاریخ اردو میں اور محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کا عہد میں حیدری کے
متعلق کچھ معلومات ضرور فراہم کی ہے لیکن ان کی زندگی، شخصیت، نثر نگاری
اور شاعری کے کسی نئے گوشے کو دریافت نہیں کیا ہے۔ حیدری کی غیر مطبوعہ
تحریروں میں جو نئی معلومات ملتی ہے، اس تک ان لکھنے والوں کی رسائی نہیں ہو
سکی ہے۔ اسی لئے اس میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

حیدری کے صحیح حالات کو معلوم کرنے کے لئے ان کی بعض غیر مطبوعہ اور
مطبوعہ تحریریں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل یہ تحریریں حیدری کی
زندگی اور شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔
میں نے انگلستان کے دوران قیام میں حیدری کی بعض ایسی غیر مطبوعہ تحریریں
کو دیکھا اور ان سے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔ سب سے پہلے یہ
تحریریں رسالہ ادب لطیف، لاہور کے جوبلی نمبر ۶۳ء میں حیدری کی دو غیر مطبوعہ
کہانیوں کے پیش لفظ کے طور پر شائع ہوئیں۔ پھر میں نے ان سے حیدری

---

[1] کریم الدین: طبقات شعرائے ہند، ص ۲۷۰۔ ۲۷۱

کی "مختصر کہانیوں[1]" کے مقدمے میں بھی کام لیا اور ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ نئی معلومات فراہم کی۔

یہ تحریریں حیدری کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان سب کو یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گلدستہ حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"احوال اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سید ابو الحسن والد اس فقیر نے دلی چھوڑی اور ہمراہی لالہ سکھ دیو رائے کی قبول کی تو بنارس میں تشریف لائے اور "پیچھے دلّی کے قصد اُدل سے بھولائے (بھلائے) اس وقت یہ ہیچ مدان نہایت خورد سال تھا لیکن زیر سایۂ دامن قبلہ وکعبہ کے آفاتِ فلکی کے از بس کہ بے خطر تھا۔ اس سن میں بھی مشتاق اہل کمال تھا۔ چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی۔ اور اس فقیر کی بھی حدِ بلوغیت کو پہنچی۔ اس عرصے میں امین الدولہ عزیز الملک نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل اسٹیٹن صاحب بہادر جلالت جنگ کے حاکمی بنارس کی قبول کر کے ساتھ عزو وقار کے مسندِ عدالت پر بیٹھے تو قبلہ گاہی نے اس قدر دان بخبا کی نوکری پر دل دیا اور اس کمترین کو واسطے تربیت اور خوشہ چینی کے اس خرمنِ سخن کے سپرد کیا۔ چنانچہ اس فقیر کو خدمت گزاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب دام اقبالہ کی پسند آئی اور شاگردی قبلہ وکعبہ

---

[1] مختصر کہانیاں: سید حیدر بخش حیدری۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت، شائع کردہ اردو دنیا کراچی ۱۹۶۴ء

کونین مولوی غلام حسین کی بھائی۔بیت

بہت سی میں نے کی یاں جبہ سائی جب ایسی گفتگو یہ مجھ کو آئی

اور صحبت سے نخل بند چمن دوستی سید جمعیت علی رضوی کی بھی اس عندلیب ہیچ مدان نے موافق اپنے فہم کے بہت سی کیفیت اُٹھائی ہے لیکن افسوس کہ گردش فلکی نے اس گلشن باغ مرتضوی سے نصیب کی جُدائی ہے۔ حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفضلات سے صاحبان عالی شان والا شان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک صورت اطمینان کی ہے۔اور مفارقت میں یارانِ قدیم اور دوستان ضمیم کے اوقات یونہی گزرتے ہیں۔ اس واسطے چند قصے زبان ریختۂ ہندی میں موافق اُردوئے معلٰے کے نثر کئے گئے۔ جیسے قصہ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصّہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصّہ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے۔ اور چند اشعار پریشان اور کئی مخمس و چند قطعے جو اس ہیچ مدان نے تصنیف کئے جو احاطۂ تحریر میں آئے۔ اور اس مجموعہ بے سر رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سروپا نے جمع کیا ہے نام اس اوراق پریشاں کا گلدستۂ حیدری[1] رکھا ہے۔ امیدوار لطف سے باریک بینوں کی یہ ہے

---

[1] گلدستۂ حیدری (غیر مطبوعہ) قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن، ص ۷

کہ اگر نکتہ سہو کا اس میں پاویں تو بہ موجب حدیث شریف الانسان مرکب من الخطاء والنسیان کو جائز الخطار سمجھ کر اصلاح کریں اور نکتہ گیری کو کام نہ فرماویں۔ بحق محمد و آلہ الامجاد۔ قطعہ:

جو ہوں اہل معنی اے بادِ نسیم یہ میری طرف سے انہیں تو سنا
کرو سیر گلدستۂ حیدری اگر جی میں رکھتے ہو کچھ بھی ہوا
کہ فضل خدا نے کیا ہے اسے گل نثر اور نظم سے لہلہا

مہر و ماہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

حمد کرتا ہوں اس بادشاہ قادرِ بےچوں کی جس نے اپنی قدرت کبریائی سے سلطان مہر و ماہ کو اوپر تخت فلک بے ستون کے ساتھ ندیمان سیاروں کے جلوہ گر کیا اور فیضان جمال بے مثال وحدانیت سے ہیژدہ ہزار عالم کو مخلوق کر کے اپنی عنایات صمدیت سے خصوصاً خلقت انسان کو اشرف المخلوقات خطاب دیا اور خلعت انواع انواع حسن و جمال کے دے کر سرفراز کیا۔ اور جاگیر اپنے عشق کی عطا کر کے عاشق و معشوق نام رکھا۔ کیا خدا ہے جل جلالہ وعم نوالہ ــــــ

اور نعت ہے اس رسول مقبول کی جس کو اس واحد ذوالجلال نے اپنے فضل و کرم سے افضل البشر خاتم الانبیاء کیا۔ اور اس کے واسطے زمین و آسمان کو پیدا کر کے لولاک لما خلقت الافلاک خطاب دیا صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ وسلّم۔ اور مدح ہے اس حیدر شہ سوار لافتی ساقی حوض کوثر کی جو حامیٔ روزِ جزا ہے اور دامادِ مصطفٰے ہے۔ اور مدح ہے اُن گوہرہائے دریائے رسالت کی کہ جو سرورِ سینۂ زہرائے اطہر ہیں اور شفیع روزِ محشر۔ صلواۃ اللہ علیہ وآلہ اجمعین۔

پس اس حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو ۱۲۱۴
بارہ سو چودہ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی اردوئے معلٰے کو مرغوب
طبع رکھتے ہیں اور اہل سخن کو از راہ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے
ہیں خصوصاً صاحب والا مناقب عالی مقام صدر نشیں محفل اہل
کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کہ جو بحر سخن وری
و سخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں اور موجد کلام شیریں سخنی کے
سر چشمۂ سخنوران۔

بہ دل دریا بہ کف چوں ابر نیساں	جہاں ہے فیض سے جس کے دُرافشاں
نہ ہوں اس کی شجاعت کے مقابل	اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف	وہیں ہو صفحۂ کاغذ زر افشاں
ہے اس کا نام نامی گلکرسٹ اب	جہاں ہے مہر جو اس کے سے تاباں
دعا مقبول ہو یہ حیدری کی	رہے دنیا میں خوش یارب وہ ہر آن

اس واسطے یہ دل مضمحل اس قصہ مہر وماہ کو باغ فصاحت و
بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر حضور پر نور اس صاحب موصوف
والاشان کے لایا ہے۔ یقین ہے کہ منظور نظر ہووے اور اگر کہیں
اس کی عبارت میں نامربوطیٔ الفاظ دکھائی دیوے تو اس کی درستگی کے
واسطے باغبان خامۂ د و زبان کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ
جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے۔
بحق محمدؐ و آل محمدؐ ...... قطعہ

منصفو! منصفی کی جا ہے یہ	میری محنت کی داد ٹک دو بجو
قصہ مہر وماہ کو میں نے	نثر کیوں کر کیا ہے دیکھو تو"

لیلیٰ مجنوں کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے تصنیف کی ہیں۔ اور ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ مجنوں کا جو لکھا ہے سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے۔ اور ہاتفی نے بھی اس قصۂ دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا۔ اور عبارت فصیح سے اس کے ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا اور اس قصے کو خواجہ یاسین شاہجہاں آبادی کہ شاعری میں یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسند حیات پر جلوہ گر ہیں بموجب فرمائش اطہر علی خاں مرحوم کہ مسٹر چیمبر صاحب نے حکم موصوف سے درخواست اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی خواجہ ممدوح نے زبانِ ریختہ ہندی میں حقیقت اس کی سابق عہد سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ سنہ سینتالیسواں جلوس بادشاہ موصوف سے ہے جناب صاحبِ عالیشان پشت پناہ دنیا و سخن سنجانِ بحر ہمت، گوہرِ مروت، کوہِ حشمت، مخزنِ سخاوت اعلیٰ دودمان، جان گلکرسٹ صاحب بہادر زید افضالہٗ نے اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چین خرمن علم کونین مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی عدالت و نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ تو اس قصۂ پُرسوز نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اردوئے معلیٰ کے ساتھ فصاحت و شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطۂ تحریر میں

لا۔ کیونکہ عبارت سلیس مفید ہے ان صاحبوں کے جو بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں۔ ان کی درستگی زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس کے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس کمترین ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اردوئے معلےٰ کے قصۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔ اور ہر ایک صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض اثر سے دیکھے۔ اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم ہے کہ وہ اپنی دست گیری قلم دست بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحہ غلط سے اُٹھائے اور اجر اس کو دونوں جہان میں خدا دے۔

کمیت خامہ کو میں نے اُٹھا کر — کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصۂ لیلےٰ و مجنوں — سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں"

حیدری کی ان غیر مطبوعہ تحریروں سے ان کی زندگی اور شخصیت کی ایک اچھی خاصی تصویر تیار ہو جاتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ تحریریں ان ماٰخذ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کو سامنے رکھے بغیر حیدری پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔

ان ماٰخذ کے ذریعے سے جو معلومات ہم تک پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ سید حیدر بخش حیدری دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگ نجف اشرف سے ترک وطن کر کے دلی میں آئے اور اسی سرزمین پر اقامت اختیار کر لی۔ حیدر بخش حیدری دلّی ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم کسی ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ دلّی میں زیادہ عرصے تک نہ رہ سکے۔ حالات کی ناسازگار کیفیت نے ان کے والد سید ابوالحسن کو دلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس وقت حیدری کی عمر

بہت کم تھی۔ اس کم عمری میں اپنے والد کے ساتھ دلّی سے باہر نکلے، اور بنارس میں اقامت اختیار کی۔ ان کے والد کا دلّی سے باہر نکل کر پہنچنے کا سبب لالہ سکھ دیو رائے کی ملازمت تھی۔ اس کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ یہ لالہ سکھ دیو رائے کون تھے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کے والد نے ان کی ملازمت اختیار کی۔ ان کی ہمراہی میں بنارس پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے۔ جیساکہ کہا گیا ہے حیدری اس وقت بہت کم سن تھے لیکن اس کے باوجود انہیں دلّی چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔ اپنے والد کی طرح دلّی کی دلچسپیوں کو اُنہوں نے بھی بھُلانے کی کوشش کی اور بنارس میں اپنے دل کو لگایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس شہر سے انہیں جذباتی وابستگی پیدا ہو گئی۔ اس کا اظہار انہوں نے ایک قطعے میں کیا ہے۔

بنارس شہر ہے آباد و خوشتر	چراغ دومان ہفت کشور
شدہ سیارہ ہر جا ماہ روئے	تو گوئی خانہ ہا شد مہ بہ کوئے
جدھر دیکھو اُدھر ہے جبہہ سائی	یہاں کے بت ہیں سب کرتے خدائی
اگر فردوس بر روئے زمین است	ہمین است و ہمین است و ہمین است
کہوں بازار کا کیا اس کے عالم	قلم جو کچھ لکھے سو اس سے ہے کم
رکھا میں مختصر اب اس کو یاں سے	بیاں کچھ گھاٹ کا سن لو زباں سے
لگا رسی سے برنا[1] تک ہر ایک واں	نہ دیکھا کم کوئی از ماہ رویاں
چنانچہ گھاٹ ہے ایک من کرن کا	بیان اس کا کروں میں تم سے کیا کیا
نشانِ حسن واں ہر ایک نے گاڑا	ہوا وہ گھاٹ اندر کا اکھاڑا

---

[1] رسی اور برنا بنارس کے دو گھاٹ ہیں۔ بہ حوالہ خلاصۃ التواریخ نسخہ قلمی ورق ۲۶

لگا کر جم سیتی تا بیتی مادھو | پری بنتا ہے واں ہر ایک نہا دھو
نہ بیچ گنگا میں یاں گر کوئی نہاوے | تو وہ بیکنٹھ واں کس طرح پاوے
کوئی کھینچے ہے قشقہ نازنیں واں | کوئی دیتا ہے ٹیکا مہ جبیں واں
کوئی گنگا میں جا غوطہ لگاوے | کوئی سیڑھی ہی پر دھوتی سکھاوے
برہمن بچے واں ہر سو پھریں ہیں | ہر ایک کو رام وہ اپنا کریں ہیں
مغرق تاش کی پہنے ہیں ساری | اور اس پر ہے ٹکی دوہری کناری
کب ان کے پاؤں میں دو دو کڑے ہیں | کہے تو حسن کے وہ پیکڑے ہیں
نہ رتبہ کس طرح وہ شہر پاوے | کہ شیو ترسول پر جس کو بساوے
بلند اس کی عمارت اس قدر ہے | کہ دھولاگیر جس کی تا کمر ہے
کلاں وہ حیدری ایسا مکاں ہے | کہ جس کا کوچہ خورد اصفہاں ہے[1]

حیدری بنارس کی اس سرزمین پر سن شعور کو پہنچے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نواب علی ابراہیم خاں خلیل صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم بنارس میں ججی کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بنارس میں ان کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ چنانچہ حیدری کے والد سید ابوالحسن نواب علی ابراہیم خاں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس وقت تک حیدری سن شعور تک پہنچ چکے تھے اور تعلیم و تربیت کا خیال ان کے والد سید ابوالحسن کے پیش نظر تھا۔ خلیل کی قربت نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ حیدری کے والد نے اُنہیں نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے سپرد کیا اور اُنہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا کام قاضی عبدالرشید اور مولوی غلام حسین کو سونپا۔ ان کے علاوہ سید جمعیت علی رضوی سے بھی

---

[1] حیدری: دیوان حیدری، قلمی نسخہ باڈلین آکسفورڈ و برٹش میوزیم لندن

انھوں نے استفادہ کیا۔غرض ان کی ذہنی نشو و نما ان بزرگوں کے سائے میں ہوئی۔

حیدری نے اپنے دیوان میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل کی مدح میں ایک قطعہ درج کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خلیل سے کس درجہ متاثر تھے۔ لکھتے ہیں :

کرے ہے جب سے عدالت علی ابراہیم ہوا ہے شہر بنارس مثال باغ نعیم
کروں میں اس کی سخاوت کا کیا بیان رقم دو شالے اس کو دیئے تھی نہ جس کے پاس گلیم
شگفتہ ہو نہ کوئی گل جوں غنچۂ تصویر سحر کو فیض سے اس کے اگر چلے نہ نسیم
کرم ہے اس کا یوں روشن تمام عالم میں کہ مہر و ماہ کے کانسے میں دے ہے یہ زر و سیم
عدو کے سر پہ جو شمشیر وہ رکھے ایک بار اگر پہاڑ ہو ایک دم میں ہو جائے دو نیم
بروز جنگ تری دیکھ صولتِ شمشیر غنم ہو جاوے ترے آگے گر ہو شیر غنیم
کسی پہ گزرے کہیں زور کا تیرے جو خیال تو مور کی طرح مل ڈالے گر ہو پیل جسیم
تو اپنے وقت کا نواب خان خاناں ہے یہ چاہتا ہوں خدا سے کہ میں ترا ہوں ندیم

میں ہوں وہ شاعر خوش فکر حیدری تیرا
کہ جس کے سامنے لکنت کرے زبانِ کلیم[۱]

اور قاضی عبدالرشید خاں کی مدح میں بھی چند اشعار کا قطعہ لکھا ہے جس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔قطعے کے اشعار یہ ہیں :

ہم نے جو صاحب سخا دیکھے در کے تیرے وہ سب گدا دیکھے
کون ہے جو ترے زمانے میں جو کسی کا کوئی بھلا دیکھے

---

[۱] حیدری دیوان : نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ

عدل اہلِ ستم کو باندھے ترا — گر کہیں جور کو کھلا دیکھے
ہوئے تن سے جدا عدو کا سر — تیغ اودھر جو تو اٹھا دیکھے
ترے بے حکم شمع محفل میں — ایک پروانے کو جلا دیکھے
شب سے تا صبح پھر وہ سر اپنا — ہر گھڑی تن ستی جدا دیکھے
ٹھہرے مسکین بے پر اس جگہ — جس جگہ کچھ بھی آسرا دیکھے
مجھ کو دار الشفا ہے در تیرا — میں بہت درد بے دوا دیکھے
حیدری دل سے اس کا ہے مداح — یا حضور اس کو یا قفا دیکھے
یعنی عبدالرشید خاں صاحب — مخزن فیض و ہم سخا دیکھے

سید حیدر بخش حیدری ۱۲۱۴ھ تک بنارس میں رہے۔ اس وقت تک انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا، بلکہ بنارس کے ادبی حلقوں میں بھی اپنی جگہ بنا لی تھی۔ چنانچہ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو کے جن لکھنے والوں کو وہاں جمع کیا ان میں سید حیدر بخش حیدری بھی تھے۔ اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ بنارس سے کب باہر نکلے، کب کلکتہ پہنچے۔ اور کس کے توسط سے ان کی رسائی ڈاکٹر گلکرسٹ تک ہوئی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کی اس سلسلے میں دست گیری کی اور حیدری اس کے لئے ہمیشہ ان کے احسان مند رہے۔ چنانچہ گلدستۂ حیدری میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے اور یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلے ہیں:

"اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس
میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز
بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ دو جز حرف سین سے لے کر تا
حرف یٰ خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف یا تک

نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے ـــــ اور جلد دو چار جزکی جو کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیر درماندگان و حامئ بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اسے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد"[1]

بہرحال میر بہادر علی حسینی کے توسط سے وہ فورٹ ولیم کالج میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ان کا تعارف ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں اُنھوں نے قصہ مہر و ماہ لکھ کر گلکرسٹ کو پیش کیا۔ انھوں نے کتاب کو پسند کیا اور حیدری ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے با قاعدہ ملازم ہو گئے۔[2] دو سو ۲۰۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی[3]۔ تصنیف و تالیف کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں حیدر بخش حیدری ڈاکٹر گلکرسٹ سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ دیوان میں ایک قطعہ ہے جس میں گلکرسٹ کی بہت تعریف کی ہے:

---

[1] حیدری: گلدستہ حیدری: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن و باڈلین آکسفورڈ ص ۲۲۳

[2] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اُس کا عہد ص ۔ ۱۹۸

[3] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اُس کا عہد ص ۔ ۱۴۳

گلکرسٹ صاحب وہ ہے عادل زماں — خوشہ چیں ہے اس کا اب نوشیرواں
کیوں نہ وہ حاکم ہو ہفت اقلیم کا — چاکری کرتا ہے جس کی آسماں
خامہ ہو جاوے وہیں زریں رقم — گر لکھوں اس کی سخاوت کا بیاں
زیر دست اس کے، ہو انبارِ طلا — گر ہو اک ذرہ کسی پر مہرباں
کھل گئے اس کی نسیم خلق سے — غنچۂ اُمید دل ہائے جہاں
اک نگاہِ لطف اس کی حیدری — تجھ کو مستغنی کرے گی بے گماں[1]

حیدری کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز، اس میں شبہ نہیں کہ فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور گلکرسٹ کی شخصیت نے انہیں اس کام کی طرف رغبت دلائی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا بیشتر ادبی کام گلکرسٹ کے ایما پر کیا۔ لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری کی طرف باقاعدہ متوجہ ہونے سے بہت پہلے شاعری کر چکے تھے۔ اس کا سبب ان کے عشق کا واقعہ تھا جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وہ عنفوان شباب میں ایک مہ جبیں عشوہ کار کے عشق بلاخیز میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی واقعے کے زیر اثر انہوں نے شاعری شروع کی تھی اور ایک مختصر سا دیوان بھی جمع کیا تھا۔ دیوان کے آخر میں انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس واقعے کو بیان ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اسی واقعے کے زیر اثر شاعری شروع کی۔ اس سے قبل پیش لفظ میں یہ عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں۔ اس لئے ان کا یہاں پھر نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔

دیوان حیدری صرف غزلیات و قطعات کا مجموعہ ہی نہیں۔ ایک بڑی

---

[1] حیدری: دیوان حیدری: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

ہی دلچسپ دستاویز ہے۔اس سے حیدری کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کا آج تک کسی کو علم نہیں تھا۔ایک تو یہی ان کے عشق کا واقعہ ہے جس کا علم ان کے دیوان سے ہوتا ہے۔پھر دیوان میں غزلوں کے علاوہ بعض قطعات بھی ایسے ہیں جن سے ان کے رومانی مزاج اور طبیعت کے عشقیہ رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی بعض طوائفوں سے ان کا تعلق تھا چنانچہ ایک طوائف بھیجو کا تو ایک واقعہ بھی انہوں نے ایک جگہ اس دیوان میں بیان کردیا ہے۔لکھتے ہیں:

"یہ غزل بھیجو نے اس ہیچ مدان کے گھر آکے سنی۔نہایت خوش بلکہ دوچار ہیں رہی۔اس بات کو سُن کر اس کے چاہنے والوں میں سے ایک شخص جو طبع موزوں رکھتے تھے نام لینا ان کا کچھ ضرور نہیں۔انہوں نے یہ غزل اس کے کڑھانے کو لکھ بھیجی۔وہ اس کے سنتے ہی غضب ناک ہوئی اور اس فقیر سے کہنے لگی کہ "تمہاری دوستی میں یہ نوبت پہنچی"۔

تب اس حقیر نے کہا "تم نہ آزردہ ہو۔میں اسی ردیف و قافیہ میں ایک قطعہ لکھ بھیجتا ہوں کہ وہ اس کو سن کر شرمندہ ہوں اور اپنی پوچ گوئی سے باز رہیں۔

پہلی غزل اس کم گو کی اس کی تعریف میں۔دوسری اُن کی کہی ہوئی اس کی ہجو میں۔تیسرا قطعہ اس کا ان کے جواب میں:

موجزن کیوں نہ تیرا حسن ہو بالا بھیجو — بحرِ ہستی میں تو تو ہے دُرِ لالا بھیجو
پڑگئی رشک سے چہرے پہ قمر کے جھائیں — چشم بد دور یہ کیا حسن نکالا بھیجو
ہے غلط جو کہے مکھڑے پہ ترے زلف اسکو — مخزنِ حسن پہ بیٹھا ہے یہ کالا بھیجو

مہر ٹھہرے نہ شفق میں یہیں ہو جائے غروب — سرخ گر دیکھے ترے سر پہ دوشالا بھیجو
دل عشاق وہیں ہو گئے سب حلقہ بگوش — بس ترے دیکھتے ہی کان کا بالا بھیجو
پھر کہاں بزم کہاں مے وہ کہاں جام وسبو — اور اس دور میں اک دے گی پیالا بھیجو
زاہدہ، زینب و موتی و امیرن ، مدّو — حیدری کیا کہوں ان سب سے ہے اُلّالا بھیجو

کیا، ہوا بھول سے کچھ اپنی امالا بھیجو — دوش پر آج رکھا کیونکہ دوشالا بھیجو
تو تو کرتی تھی بہت لاف زنی عصمت پہ — ہو نے پایا نہ ترے بول کا بالا بھیجو
شکر اللہ کہ دس بیس نے کل شارع عام — غیر کے ساتھ ترا پکڑا اچھنالا بھیجو
کل کی یہ بات ہے کہ غول بیابانی نے — بیع کا تیری لکھا ہے گا قبالا بھیجو
سوت کی طرح ہر اک وقت پڑی بہتی ہے — ------- کا نشی کا نالا بھیجو
فرش مخمل پہ رکھا کل نہ نزاکت سے قدم — دوش پہ آج رکھا کیونکہ دوشالا بھیجو
جس نے دیکھا تجھے وہ تیرے قدم پر لوٹا — اس میں لگتا نہیں کچھ تجھ کو چھنالا بھیجو
گر تجھے دیکھے زلیخا تو کنیزی پہ تو کیا — کردے یوسف کا لگے ہاتھ قبالا بھیجو
چشمۂ فیض وہ ہے تیرے میاں ... — اس کو کس منہ سے کہے کا نشی کا نالا بھیجو

اسی طرح ملائی کے بارے میں بھی ایک دلچسپ غزل ہے۔ اس کو نقل کرنے سے قبل انہوں نے کوئی واقعہ تو بیان نہیں کیا لیکن غزل کے اشعار خود مجموعی طور پر بعض واقعات کو ظاہر کرتے ہیں۔

غزل یہ ہے :

گلشن میں اگر سیر کو ٹک جائے ملائی — گل جھک پڑے وو ہیں بہ سر پائے ملائی
گل چاک گریباں ہو اگر دیکھے ٹک اس کو — سنبل کو پریشاں کرے سودائے ملائی
ہر لحظہ مرے بوئے حنا آتی ہے لب سے — جس دن سے میں چومی، ہے کف پائے ملائی

کیا تاب جو پھر شمس و قمر ہاتھ ملادیں ۔۔۔ گر دیکھیں کسی دن جو یہ سیمائے ملائی
اے حیدری سر میں تو یہ تیغ جھکا دوں ۔۔۔ گر ہوئے مرے قتل پہ ایمائے ملائی[1]

غرض حیدری کے دیوان سے ان کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری اور شاعرانہ فن کاری کے لحاظ سے بھی وہ دلچسپ ہے۔ اس اعتبار سے بھی وہ اہمیت رکھتا ہے کہ حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ دیوان کبھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم اور باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ "دیوان حیدری" حیدری کا کوئی بہت بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہے۔ ان کا ادبی کارنامہ تو نثر کی وہ کتابیں ہیں جن میں سے بیشتر انہوں نے فورٹ ولیم کے دوران قیام میں لکھیں۔ ان کتابوں میں مہر و ماہ، لیلیٰ مجنوں، توتا کہانی، آرائش محفل، تاریخ نادری، گل مغفرت، گلزار دانش، تذکرہ ہندی اور مختصر کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قصہ مہر و ماہ، غالباً حیدری کی سب سے پہلی کتاب نثر ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اوائل ۱۲۱۴ھ میں لکھی اور اس کو پیش کر کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں باریاب ہوئے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے[2]۔ حیدری خود بھی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

پس اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدر شاہجہاں آبادی کو
۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبان

---

[1] حیدری: دیوان حیدری: نسخہ باڈلین آکسفورڈ
[2] سید محمد: ارباب نثر اردو: صفحہ ۱۷ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰

عالیشان گفتگوئے اُردوئے معلّےٰ کو مرغوب طبع رکھتے ہیں اور اہل سخن کو از راہ قدردانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں ـــــ خصوصاً صاحب مناقب عالی مقام، صدر نشین محفل اہل کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کہ جو بحر سخن وری و سخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں اور موجد قواعد کلام شیریں سخنی کے چشمۂ سخن وراں۔

به دل دریا به کف چوں ابر نیساں — جہاں ہے فیض سے جس کے دُرافشاں
نہ ہوں اس کی شجاعت کے مقابل — اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف — دہیں ہو صفحۂ کاغذ زرافشاں
ہے اس کا نام نامی اب گلکرسٹ — جہاں ہے مہر جو داس کے سے تاباں
دعا مقبول ہو یہ حیدری کی — رہے دنیا میں خوش یارب وہ ہر آں

اس واسطے یہ دل مضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر پر نور اس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے یقین ہے کہ منظور نظر ہووے، اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نامربوطی الفاظ دکھلائی دیوے تو اس کی درستگی کے واسطے باغبان خامہ و زبان کو چشم تعلیم سے اشارت کی جاوے کہ جس کے سبب سے وہ اصلاح پاوے[1]۔"

غرض یہ کتاب لکھ کر انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی۔ اس کا انداز و اسلوب بڑی حد تک مرصع اور مسجع ہے۔ اس سے بھی یہ بات

---

[1] حیدری: دیباچہ قصہ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) صفحہ ۱۴۶

ثابت ہوتی ہے کہ اس پر فورٹ ولیم کالج کے ماحول کا اثر نہیں ہے۔ اسی لئے اس میں آسان اور سادہ نثر کا وہ انداز نہیں ہے جو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس کتاب کا انداز مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

"سنا ہے کہ کسی شہر میں آفتاب نام بادشاہ تھا کہ وہ نہایت صاحب حشم و عالی جاہ۔ فوج و خزانہ کی طرف سے خوش و خنداں، اور آل و اولاد کے سبب سے چشم گریاں، ہمیشہ از دست روزگار ناہنجار رہا کرتا۔ اور حساب اس کی افواج کا ذہن رسا میں نہیں آسکتا اور شمار اس کے خزانے کا خزانہ دل میں نہیں سما سکتا۔ جہاں تک شاہ و گدا امیر و وزیر و امرا نواب و خان تھے سو وہ سب اس کے زیر حکم و تابع فرمان جہاں تک کہ تھے سرکش اطراف کے وہ رہتے تھے اس شہ کے قدموں لگے"[1]

حیدری کی یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے لیکن ناقص ہے۔ اگر ایک نسخہ اور مل گیا تو اس کو جلد شائع کر دیا جائے گا۔

سید حیدر بخش حیدری کی دوسری تالیف قصہ لیلیٰ مجنوں ہے۔ یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ غالباً فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد یہ حیدری کی پہلی تالیف تھی۔ فارسی میں اس قصے کو مختلف لکھنے والوں نے نظم میں لکھا ہے۔ حیدری نے سب سے پہلے اس کو اردو کی آسان اور سادہ نثر کے قالب میں ڈھالا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

---

[1] حیدری: دیباچہ مہر و ماہ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) صفحہ ۱۴۶

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید
حضرت نظام الدین اولیا، کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت
آگاہ نے تصنیف کی ہیں۔ اور ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ کا جو لکھا
ہے سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا
ہے اور ہاتفی نے بھی اس قصے دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی
تمام نظم کیا اور عبارت فصیح سے اس کے ہر ایک بیت معشوقہ کو
زیور معنی پہنایا اور اس قصے کو خواجہ یاسین شاہجہاں آبادی کہ شاعری
میں یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسندِ حیات پر جلوہ گر ہیں۔ بموجب
فرمائش اطہر علی خاں مرحوم کہ جیمبر ز صاحب نے حکیم موصوف سے
درخواست اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی۔ خواجہ ممدوح نے
زبان ریختہ ہندی میں حقیقت اس کی سابق عہد سلطنت شاہ عالم
بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی۔ اب ۱۲۱۵ھ بارہ سو
پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ سنہ تیتالیسواں
جلوس بادشاہ موصوف سے ہے، جناب صاحب عالی شان
پشت و پناہ سخن سنجاں، بحر ہمت، گوہر مروت، کوہِ حشمت،
مخزنِ سخاوت، اعلیٰ دودمان جان گلکرسٹ صاحب بہادر زاد
افضالہ نے اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ
چین خرمنِ علم کو بین مولوی غلام حسین غازی مولوی عدالت و نواب
علی ابراہیم خان بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ اس قصہ پرسوز
نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اُردوئے معلےٰ کے ساتھ فصاحت
شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطۂ تحریر میں لا۔ کیونکہ عبارت سلیس

مفید ہے ان صاحبوں کو جو بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں، ان
کی درستگی زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت
نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس کمترین ہیچ مدان نے موافق اپنی طبع کے
زبان محاورہ اردوئے معلّے کے قصہ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔ ہر ایک
صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمے کو چشم فیض اثر
سے دیکھے اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم ہے کہ وہ
اپنی دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحۂ غلط سے
اٹھالے۔ اور اجر اس کو دونوں جہاں میں خدا دے۔

کمیت خامہ کو میں نے اُٹھا کر کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصۂ لیلٰے و مجنوں سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں[1]

حیدری کی یہ کتاب بھی کبھی شائع نہیں ہوئی۔

توتا کہانی سید حیدر بخش حیدری کی تیسری کتاب ہے جو کہانی اور پلاٹ،
اسلوب اور انداز بیان دونوں کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر
گلکرسٹ کے ایما پر ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں
لکھتے ہیں :

چل بھائی! بس، بتاریخ بست و ششم شہر ذی قعدہ سنہ در
پنجشنبہ بوقت شام بخوبی تمام فضل خدا سے یہ قصہ شیریں کلام انجام
کو پہنچا۔ اور توتا کہانی اس کا نام رکھا:

کہانی ہوئی ختم جب حیدری تو ہاتف نے نام اس کا سن کر کہا

---

[1] حیدری : دیباچہ قصہ لیلیٰ (گلدستہ حیدری قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) صفحہ ۱۴۸

سرِراہ کو کھینچ کر تو نے خوب رکھا نام توتا کہانی بجا[1]

اس کا ماخذ فارسی کی کتاب محمد قادری کا طوطی نامہ ہے۔ فارسی میں اس کو ضیاء الدین نخشبی نے بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ کہانیاں سنسکرت کی کتاب شکا سبتتی سے ماخوذ ہیں سنسکرت کی کتاب میں ۷۰ کہانیاں تھیں۔ نخشبی نے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ محمد قادری نے اپنے ترجمے کے لئے صرف ۳۵ کہانیوں کو انتخاب کیا۔ حیدری نے بھی صرف کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محمد قادری کی لکھی ہوئی کہانیاں ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ دیباچے میں خود بھی لکھتے ہیں:

"یہ سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم، شاگرد مولوی غلام حسین غازی پوری، دست گرفتہ صاحب عالی جناب، سخن داں، آبرو بخش بختوراں، معدن مروت وچشم فتوت دریائے جودوکرم، منبع علم وحلم، خداوندِ خدایگاں، والا شان جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں سرگروہ امیران جہان، حامی غریباں وبے کساں، زبدۂ نو آئیناں عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے محمد قادری کے طوطی

---

[1] حیدری: توتا کہانی: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص ۹۹ - ۱۰۰

نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے، زبان ہندی میں موافق محاورے
اردوئے معلےٰ کے نثر میں عبارت سلیس وخوب والفاظ رنگین
ومرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اس کا توتا کہانی رکھا۔ تاکہ صاحبان
نوآموز کی فہم میں جلد آوے۔ اور یہ ہیچ مدان ہر ایک اہل سخن سے
امید رکھتا ہے کہ جو کوئی چشم غور سے اس ترجمے کو ملاحظہ کرے اور
غلطی معنی یا نامربوطی الفاظ اس کی، اس کے نظر پڑے تو وہ شمشیر قلم
سے مانند سر دشمن کے اس صفحۂ ہستی سے اسے اڑادے۔

جو بہر اصلاح اس پہ رکھے قلم   الٰہی نہ دینا کبھی اس کو غم
الٰہی بحق امام انام   یہ جلدی ہو مجھ سے کہانی تمام[1]

یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی آسان اور
سادہ نثر کی روایت کا بہت اچھا نمونہ ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں آنے کے بعد، وہاں کے مخصوص ماحول کے
زیر اثر، اپنے اندر خاصی تبدیلی پیدا کی تھی۔

توتا کہانی کا سب سے اہم قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے
میں ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔[2] اس ایڈیشن میں اُردو
کے سرورق پر ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ لیکن انگریزی کے
سرورق پر ۱۸۰۴ء درج ہے۔ ہوسکتا ہے ۱۸۰۳ء میں اس کی طباعت کا
کام شروع ہوا ہو اور ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوا ہو۔ دونوں سرورقوں کی عبارتیں

---

[1] حیدری: توتا کہانی: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن صفحہ ۳
[2] محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۹۲

یہاں درج کی جاتی ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توتا کہانی ترجمہ محمد قادری کے طوطی نامہ کا۔ مدرسے کے لیے عہد میں زبدۂ نوآیئنان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی، گورنر جنرل بہادر دام ظلہٗ کے کیا ہوا منشی سید حیدر بخش حیدری کا حکم سے خداوند نعمت جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے

درسخن کو تو غواص بحرِ معنی پاتے وگرنہ کیسی ہی کوئی شناوری جانے

سنہ ۱۸۰۳ عیسوی

مطابق ۱۲۱۸ ہجری

ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا گیا ہوا
منشی تبتو رام کا[1]

TOTA KUHANEE

A TRANSLATION

into the Hindoostani Tongue
of the Popular Persian Tales

entitled

Tootee Namu

by

Sueyud Huedur Bukhshi Hueduree

under the superintendence of

---

[1] حیدری: توتا کہانی: پہلا ایڈیشن (ہندوستانی پریس کلکتہ) ص-۱

John Gilchrist
For the use of the students
in the
College of Fort William
Calcutta

Printed at the Hindoostani Press, 2
1804.

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے ایڈیشن کے علاوہ اس کا ایک ایڈیشن ۱۸۲۵ء میں ڈاکٹر ڈنکن فوربس نے لندن سے شائع کیا۔ لندن ہی سے ایک اور ایڈیشن ۱۸۳۵ء میں چھپا۔ ۱۸۷۲ء میں اس کا ایک اڈیشن مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد نول کشور نے ۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۲ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع کئے۔ اس کے علاوہ دہلی کان پور اور لاہور سے بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے[1]۔ اس کتاب کے تقریباً تمام ایڈیشن برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ اس کا تازہ ترین ایڈیشن لاہور کی مجلس ترقی ادب نے شائع کیا ہے۔ بنگلہ، ہندی، انگریزی اور روسی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے اور ان کو اہتمام سے شائع کیا گیا۔ بنگلہ میں توتا اتہاس کے نام سے چنڈی چرن سیرام پوری نے اس کا ترجمہ کیا۔ اور ۱۸۰۲ء میں شائع کیا۔ انگریزی

---

[1] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ص۔ ۹

میں جارج اسمال نے اس کا ترجمہ کیا اور لندن سے ۱۸۷۵ء میں شائع کیا۔ ہندی میں شک بہتری کے نام سے نول کشور نے اس کا ترجمہ ۱۸۸۶ء میں شائع کیا۔[1]

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو کس قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"اگلے دولت مندوں میں سے احمد سلطان نام ایک شخص بڑا مالدار اور صاحب فوج تھا۔ لاکھ گھوڑے پندرہ زنجیر فیل اور نو سو قطار باربرداری کے اونٹوں کی اس کے در دولت پر حاضر رہتی تھی۔ پر اس کے لڑکا بالا کوئی نہ تھا کہ گھر اپنے باپ کا روشن کرتا۔
اسی بات کا اس کے دل پہ تھا داغ   نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ
اسی واسطے صبح شام خدمت میں خدا پرستوں کی جاتا، اور ان سے درخواست دعا کی کرتا۔

غرض تھوڑے دنوں کے بعد خالق زمین و آسمان نے ایک بیٹا خوبصورت، مہر چہرہ، ماہ جبین اسے بخشا۔ احمد سلطان اس خوشی سے گل کی مانند کھلا، اور نام اس کا میمون رکھا۔ کئی ہزار روپے فقیروں کو بخش کر سجدہ شکر کا بجالایا اور یہ بیت پڑھنے لگا۔
تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار[2]

حیدری کی یہ کتاب توتا کہانی اپنے انداز بیان اور موضوع دونوں اعتبار

---

[1] حیدری: توتا کہانی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور، ص۔ ۴
[2] حیدری: توتا کہانی (مجلس ترقی ادب لاہور) ۱۹۶۳ء ص۔ ۳

سے مقبول ہوئی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہے اس کا انداز بیان اور اسلوب سیدھا سادہ اور دلکش ہے۔ موضوع میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں لیکن اس سے اس وقت کے مشرقی مزاج اور اس علاقے کی روایت سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔

توتا کہانی کے پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ایک مختصر سا دیباچہ انگریزی لکھا ہے۔ چند سطروں میں انہوں نے اس کتاب کی بنیادی خصوصیات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اصل عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"These popular tales have long been read and admired in the original Persian, in which language they were composed by Zia-Oodeenin Nukhshibee. They are now translated into Hindoostanee by Sueyud Huedur Bukhsh Hueduree of Shahjehanabad from an abridgment of the original made in the Persian tongue by Moohammud Qadiree.

The easy familiar style in which they are now translated, renders this work a desirable acquisition to the Hindoostanee Scholar, both for improving himself, in the idiom of the Rekhta, and giving him considerable information of the popular manners of Asia, of which these tales afford a correct and pleasing picture."[1]

حیدری کی ایک اور کتاب آرائش محفل ہے۔ یہ کتاب بھی حیدری نے فورٹ ولیم کے دوران قیام میں لکھی۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ ہے۔

لہ حیدری: توتا کہانی (فورٹ ولیم) ص۔ ۳

اور یہ بھی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انہوں نے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں تاکہ کہانی طولانی ہو جائے اور پڑھنے والے اس سے محظوظ ہوں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"الٰہی دے مجھے روشن بیانی — کہ تا دل پر کھلے راز نہانی
زباں کو مخزن تقریر کر دے — دہن کو گوہر معنیٰ سے بھر دے
کمیت خامہ کو میرے لگا پر — یم معنی میں مجھ کو آشنا کر
پلا دے مجھ کو جام ارغوانی — کہ جس سے طے ہو حاتم کی کہانی
کہیں سن کر اسے ارباب اردو — کہ ہے یہ گوہر نایاب اُردو

یہ قصہ عبارت سلیس سے زبانِ فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سے حیدر بخش تخلص بہ حیدری، دہلی کے رہنے والے نے، امیر والاتدبیر، پشت و پناہ ہر پیر و جواں، دست گیر درماندگاں و بے کساں، نوشیروانِ وقت، ہمایوں بخت، زبدۂ نوآئینان، عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی، گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کی حکومت میں، اور خداوند خدایگاں والاشان، عالی خاندان جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہٗ کے حکم سے سنہ بارہ سو سولہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے موافق اور سنہ جلوس تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق، زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی، ترجمہ نثر میں کیا، اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں اپنی طبیعت سے، جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں

زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے، اور سننے والوں کو خوش آئے۔[1]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آرائش محفل ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوئی لیکن خدا جانے کیوں سید محمد نے ارباب نثر اردو میں اور مولانا حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء لکھ دیا ہے۔

سید محمد لکھتے ہیں :

"حیدری کی دوسری مقبول اور مشہور کتاب آرائش محفل ہے۔ عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا میں اس کا نام ہفت سیر حاتم بھی لکھا ہے۔ اس میں حاتم طائی سے متعلق قصص کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی سات سیریں بیان ہوئی ہیں، نساخ کا بتایا ہوا دوسرا نام بھی موافق موضوع ہے۔ یہ قصہ ابتداً فارسی نثر میں تھا۔ اس کو حیدری نے اوائل ۱۲۱۶ھ، ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔"[2]

اور مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں :۔

"آرائش محفل حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سیروں کا فسانہ ہے۔ اس لئے عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرۂ سخن شعرا میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش کے مطابق فارسی کی داستان کو اردو میں لکھا ہے۔"[3]

---

[1] حیدری: آرائش محفل (مطبوعہ شعلۂ طور کان پور) ص ۲
[2] سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور ۱۹۵۰) ص ۷۶
[3] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص ۹۹

اس کتاب پر حیدری کو چار سو روپے کا انعام بھی ملا تھا[1]۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ میری نظر سے صرف وہ ایڈیشن گزرا ہے جو عرصہ ہوا، مطبع شعلہ، طور بلدۂ کان پور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ اسی نسخے سے یہ عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے :

لکھنے والے نے یہ لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں طے نام یمن کا بادشاہ نہایت صاحب حشم، عالی جاہ، فوج کی طرف سے فرخندہ حال، زر و جواہر سے مالا مال، اس کی رعیت ہیزدہ ہزار اور سپاہ بے شمار، القصہ اپنے چچا کی بیٹی کو نکاح میں لاکر ثمر جاودانی کا امیدوار ہوا۔ بارے خدا کے فضل سے کتنے دنوں میں اوسی بیگم سے ایک لڑکا مہرلقا پیدا ہوا۔ یہ خبر فرحت اثر سن کر اوس نے حکیموں، منجموں، رمالوں، پنڈتوں کو بلوا کر کہا کہ تم اپنی عقل کی رسائی اور پوتھی قرعہ کی رو سے دریافت کرو اور بچارو دیکھو تو اس لڑکے نے نصیب کیسے ہیں؟ انھوں نے جو دریافت کیا تو ہر طرح سے اُس شہزادے کو صاحب اقبال پایا۔ عرض کی کہ خداوندا! ہم کو تو اپنے علم سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبزادہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوگا اور تمام عمر برائے کام کیا کرے گا۔ اور اس نام مہر سپہر کی طرح قیامت تک دنیا میں جلوہ گر رہے گا۔[2]

---

[1] محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ) ص ۱۷۲

[2] حیدری : آرائش محفل (مطبع شعلۂ طور، کان پور) ص ۲-۳

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی سادہ، سلیس، رواں اور مجموعی طور دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بھی حیدری کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے کے بعد جب حیدری کو ذرا اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے اپنی بعض بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کیا اور اس کا نام "گلدستۂ حیدری" رکھا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں کی اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ھ میں عنایات و تفضلات سے صاحبان عالیشان والا خاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کی ایک صورت اطمینان کی ہے اور مفارقت میں یارانِ قدیم دوستان صمیم کی اوقات یونہی گزرتی ہے۔ اس واسطے چند قصے زبانِ ریختہ ہندی میں موافق اُردوئے معلّٰے کے نثر کئے گئے جیسے قصۂ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصۂ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے۔ اور چند اشعار پریشان اور کئی مخمس و چند قطعہ جو اس ہیچ مدان نے تصنیف کئے، سوا حاطۂ تحریر میں آئے اور اس مجموعہ بے سر رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سروپا نے جمع کیا ہے، نام اس اوراقِ پریشاں کا گلدستۂ حیدری رکھا ہے۔"[1]

---

[1] حیدری: گلدستۂ حیدری، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ص ۱

اس قلمی نسخہ میں حیدری کی کئی اہم تصانیف شامل ہیں۔ سب سے پہلے تو اس میں کچھ قصے ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان دونوں اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ میں نے ان قصوں کو مرتب کر کے "مختصر کہانیاں" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ کہانیاں "نہ صرف اُردو کی ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ مختصر افسانے کی فنّی روایت میں بھی بڑی اہمیّت رکھتی ہیں کیونکہ ان میں مختصر افسانے کے فن کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے موضوعات زندگی کے عام معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں سے اکثر میں وحدت تاثر کا پہلو بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ تہہ داری اور رمز وایما کی خصوصیت بھی ان میں سے اکثر میں موجود ہے۔ ان کا مواد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان میں زندگی کے جذباتی اور ذہنی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل فن کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے"۔[1]

ایک کہانی یہاں نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہے:

"سنا ہے کہ ایک سوداگر بچہ نوجوان عالی خاندان بیس اکیس برس کا سن و سال، دنیا کی دولت سے مالا مال، فارغ البال ہمیشہ اپنے شہر میں رہا کرتا۔

ایک دن اس کی جورو نے کہا "میاں تم مرد ہو۔ تمہارا اس صورت سے گھر میں بے حس و حرکت بیٹھ رہنا اچھا نہیں کیونکہ آدمی کو بے رنج راحت نہیں اور زر کو برکت بے تجارت۔ اسی

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی: مقدمہ مختصر کہانیاں۔ اُردو دنیا کراچی (۱۹۶۳ء) ص۔۶۔۶۵

طرح سے اگر گزران کروگے تو قارون کے خزانے سے بھی عہدہ برآنہ ہو سکوگے جس سے بہتر یہی ہے کہ سفر کرو۔ کچھ دنیا کے کاروبار سے بھی واقف ہو"۔ اس واسطے کہ وہ گھر سے نکلے تو وہ اپنے یار سے چین کرنے لگے"۔

غرض بہ ہزار خوبی اس نے اسے گھر سے نکالا۔

جب وہ پردیس چلا ہر ایک عورت نے اپنے حوصلے کے مطابق سوغات کو کہہ دیا اور اس کی جورو نے بھی کہا کہ "صاحب میرے واسطے، اگر ہاتھ لگے، تو ایک سیر بھر چرتر لانا"۔ آخر وہ ایک جہاز پر سوار ہوا اور کسی شہر کا رستہ پکڑا۔ بعد دو چار مہینے کے ایک ملک میں جا پہنچا اور خرید و فروخت کرنے لگا۔ جب اپنا مال بیچا تب سوغات کی جنس اپنے لوگوں کی ڈھونڈھنے لگا۔ جس جس چیز کو کہا تھا سو سب میسر آئی مگر چرتر کی جنس کہیں نہ پائی، لاچار ہو کر اپنے جہاز کی طرف پھرا۔

اتفاقاً راہ میں ایک بڑھیا ملی اور اسے متفکر دیکھ کر کہنے لگی کہ "واری گئی تو کس واسطے حیران ہے"؟

اس نے کہا کہ "ماما! میں نے بہت سا اسباب واسطے سوغات کے لیا ہے مگر چرتر کی جنس نہیں ملتی۔ اس لئے غمگین ہوں کہ بی بی کو کیا جواب دوں گا"۔

اس نے کہا "لڑکے! اگر چھ مہینے میرے پاس رہنا قبول کرے تو وہ چرتر کون چیز ہے، میں خرید دوں گی"۔

اس نے یہ بات مانی اور صحبت بڑھیا کی غنیمت جانی۔

حاصل کلام اس نے اس کے سر کے بال کئی مہینے میں بڑھائے
اور عروسانہ کپڑے پہناتے۔ دلہنوں کی سی صورت بنا کر بادشاہ
کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "جہاں پناہ! اس عورت کا خاوند
سپاہی ہے۔ وہ زبردستی اس کو میرے پاس چھوڑ گیا ہے۔ میں
رنڈیا دکھیا اس جوان جہان جی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں کیونکر
رکھوں؟ آپ جہاں پرور ہیں اس کو محل مبارک میں داخل کریں۔
جب وہ نگوڑا آوے گا تب سمجھا جاوے گا۔"

بادشاہ نے یہ بات بڑھیا کی پسند کی اور وزیر سے کہا کہ
"بیٹا تیرا پردیس گیا ہے۔ اس کی بی بی اکیلی رہتی ہوگی۔ جس سے
بہتر یہی ہے کہ اس عورت کو اپنے گھر لے جا اور بہو سے ملا دے۔
یہ دونوں آپس میں خوش رہیں گی اور باتیں پیار کی کریں گی۔"

وزیر نے یہ حکم بادشاہی قبول کیا۔ اس عورت کو اپنے گھر لے
لیا اور کہنے لگا کہ "بابا! جب تک تمہارا خاوند سفر سے پھرے تب
تک اس کو اپنے ساتھ رکھو! میری بھی اس میں خوشی ہے اور بادشاہ
کی بھی مرضی یہی ہے۔"

غرض اس عورت کو وزیر کی بہو نے اپنے ساتھ رکھا اور ربطِ
دوستی نہایت بہم پہنچایا ایک دن وہ دونوں کوٹھے پر کھڑیاں تھیں
اور دور دور نظریں دوڑاتیاں تھیں کہ اتنے میں ابر گھر آیا، مینہ برسنے
لگا۔ ہوا ٹھنڈی چلی۔ ان کو بے کلی ہوئی۔ جوانی نے ستایا۔ سبزہ لہکا۔
دل بوس وکنار کو چلا۔ وزیر کی بہو نے بے قرار ہو کر اس کو سنایا
کہ "بی بی! اگر ہم میں سے اس وقت ایک مرد ہو تو کیا خوب ہو۔

بے کھٹکے رہیں اور عیش و عشرت کریں۔"

اس نے اپنی دانائی سے معلوم کیا کہ اس وقت اس کا جی ایک مرد کی خواہش رکھتا ہے۔ حقیقت میں تو مرد تھا ہی، اس کو بھی ایک جوانی کی ترنگ آئی اور حرص دنیوی غالب ہوئی۔ بہ طور لگاوٹ کے بات اس نے کہی کہ "بی بی! اس وقت ہم تم نماز پڑھیں اور دعائیں مانگیں۔ خدا کریم کارساز ہے شاید ہم میں سے ایک کو مرد کر دے۔"

یہ سخن دونوں نے ٹھہرایا اور دُعا کی خاطر ہاتھ پھیلایا۔

بعد ایک ساعت کے وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ "میری دعا تو جناب الٰہی میں مستجاب ہوئی اس نے اپنے کرم سے مجھے علامتِ مرد بخشی۔ اب آپ اِدھر تشریف لائیں۔ کچھ ہم سے مل کر حظ دنیوی اُٹھائیں۔"

یہ بات سن کر وہ خوش ہوئی اور دوڑ کر اس کے گلے لپٹ گئی۔ پھر تو وہ دونوں بخوبی اختلاطیں کرتے تھے اور چین اُٹھاتے تھے۔

بعد کئی مہینے کے اس کا شوہر آیا۔ وزیر نے اپنی بہو سے کہا کہ "بابا! تمہارا خاوند آیا ہے۔ اب اس عورت کو نیچے کے مکان میں جگہ دو اور تم اپنے دولہا سمیت اوپر کے مکان میں رہو۔"

یہ بات اس نے اپنے سسر کی طوعاً وکرہاً قبول کی اور خاوند کے ساتھ رہنے لگی۔ بعد دو چار دن کے آدھی رات کو ایک خنجر تیز سے اپنے خاوند کو ذبح کیا اور لاش اس کی مع سر دریا میں بہا دی تعشق سے بھری اس کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ "میں نے

تیرے واسطے اپنا خاوند مارا۔ اگر مجھ کو اب لے آؤ بھرتا ہے تو لے۔ اور ایسا وقت پھر نہ پائے گا۔ مثل مشہور ہے شب حاملہ فردا چہ زاید"۔

وہ یہ سخن سنتے ہی کہنے لگا کہ "بی بی! میں احمق نہیں کہ تجھ سی قصابن کو ساتھ رکھوں کہ وقت بے وقت اپنے تئیں بھی ذبح کرواؤں"۔

یہ کہہ کر بھاگا اور بڑھیا کے گھر کا رستہ پکڑا۔

جب اس نے دیکھا کہ خصم کا خصم موا اور یار کا یار جدا ہوا تب لاچار ہو کر وہاں سے پھری اور اپنے بچھونے پر جا کر سو رہی۔

صبح کو سسر نے آ کر پوچھا کہ "بنو! تمہارا خاوند کیا ہوا؟"

اس نے کہا کہ "بابا جان! پچھلے پہر وہ میرے پاس سے اُٹھ اور اس سپاہی کی جورو کو اپنے ساتھ لے کر خدا جانے کہاں چلے گئے"۔

یہ سن کر وزیر کو دو غم ہوئے۔ ایک تو بیٹے کا چھٹنا۔ دوسرے امانت میں خیانت کا پڑنا۔ لاچار کیا کرتا۔ ہاتھ سے بازی جا چکی تھی۔ چپ ہو رہا۔

اور وہ اسی زنانے لباس سے بڑھیا کے پاس گیا اور احوال گزشتہ کہنے لگا۔

یہ بات سن کر وہ خوش ہوئی اور بولی "واری گئی اگر عقل رکھتا ہو گا تو احوال جز تر کا معلوم کرے گا"۔

غرض صبح کو اس کا سر منڈا، مردانے کپڑے پہنا، سپاہیوں

کی صورت بنا بادشاہ کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "یہ وہی سپاہی جاہل ہے کہ جس کی عورت محل میں داخل ہے۔ اب یہ حضور میں آیا ہے۔ اس کی امانت اسے ملے"۔

بادشاہ اس کی شیریں سخنی سے خوش ہوا۔ وزیر سے کہنے لگا کہ "اے خیراندیش و نیک نظر! اس کی عورت کو اس کے حوالے کر"۔

وزیر یہ سخن سن کر متفکر ہوا اور اپنے جی میں ارادہ کرنے لگا کہ وہ تو اس کی جورو لے گیا ہے، تو اس کی جورو اس کے حوالے کر کیونکہ تو بھی سرخرو پیش شاہ بحر و بر ہو اور جبر و نقصان برابر ہو۔ یہ بات ٹھہرائی اور اس سپاہی کو اپنے گھر لا کر اپنی بہو بہ منت اس کے حوالے کی۔

وہ اس عورت کو لئے ہوتے پھر بڑھیا کے پاس گیا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ہنسی اور کہنے لگی کہ "مبارک! کل اپنے جہاز یہاں سے کھلوایئے اور بھر پڑے اپنے شہر تشریف لے چلئے کچھ بٹے بازی یہاں دکھلائی ہے اور کچھ کارستانی وہاں دکھلاؤں گی"۔

غرض اس عورت اور اس سوداگر بچے، کو بعد کئی مہینے کے اس کے شہر میں لائی اور کہنے لگی کہ "تو اپنے گھر کہلا بھیج کہ میں خدا کے فضل سے آج اس شہر میں داخل ہوا لیکن تاریخ منحوس کے باعث گھر میں نہیں آسکتا، انشاء اللہ تعالیٰ تڑکے آؤں گا۔

یہ خبر سنتے ہی اس کی جورو ظاہر تو خوش ہوئی پر باطن میں مر ہی گئی۔ وہ چار گھڑی رات گئے اپنے یار کو بلوا کر کہنے لگی۔ "صاحب وہ کمبخت تو آپہنچا۔ بہتر یہی ہے کہ آج ہم تم دل کھول کر عیش

وعشرت کریں۔ کل خدا جانے کیا ہو۔ مثل مشہور ہے۔ بیت

یہ دو دل کو ایک جا بٹھاتا نہیں　　کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

یہ کہہ کر شرابیں منگوائیں اور بدمستیاں شروع کیں۔ گلے میں
بانہیں ڈال کر لپٹے اور بہ فراغت تمام سو رہے۔

جب آدھی رات کا عمل ہوا تب وہ بڑھیا ایک خنجر اپنی کمر سے
لگا کر جہاز سے اتری اور اس سوداگر بچے کے گھر کسی سبب سے
گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ سوداگر بچے کی جورو اور ایک مرد نوجوان آپس
میں لب سے لب ملائے چھاتی سے چھاتی بھڑائے عالم عیش میں
بستر راحت پر پڑے ہیں۔

یہ تماشا دیکھتے ہی اس نے خنجر کو کمر سے نکالا اور اس مرد کا
سر کاٹ ڈالا۔ دھڑ تو وہیں چھوڑا۔ سر رومال میں باندھ کر وہاں
سے لے اُڑی اور سوداگر بچے کے پاس آکر کہنے لگی کہ "صبح کو دو چار
گھڑی دن چڑھے اس سر کو مع اسباب سوغات اپنے گھر لے جا۔
جس وقت وہ لوگ تجھے دیکھیں اور اپنی اپنی سوغات طلب کریں،
اسی وقت ہر ایک کی امانت ہر ایک کے حوالے کرنا اور اپنی بی بی
سے کہنا کہ "صاحب! آپ بھی ادھر آئیں اور اپنی سوغات آپ
نے تو سیر بھر خرِ تر منگوایا تھا، میں سوا سیر لایا۔ اس کو لو اور میری
محنت کی داد دو"! یہ کہہ کر وزیر کی بہو کو سامنے کر دینا اور اس
کو اس کی گود میں دھر دینا۔"

غرض صبح کو وہ سوداگر بچہ ان دونوں کو لے کر اپنے گھر گیا
اور اس بڑھیا کے کہنے کے بموجب اپنے عمل میں لایا۔ چنانچہ ہر

ایک کی سوغات دے کر وزیر کی بہو کو اپنی بی بی کے سامنے کھڑا کیا۔ اور اس کو اپنی گود میں دھر کر کہنے لگا کہ "بی بی! تم نے سیر بھر کہا تھا، میں سوا سیر لایا ہوں۔ دیکھو سیر بھر تو یہ عورت ہے کہ جس نے میرے واسطے اپنے شوہر کو مارا اور پاؤ سیر یہ ہے کہ جس کا سر تمہاری گود میں کٹا۔ اپنے دل کی ترازو میں تول لو اور سچے من سے جواب دو! دیکھو تو کچھ تمہارے چرتر سے میزان بنتی ہے یا نہیں؟ سچ کہو!

جونہی اس نے وہ سر دیکھا وہیں شرمندہ ہوئی اور چاہتی تھی کہ گردن نیچی کرے کہ اتنے میں اس نے تلوار کمر سے لی۔ پہلے تو وزیر کی بہو کا سر کاٹا۔ پھر اپنی بی بی کا کام تمام کیا۔ پھر جب تک جیا پھر رنڈی کا نام نہ لیا۔"[1]

گلدستۂ حیدری میں حیدری کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس کا نام گلشن ہند یا گلشن ہندی ہے۔ یہ تذکرہ انہوں نے ۱۲۱۷ھ میں لکھا۔ جیسا کہ اس قطعہ سے ظاہر ہے:

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ۔۔۔ ز روئے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب ۔۔۔ اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند[2]

"بعد اس کے صاحبان طبیعت پر معلوم ہو کہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلف سید ابوالحسن نجفی ساکن دلّی۔ شاگرد قبلہ کونین مولوی غلام حسین غازی پوری تعلیم یافتۂ مجلس نواب[3]

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی: مختصر کہانیاں۔ حیدری: اُردو دنیا کراچی، ص ۷۷ - ٦۵

[2] حیدری: تذکرہ گلشن ہند (گلدستۂ حیدری: قلمی نسخہ آکسفورڈ۔

[3] اصل متن میں نواب ابراہیم علی خاں ہے۔ علی ابراہیم خاں ہونا چاہیئے۔ حیدری سے سہو ہوا ہے۔

ابراہیم علی خاں بہادر مرحوم سنہ بارہ سو چودہ ہجری میں اکیسویں رجب کو تری کی راہ میں بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ بعد قطع منزل غازی پوری کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا محمد علی مرزا محمد فاضل کے بیٹے، دلّی کے رہنے والے سے، کہ وہ بھی ایک کشتی میں سوار ہوئے، اسی سمت کو آتے تھے، ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جاکر بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی مہربانی فرماتے تھے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے۔ اسی سبب سے ذکر شعر و سخن بہم ہوا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگے کہ میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں۔ ان کی سیر کرو اور اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کر کے ترتیب دو، جو تمہاری یادگار رہے۔

اگرچہ طبیعت فقیر کی صعوبات سفر اور تکالیف زمانے سے ہر آن مشوش رہتی تھی لیکن ان کی خاطر از بس کہ عزیز تھی، دے دیوان دیکھے۔ موافق اپنے حوصلے کے اشعار چنے، اور نام ان کے مصنفوں کے بقدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لاکر اس تذکرہ کا نام گلشن ہند رکھا۔[1]"

حیدری کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ اس میں شاعروں کے حالات بھی کم ہیں، اور انتخاب کلام بھی بہت معمولی سا ہے۔ اس کا اندازہ یہ ہے:

---

[1] حیدر بخش حیدری: تذکرہ گلشن ہند قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ)

"آفتاب تخلص مہر سپہر جہانبانی، شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی کہ بیالیس برس سے تاحال سنہ بارہ سو چودہ ہجری، اوپر سریر سلطنت کے مانند مہر سپہر کے جلوہ گر ہیں اور آفتاب تخلص رکھتے ہیں۔ یہ تصنیف خاص ہے۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے ۔۔۔ شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے ۔۔۔ اب تو آرام سے گزرتی ہے

نواب آصف الدولہ وزیرالممالک آصف جاہ یحیٰی خاں بہادر ہزبر جنگ مرحوم، ابن نواب شجاع الدولہ مغفور بن نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ مبرور ــــ جو دو سخا میں یکتائے دہر تھے اور آصف تخلص رکھتے تھے۔ یہ تصنیف خاص ہے:

دل ہمارا خانہ اللہ تو مشہور تھا ۔۔۔ سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بت خانہ ہوا
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے ۔۔۔ آب سے آتش ہوئی کیونکہ ہم کیا جانیے
پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یارو ۔۔۔ میں ہوں اور رات ہے اور عالم تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زینہار ۔۔۔ لایا ہے کچھ نہ سات نہ جاوے گا کچھ لئے[1]

یہ تذکرہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس کو مرتب کر کے پریس میں دے دیا ہے۔ انشاء اللہ جلد شائع ہو کر سامنے آجائے گا۔

گلدستہ حیدری میں حیدری کا وہ دیوان بھی شامل ہے جو اس وقت شائع کیا جا رہا ہے۔ اس دیوان کی تفصیل اس سے قبل اسی مقدمے میں پیش کی جا چکی ہے۔

---

[1] حیدری: تذکرۂ گلشن ہندی (گلدستہ حیدری) قلمی نسخہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ

حیدری کی یہ کتاب گلدستۂ حیدری اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج نے منظور کر لی تھی۔ تین سو صفحات تھے اور اس میں انہیں دو سو روپے کا انعام ملا تھا[1] لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔

ہفت پیکر بھی حیدری کی اہم تالیف ہے۔ یہ ایک منظوم مثنوی ہے جو ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ "جانِ تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" نکالی تھی۔ اس کا ایک نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں تھا لیکن یہ کبھی شائع نہیں ہوئی[2]۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ مجھے انگلستان میں بھی دستیاب نہیں ہوا۔

حیدری نے تاریخ نادری کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب محمد مہدی ابن محمد نصیر استرآبادی نے تاریخ جہاں کشائے نادری کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ یہ نادر شاہ کے ہم عصر تھے۔

اس کتاب میں نادر شاہ کے مفصل حالات ہیں۔ حیدری نے اس کتاب کا ترجمہ ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں کیا۔ یہ کتاب نایاب ہے[3]۔ انگلستان کے دوران قیام میں باوجود کوشش کے مجھے اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ حیدری نے جامع القوانین کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی اس کتاب کے دو سو صفحات تھے اور اس پر انہیں سو روپے کا انعام ملا تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کا عہد میں چند ایسی کتابوں کی فہرست دی ہے جو فورٹ ولیم کالج میں طباعت کے لئے تیار کی جا

---

[1] محمد عتیق صدیقی: گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۷۰

[2] سید محمد: ارباب نثر اردو: مطبوعہ لاہور۔ ص ۷۹

[3] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص ۹۵

رہی تھیں، ان میں اس کتاب کا نام بھی ہے[1]۔ سید محمد اور حامد حسن قادری کو
اس کتاب کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی مجھے انگلستان کے
دورانِ قیام میں، باوجود کوشش کے اس کا بھی کوئی نسخہ نہیں ملا۔

حیدری کی آخری تالیف 'گل مغفرت' ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۲۲۷ھ
مطابق ۱۸۱۲ء میں لکھی۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا
سے ماخوذ ہے۔ پہلے حیدری نے اس کتاب کو گلشنِ شہیداں کے نام سے اُردو
میں منتقل کیا تھا۔ پھر شہدائے کربلا کے حالات اس میں سے نکال کر ایک کتاب
مرتب کی اور اس کا نام 'گل مغفرت' رکھا۔ اور یہ سب کچھ ایک دوست کے کہنے
پر کیا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

> بعد اس کلام متبرک کے صاحبانِ درد و غم و مبتلایانِ رنج والم
> پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری نے کتاب گلشن
> شہیداں سے، جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ
> کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس
> ہجری میں جناب فیض مآب گل و گلزار معانی، شمع بزم نکتہ دانی،
> گوہر بحر سیادت و امامت، سرو جو بیار گلشن شرافت و نجابت
> مولوی سید حسین علی جون پوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے،
> جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مدان کو ایک رسوخ ادبی
> و نیاز باطنی ہے، اس نسخہ کو انتخاب کیا، اور نام اس کا گل مغفرت
> رکھا، اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے۔

---

[1] محمد عتیق صدیقی: گل کرسٹ اور اس کا عہد: ص ۱۷۵

مقبول خاطر و عاطر ہووے[1]۔"

گل مغفرت ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۶ھ میں کلکتہ کے ہندوستانی چھاپے خانے میں چھپی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

"نسخہ گل مغفرت، لکھا ہوا سید حیدر بخش حیدری کا، عہد حکومت میں زبدہ نوآئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان نواب مستطاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وافضالہ کے سنہ بارہ سو چھبیس، ہجری مطابق اٹھارہ سو بارہ عیسوی کے دارالامارت کلکتہ کے ہندوستانی چھاپے خانے خاص و عام کے فائدے کی خاطر چھپوایا گیا[2]۔"

اب اس کو مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی شائع کر دیا ہے۔

گل مغفرت کا انداز یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی مجلس حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی۔

جو اشک گرے بہر جگر گوشۂ زہرہ ہے لاکھ عبادات سے بہتر یہ عبادت
اے حیدری آنسو نہ سمجھ اس کو سنا ہے کہتے ہیں اسے اہل نظر بحر شفاعت

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی محفل عزا میں بیٹھو۔ اپنی صدف چشم سے گوہر سرشک بہاؤ[3]۔" ص۔ ۲۰۸

---

[1] حیدری: گل مغفرت: (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۱۲ء) ص ۷۔ ۸

[2] ایضاً ص۔ ۱

[3] حیدری: گل مغفرت: (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۱۲ء) ص۔ ۸۔ ۹

دوسری مجلس جناب سیدۃ النسا فاطمہ زہرہ بنت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی۔

خوشا وہ چشم جو، ہو نم حسین کی خاطر — خوشا وہ دل جو کرے غم حسین کی خاطر
زہے وہ محفل شادی زہے وہ بزم سرور — کہ جس میں کیجئے ماتم حسین کی خاطر

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام نے لباس حیات اپنے جسم مطہر سے اُتارا اور سفرِ آخرت کے اسباب کا تہیّہ کیا۔[1] ص ۲۸-۲۹

تیسری مجلس حضرت مرتضیٰ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے شہید ہونے کی۔

اے محبو! بیٹھے کیا، ہو گریہ وزاری کرو — جانشین مصطفٰے پر آج خونباری کرو
حیدری، ہو واسطے حیدر کے سر کو پیٹ پیٹ — اس ولی اللہ کی دل سے عزاداری کرو

اے مومنو! آل عبا کے عزادارو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں جناب مرتضیٰ علی علیہ السلام کی بعضی بعضی فضیلت اور شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سنو اور چشمۂ چشم سے دریائے سرشک بہاؤ۔[2] ص ۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوتھی مجلس حضرت امام حسین علیہ السلام کے شہید ہونے اور اس دنیائے دوں سے سفر کرنے کی۔

اے چشم اشک بار نہ رونے میں کر کمی — جوں مردمک لباس کر اپنا تو ماتمی
اس بزم میں دے بہرِ خدا خونِ دل بہا — ٹک دیکھ یاں ہے فاطمہؑ اہلِ عزا بنی

---

[1] حیدری: گل مغفرت (کلکتہ) ص ۲۸
[2] ایضاً ص ۴۷

اے یارو! آل عبا کی بزم کے بیٹھنے والو! والے جناب حسنین
کی محفل عزا کے سنوارنے یارو!
یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام
کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ روؤ اور لخت جگر چشم تر سے بہاؤ[۱]"
ص۔ ۶۵
پانچویں مجلس حضرت مسلم ابن عقیل علیہ السلام کے شہید
ہونے کی۔
دریائے خوں اے مومنو آنکھوں سے دو بہا بہرِ حسین تشنہ لب و شاہ کربلا
ہے سرخروئی تم کو اسی سے بہ روزِ حشر پیش رسولؐ و فاطمہؑ و پیش مرتضےٰؑ
اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت مسلم ابن
عقیل کے شہید ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی بے کسی اور
تنہائی پر روؤ چشمہ چشم سے خون دل بہاؤ[۲]"۔
چھٹی مجلس حضرت مسلم بن عقیل علیہ السلام کے صاحبزادوں
بے کسوں کے شہید ہونے کی۔
کیوں نہ ہوں اس غم میں آنسو اپنی آنکھوں سے رواں
غم الم کو دیکھ کر روتا ہے ہر شب آسماں
ہے غضب وہ حضرت مسلم کے دونوں نورِ عین
تشنہ لب دریا کنارے قتل ہوں اے مومناں

---

[۱] حیدری: گل مغفرت (کلکتہ) ص۔ ۶۵
[۲] ایضاً۔ ۸۵

اے مومنو! یہ شب وہ شب ہے کہ جس میں حضرت مسلم ابن
عقیل علیہ السلام کے صاحبزادوں کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حیدری کی ایک اہم کتاب گلزار دانش ہے جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ کتاب انہوں نے لکھی ضرور تھی لیکن اب نایاب ہے لیکن اس کا قلمی نسخہ مل گیا ہے، اور اب یہ شائع کی جا رہی ہے۔

سید حیدر بخش حیدری کے حالات و تصانیف کی اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے سب سے اہم مصنف تھے۔ انہوں نے اچھی خاصی تعداد میں نثر کی کتابیں لکھیں اور آسان اور سادہ نثر کا وہ وہ اسلوب بھی پیدا کیا جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے صرف ترجمے تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں کیا، طبع زاد ادبی تخلیقات کو پیش کرنے میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کی پرواز صرف روایتی انداز کی داستانوں تک ہی محدود نہیں رہی، انہوں نے بعض نئی اصناف ادب کا تجربہ بھی کیا۔ انہوں نے صرف آسان اور سادہ نثر کی طرف توجہ ہی نہیں کی، ایک بڑے ہی دلکش اور دلآویز اسلوب کی طرح ڈالی —— اور اس اعتبار سے وہ اُردو نثر کے ایک اہم صاحبِ انشاء پرداز اور ایک منفرد تخلیقی فن کار نظر آتے ہیں۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۲۵ / جنوری ۱۹۷۶ء

عبادت بریلوی

بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست میں شکوہ فرنگ کے قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے، اور صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ یہ نظم آغا جو شرف کی تصنیف ہے۔ یہ نظم انھوں نے کلکتے کے دوران قیام میں لکھی اور اس کو اس زمانے کے ارباب اختیار کے سامنے پیش کیا۔ اس کا مقصد بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور انعام واکرام کا حاصل کرنا تھا۔ یہ نظم کلکتہ میں ۲۷ شعبان ۱۲۸۵ھ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۸ء کو یک شنبہ کے روز پایۂ تکمیل کو پہنچی اور انگریز حکمرانوں کی خدمت میں پیش کی گئی۔ انگریزوں نے اس نظم کے قلمی نسخے کو سرکاری طور پر برٹش میوزیم کے

کتب خانے میں پہنچا دیا اور اب اس نظم کا یہ واحد نادر و نایاب قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے کی زینت ہے۔

شکوہ فرنگ کا یہ قلمی نسخہ بڑے سائز کے ۱۶۰ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ اعلیٰ درجے کے دبیز کاغذ پر خط نستعلیق میں لکھا ہوا یہ قلمی نسخہ ۱۰۰ سال گزر جانے کے بعد آج بھی نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب نظر آتا ہے۔ اس نسخے پر کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن خیال یہ ہے کہ اس کو مصنف نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ آخری صفحے پر مصنف کی مہر بھی ثبت ہے۔

مندرجہ ذیل عبارت پر شکوہ فرنگ کے اس قلمی نسخے کا اختتام ہوتا ہے۔

"تمت تمام شد تواریخ ہذا شکوہ فرنگ بہ شہر کلکتہ دارالامارت انگریز بہادر دام اقبالہٗ بتاریخ بست و ہفتم شہر شعبان ۱۲۸۵ ھ ہجری مطابق سیزدہم ماہ دسمبر ۱۸۶۸ ؁ء عیسوی روز یک شنبہ بہ اتمام نظم رسیدہ حجم شدہ موسوم و مشہور بہ شکوہ فرنگ گردید۔ فقط گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ تحریر فی التاریخ بست ہفتم شعبان ۱۲۸۵ ہجری مطابق سیزدہم ماہ دسمبر ۱۸۶۸ء"

"مہر مصنف دفتر ہذا"

(۲)

'شکوہ فرنگ' کے مصنف آغا جو شرف ہیں جو خواجہ آتش کے شاگردوں میں خاصے مشہور و معروف ہیں اور متاخرین شعرائے لکھنؤ میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ افسوس ہے ان کے حالات کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ عبدالغفور نساخ نے سخنِ شعرا میں، سعادت خاں ناصر نے خوش معرکۂ زیبا میں، کارساں دی تاسی نے اپنی فرانسیسی تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد

میں، لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں اور مولانا عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ خود شرف نے بھی اپنی نظم شکوہ فرنگ میں دو جگہ اختصار کے ساتھ اپنے حالات لکھے ہیں۔

نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں :۔

"شرفؔ تخلص سید سادات حسین خاں عرف آغا جو خلف سید محمد میر عرف میرن صاحب باشندۂ لکھنؤ۔ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ ۱۲۸۰ھ میں کلکتہ آئے تھے۔ راقم سے ان سے بزم مشاعرہ میں ملاقات ہوئی تھی۔"[۱]

سعادت خان ناصر خوش معرکۂ زیبا میں یہ معلومات فراہم کرتے ہیں :۔

"شریف ہر دو طرف، سید باقر علی عرف آغا جو تخلص شرفؔ، جوان وجیہ، عالی خاندان، خوش لہجہ، ملایم زبان، گرمیٔ برق اور صفائے بحر اس کی طبع سے عیاں۔ بعد کشمکش رجوع بہ حیدر علی آتش لایا۔"[۲]

گارساں دی تاسی نے اپنی ہندوستانی ادب کی تاریخ میں مندرجۂ ذیل تفصیل بیان کی ہے :

"شرف (سید سادات حسین) عرف آغا جو۔ سید محمد میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کا وطن مشہد ہے۔ لکھنؤ آئے اور

---

[۱] عبدالغفور خاں نساخ : سخن شعرا، مطبوعہ نولکشور ص ۲۴۴

[۲] سعادت خاں ناصر : خوش معرکۂ زیبا جلد دوم (مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۷۴-۷۵

اسی شہر کو اپنا وطن بنا لیا۔ آتش کے شاگرد تھے۔"[1]

خمخانۂ جاوید میں ان حالات کے ساتھ ساتھ واجد علی شاہ سے ان کی رشتے داری اور ان کے ساتھ مٹیا برج جانے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"ناظم مرصع خیال، شاعر جادو مقال جناب میر سادات حسین خاں عرف آغا حجو صاحب مرحوم مرزا حامد علی کوکب ولی عہد واجد علی شاہ کے خسرہ تھے اور ولی عہد کے لڑکے بڑے مرزا اور ننھے مرزا انہیں کی بیٹی کے بطن سے تھے۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں جب کہ اودھ کا خاندان شاہی اپنے اقبال کی داستان ختم کر چکا تھا اور کلکتہ کے مٹیا برج میں رہتا تھا، یہ بھی ولی عہد کے ہمراہ موجود تھے۔ انہیں ولی عہد کے جوان گزر جانے کا بڑا صدمہ تھا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ معنی بند، خوش فکر شاعر تھے۔ فن سخن میں حضرت آتش کے شاگرد رشید تھے۔ زبان سلیس، بیان میں لطف ہے۔ بندشوں میں تشبیہات کی دلآرائی، ترکیبوں میں استعارات کی زیبائی ان کی مشاقی پر دال ہے۔ ٹکسالی زبان باندھتے ہیں۔ ذہن صائب کی جدت طرازی قابل تحسین، فکر باریک بین کی رسائی لائق آفرین"[2]

اور مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں آتش و ناسخ کے زمانے کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے شرف کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] کارساں دی تاسی : ہندوستانی ادب کی تاریخ (فرانسیسی) جلد ۳ ص ۱۱۲

[2] لالہ سری رام : خمخانۂ جاوید، جلد چہارم، (لاہور ۱۹۲۶ء) ص ۵۳۱

اُس دور میں آغا حجو شرف شاگرد آتش نے سب سے بڑی اصلاح یہ کی کہ فارسی شاعری کے ان تمام متداول الفاظ کو ترک کر دیا جنہوں نے اردو شاعری کو رندی، ہوسناکی بلکہ الحاد و بے دینی تک کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ مثلاً انہوں نے "بت، صنم، کلیسا، برہمن، ناقوس، زنار، زاہد، واعظ، پیر مغاں، ساغر، شیشہ، صہبا کو یک لخت چھوڑ دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام ان مضامین سے پاک ہو گیا جو شریعت، تہذیب، اخلاق و انسانیت کے یکسر مخالف تھے۔ اگرچہ ان الفاظ کے ترک کر دینے سے شاعری کا آدھا سرمایہ برباد ہوا لیکن با ایں ہمہ آغا حجو شرف کے دیوان میں تغزل کا رنگ کافی موجود ہے۔"[1]

ان تمام تذکروں میں جو معلومات فراہم کی گئی ہے، اس کو یکجا کیا جائے اور ایک لڑی میں پرو یا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آغا حجو شرف اپنے عہد کی ایک اہم شخصیت تھے۔ ان کے آبا و اجداد مشہد سے لکھنؤ آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ شرف نے اسی سرزمین پر ہوش سنبھالا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی ارض مینو سواد میں گزارا۔ ان کی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ لیکن اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا اور آتش، ناسخ، انیس، دبیر اور ان کے ہم عصروں نے اپنی شاعری سے

---

[1] عبدالسلام ندوی: شعر الہند حصہ اول (اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء) ص ۲۷۰

ان دنوں جو ایک مخصوص فضا قائم کر دی تھی، اس سے وہ متاثر ہوئے۔
آخری تاجدار اودھ جان عالم مرزا واجد علی شاہ سے ان کی رشتے داری بھی
تھی۔ وہ مرزا حامد علی کوکب ولی عہد واجد علی شاہ کے خسر تھے۔ اس طرح
دربار شاہی سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ شاید اسی نسبت سے جب جنگ
آزادی سے قبل انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کی
سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور واجد علی شاہ کو مٹیا برج کلکتہ میں جلا
وطن کر دیا تو شرف بھی کلکتہ گئے۔ کلکتے ہی میں انھوں نے انگریزوں کو
خوش کرنے کے لئے اپنی نظم شکوہ فرنگ لکھی۔ بظاہر تو اس نظم میں انگریزوں
کی تعریف کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ کہ شرف نے اپنے عہد اور اپنے خاندان
کا مرثیہ لکھا ہے، اور تاریخی واقعات کو بیان کر کے خوب خوب اپنے دل
کی بھڑاس نکالی ہے۔ شرف کب تک کلکتہ میں رہے اور کب ان کا انتقال
ہوا؟ اس کا علم نہیں ہوتا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ ۱۸۷۲ء سے پہلے ان کا
انتقال ہو چکا تھا۔ کیونکہ عبدالحیٔ صفا کے 'شمیم سخن' میں ان کا ذکر نہیں ہے۔
شمیم سخن ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا اور اس میں بیشتر ایسے شاعروں کے حالات
درج ہیں جو ۱۸۷۲ء میں زندہ تھے۔ اس لئے خیال یہ ہے کہ شاید اس
سے قبل ہی شرف کا انتقال ہو چکا تھا۔ شکوہ فرنگ انھوں نے ۱۸۶۸ء
میں لکھی ہے۔ اس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۶۸ء
اور ۱۸۷۱ء کے درمیان ہوا ہوگا۔

شکوہ فرنگ میں انھوں نے دو مقامات پر اپنے حالات اگرچہ
اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن چونکہ یہ بیان خود مصنف کے
ہیں، اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں ؎

سنو، صاحبو! ہے مرا تو یہ حال
کہ میں تو گنہگار ہوں بال بال
اک ادنیٰ ہی بندہ ہوں اللہ کا
ہوا خواہ سرکار ذیجاہ کا
جہاں میں تخلص ہے میرا شرف
وہ مشہور و معروف ہے ہر طرف
سیادت حسن خاں مرا نام ہے
زمانے میں مشہور وارقام ہے
جلال الدین حیدر بھی ہے میرا نام
ہوا خواہ سرکار ہوں بلا کلام
صحیح النسب ہے مرا خاندان
ریاست سیادت بہم ہے یہاں
یہاں سرفرازی قدامت سے ہے
وسیلہ بھی دامان دولت سے ہے
عجب بات دل میں یہ آتی مرے
یکایک یہ دل میں سمائی مرے
شجاعت یہ حکام کی نظم کی
یہ کلکتہ میں مثنوی نظم کی
ہوئی نظم کچھ دن کی میعاد میں
ہزار و دو صد چار ہشتاد میں

مرتب ہوا جم نیرنگ جنگ
تو نام اس کا رکھا 'شکوہ فرنگ'

اور آخر میں جہاں نظم کے مکمل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں چند اشعار میں اپنے حالات اس طرح بیان کئے ہیں ؎

ہوا خواہ سرکار ہوں میں قدیم
خدا نے کیا ہے عمائد ندیم

کسی طرح کا فرق اس میں نہیں
عمائد میں ہوں گو ہوں خانہ نشیں

جو حکام ہیں مالک امتیاز
وہ شاید کریں مجھ کو بھی سرفراز

سکونت کا اپنی بتا دوں پتا
مکاں مولوی گنج میں ہے مرا

نہیں فرق اس میں جو کہتا ہوں میں
کہ اب لکھنؤ میں جو رہتا ہوں میں

لقب ہے مرا آغا جو شرف
یہی نام مشہور ہے ہر طرف

جلال الدین حیدر خاں بھی ہے نام
مجھے جانتے ہیں عمائد تمام

نہیں اب تو ہے لکھنؤ میں مقام
کہ عرصے سے کلکتہ میں ہے قیام

حقیقت جو منظور تھی کہہ چکے
ہوا خاتمہ مثنوی کہہ چکے

ہوا ختم مضمون نیرنگ جنگ
شرف کہہ چکے ہم شکوہ فرنگ

یہ احباب سے ہوں میں امیدوار
پڑھیں جب یہ افسانۂ یادگار

کریں میری خاطر دعائے نجات
طلب حشر میں ہوں برائے نجات

ان تمام تفصیلات سے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ آغا جو شرف اپنے زمانے کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ لکھنؤ سے کلکتہ تک ان کی شہرت تھی۔ صحیح النسب ہونے کی حیثیت سے بھی ان کا شہرہ تھا۔ اور ایک شاعر کی حیثیت سے بھی لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ماحول کے اثر سے انہوں نے غزل کی طرف توجہ کی اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اور پھر آخر عمر میں انہوں نے یہ مثنوی شکوہ فرنگ لکھی جو ایک مثنوی نگار اور نظم گو کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت کا باعث ہے۔

(۳)

شکوہ فرنگ کا موضوع بظاہر تو اس وقت کے نئے حکمرانوں یعنی انگریزوں کی تعریف و توصیف ہے۔ لیکن شاعر کے تاریخی شعور اور اپنی قوم سے اس کو جو والہانہ محبت ہے، اس نے اس مثنوی کو انگریزوں کی تعریف سے کہیں زیادہ اس عہد کی تاریخ کا مرقع اور اس وقت کے

مسلمانوں کی زندگی کا ایک المیہ بنا دیا ہے۔ اس نظم کا شاعر جگہ جگہ اس وقت کی انگریز شخصیتوں کا ذکر کرتے کرتے، اس زمانے کے تاریخی واقعات اوران مسلمان بادشاہوں اور امرا و روسا کا ذکر خلوص و محبت سے کرنے لگتا ہے، جو انگریزوں کے مقابلے میں ایک زمانے تک صف آرای کر کر کے سیاسی جنگ ہار چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں سے زیادہ اس شاعر کو ان لوگوں سے دلچسپی تھی۔

اس مثنوی کا آغاز حمد و نعت اور منقبت حضرت علیؓ سے ہوتا ہے اس کے بعد چند اشعار حضرت عیسیٰؑ کی تعریف میں بھی ہیں۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریا کا ذکر، ان کے دربار کی تعریف، ان کے ولی عہد، وزرائے نامدار، پارلیمنٹ، گورنر جنرل سر جان لارنس اور کلکتہ کے لیفٹیننٹ گورنر کے ساتھ ساتھ دولت خواہ سرکار ڈپٹی عبداللطیف خان منشی امیر علی خاں مختار کمپنی بہادر، اعظم الدین حسن خاں منشی اظہار حسین صاحب، منشی نواب جان صاحب، قاضی القضات مولوی منظر حسین صاحب، مہتمم سلطان الاخبار مولوی طیب صاحب، راجہ شیو شرن گھشال، مولوی کبیرالدین صاحب مولوی محمد وجیہ صاحب کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے کلکتہ میں ان لوگوں کی اہمیت مسلم تھی۔ اس کے بعد سرداران محکمۂ عدالت کلکتہ، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، دہلی کے چیف کمشنر جارج ولیم ہملٹن، کمشنر لکھنؤ جان لارنس اور بعض دوسرے انگریز عہدے داروں کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کے بیان کے ساتھ ہی اس نظم کا شاعر، لکھنؤ اور دہلی میں آزادی کی جو جنگ لڑی گئی اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر جنگ آزادی کے ان

واقعات کی تفصیل کو پیش کر رہا ہے جو مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کی طبیعت کا یہ رجحان اس کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسی کے ساتھ مرزا حشمت محمد جواد علی خاں، برادر سلطان عالم محمد واجد علی شاہ، شاہ اودھ، شہزادہ بلند مراتب مرزا سلیمان قدر، سیادت پناہ منشی فضل احمد سفیر شاہی، امین دارالسلطنت کپتان ظفر الدولہ فتح علی خاں بہادر ہمزاد و مشیر شاہان اودھ کا ذکر تفصیل سے کرے۔ اور وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ آگے بڑھتا ہے اور ملکہ کشور محل کے کلکتہ سے لندن تک کے سفر کی تفصیل، پارلیمنٹ میں ان کے مقدمے کی سماعت، ملکہ وکٹوریا سے ان کی ملاقات اور ملک فرانس میں ان کے انتقال کے واقعات کو بھی بیان کرتا ہے۔ اور پھر جنگ آزادی کا پورا نقشہ کھینچتا ہے جس میں جگہ جگہ مسلمانوں کی بہادری کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور ان کی شکست کے بیان میں ایک کرب کا سا عالم پیدا کر دیتا ہے۔ اس نظم کے یہ حصے پہلو دار شاعری کی بہت اچھی مثال ہیں۔ ان حصوں میں شرف نے آزادی کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اودھ اور لکھنؤ میں اس جنگ آزادی نے جو صورت اختیار کی ہے، اس کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس جنگ آزادی میں جن شخصیتوں نے حصہ لیا تھا، اور جن پر انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے بپتا پڑی تھی، اس کی طرف جو اشارے کیے گئے ہیں وہ بھی پڑھنے والے کی طبیعت پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔

غرض موضوع کے اعتبار سے شکوہ فرنگ ایک نہایت ہی پہلو دار نظم ہے۔ اس میں جگہ جگہ تاریخ، تہذیب، معاشرت، آزادی، تغیر، تعمیر کا گہرا احساس و شعور ملتا ہے، اس کی وجہ سے یہ نظم گہرائی سے ہم کنار

ہوتی ہے اور اس میں جاذبیت اور کشش کا بڑا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

(۴)

فنّی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نظم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ ایک سیدھی سادہ سی بیانیہ نظم ہے جس کو خود اس کے مصنف نے مثنوی کہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ہیئت مثنوی کی ہے لیکن مثنوی کی وہ خصوصیات جو اس صنف کے ساتھ مخصوص ہیں، اس نظم میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً یہ نظم معنوی اعتبار سے مربوط نہیں ہے۔ اس میں مجموعی طور پر وہ ہم آہنگی نہیں، جس کو مثنوی کی صنف کے لئے نقادوں نے ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں تو مختلف شخصیتوں کا ذکر ہے۔ بعض تاریخی واقعات کا بیان ہے۔ بعض افراد کی مدح ہے۔ چند اداروں کی تعریف ہے۔ اور ان سب میں بھی کوئی خاص مربوط کیفیت نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں شروع سے آخر تک پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہتی ہے کیونکہ مصنف اپنے عہد کی شخصیتوں سے اس کو متعارف کراتا ہے اور اپنے عہد کے تاریخی واقعات سے اس کو آشنا کراتا ہے۔ وہ اس کو اس بات کا احساس بھی دلاتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اس حقیقت کا شعور بھی پیدا کرتا ہے کہ یہ تبدیلی ایک تاریخی حقیقت ہے، اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس نظم میں قدم قدم پر اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ اس کو انگریزوں کے مقابلے میں اپنی شخصیتوں سے زیادہ دلچسپی ہے اور وہ ان کے مقابلے میں ان شخصیتوں کو نسبتاً زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی شکست اور ان کی زبوں

حالی پر خون کے آنسو بہاتا ہے اور اس کے بیان میں ایسے ہی مواقع پر سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

شکوہ فرنگ، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو، ایک جدید نظم ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جدید احساسات کی جھلکیاں اس میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی ہے، وہ کم و بیش وہی زمانہ تھا جب لاہور میں جدید شاعری کی تحریک کا باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا۔ اور حالی اور آزاد کی کوششیں اس سلسلے میں بارآور ہو رہی ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس تبدیلی کا جو بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر زندگی میں رونما ہو رہی تھی۔ شکوہ فرنگ کے شاعر کو جدید شاعری کی اس تحریک کا علم نہیں تھا لیکن برعظیم کے معاشرے میں مجموعی طور پر جو انقلابی تبدیلی رونما ہو رہی تھی، اس کی ترجمانی اپنی اس نظم میں غیر شعوری طور پر وہ بھی کر رہا تھا۔

غرض آغا حجو شرف کی یہ نظم شکوہ فرنگ کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے اس زمانے کے تاریخی حالات کا علم ہوتا ہے۔ افراد جس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی زندگی جس آشوب قیامت سے دوچار تھی، اس کا پتہ چلتا ہے۔

چنانچہ اس نظم کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر میرے دل میں اس کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لندن کے دوران قیام میں میں نے برٹش میوزیم لندن سے اس کا عکس حاصل کیا۔ دنیا میں اس کا کوئی اور نسخہ موجود نہیں۔ اس لئے میوزیم کے قلمی نسخے ہی کو بنیاد بنا کر اس کا متن تیار کیا گیا ہے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے حواشی بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ مصنف کے اصل املا کو باقی رکھا گیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

اس کام میں میرے عزیز دوست اور رفقائے کار ڈاکٹر میاں بشیر حسین اور ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی نے میرا ہاتھ بٹایا، اور پروف دیکھنے اور تصحیح کرنے کا مشکل اور صبر آزما کام بھی اپنے ذمے لیا۔ میں ان دوستوں کا شکر گزار ہوں۔

عبادت

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

۲۸
پاکستان کے تہذیبی مسائل

اسلامیانِ ہند نے اس برعظیم ہند و پاکستان میں تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں جو تہذیب پیدا کی، وہ انسانیت کی تہذیب پیدا کی، وہ انسانیت کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس تہذیب نے علم و تعلیم، زبان، ادب و شعر، مصوری، موسیقی، فن تعمیر، غرض زندگی کے ہر شعبے میں جس تخلیقی مزاج کا اظہار کیا ہے تاریخ کے صفحات اس سے روشن نظر آتے ہیں بعض چیزیں تو اس سرزمین کے مسلمانوں نے ایسی تخلیق کیں کہ انہوں نے خود تہذیب کو چار چاند لگا دیئے، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض کا شمار آج دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔

برعظیم کے مُسلمانوں نے اپنے ان تہذیبی کارناموں پر ہمیشہ فخر کیا، اور اس سرمائے کو محفوظ کرنے کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ان تہذیبی مظاہر پر اسلام اور اسلامی روایات کی گہری چھاپ تھی۔ ظاہر ہے کہ غیر مُسلم، مسلمانوں کے ان تہذیبی کارناموں سے دلچسپی کا اظہار کیسے کر سکتے تھے۔ وہ تو ان کو اپنی شکست اور مفتوح ہونے کی نشانیاں تصوّر کرتے رہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ان تہذیبی مظاہر کو پس منظر میں ڈالنے کے لئے پراچین کال اور پراچین بھارت کی تہذیب کو واپس لانے کے لئے ایسی مذہبی اور سیاسی تحریکیں نہ چلائی جاتیں۔ جنہوں نے تہذیبی تصادم کا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جو اس برعظیم کی تہذیبی تاریخ میں ایک اچھا خاصا میدان کارزار نظر آتا ہے۔

پاکستان کے تصوّر کی تخلیق میں اس صورتِ حال کا بڑا ہاتھ ہے اور قیام پاکستان کی تحریک میں بعض دوسرے عوامل کے ساتھ، یہ پہلو بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مُتحدہ ہندوستان میں نظام تعلیم کو جس طرح شُدھ کرنے کی کوشش کی گئی، اردو کی جگہ جس طرح سنسکرت آمیز ہندی کو رائج کرنے کے منصوبے بنائے گئے اور ادب وشعر کو جس طرح پراچین بھارت کے تہذیبی سانچے میں ڈھالنے کی طرف رُجحان ظاہر کیا گیا، اس نے اسلامیانِ ہند کو حیراں و پریشاں کر دیا، اور وہ بالآخر اپنے اس عظیم تہذیبی سرمائے کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ چنانچہ کسی نہ کسی صورت میں کئی سو سال تک اِس جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح قیام پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

یہ ملک اسلامیانِ ہند نے اس لئے حاصل کیا کہ یہاں اسلام کا صحیح ماحول ہو۔ اس میں اسلامی اقدار فروغ پا سکیں اور ان کی تہذیب و ثقافت، جس پر اسلام کی گہری چھاپ ہے، اس سرزمین میں پروان چڑھ سکے۔

اس احساس و خیال کو پاکستان میں کس حد تک عملی صورت دی گئی، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ ان سب کے نشیب و فراز کی تفصیل اس کتاب میں مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جو صورت حال گزشتہ تیس سال میں ہمارے ہاں پیدا ہوئی ہے یا جس کے آئندہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اس کے مُثبت اور منفی پہلوؤں کو تجزیاتی انداز میں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے اس وطنِ عزیز میں نظام تعلیم کی جو کیفیت ہے، اس کے علم برداروں کا جو حال ہے، قومی زبان جن حالات سے دوچار ہے، ادب کا جو نقشہ ہے اور ادیبوں پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کے مطالعے سے اس کی بہت سی تصویریں آنکھوں کے سامنے ضرور آجاتی ہیں۔ اور یہی اس کتاب کی تالیف و ترتیب اور طباعت و اشاعت کا مقصد ہے۔

گزشتہ تیس سال میں ہم نے اپنے جگر لخت لخت کو جس طرح جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ تعمیر اور حسرتِ تعمیر کا جو عمل ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی کے مختلف شعبوں میں جاری رہا ہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے اور جو کچھ کھویا ہے، اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، ان تمام پہلوؤں کو اس کتاب میں مُثبت اور تعمیری زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خیال سے کہ اس عمل کا سلسلہ جاری رہے جس کے لئے ہم نے اس وطن عزیز کی تعمیر و تشکیل کی تھی۔

اور جس میں اُن اقدار کو فروغ دینے کا بیڑہ اُٹھایا تھا جو برعظیم کی اسلامی تہذیب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے بغیر ہمارا وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔

عبادت

اورینٹل کالج لاہور
۱۶راگست ۱۹۷۸ء